دانشورانِ اندلس

از

عبداللہ الاثری

سابق مدیر اعلیٰ روزنامہ "زمیندار"

لاہور

بتۂ دین و دنیا نزد چوک اردو بازار لاہور

نقش . . . . . . اوّل

تعداد . . . . . ایکہزار

طابع . . . . اے - اے - بھٹی
"مکتبۂ دین و دنیا - لاہور"

مطبوعہ :- . . رحمانی پرنٹنگ پریس - فیلڈز روڈ لاہور

کاتب :- . . محمد اکبر . . . . . .

فہرست مضامین

بلغ العلیٰ بکمالہ
کشف الدجیٰ بجمالہ

دمشق میں بنو امیہ کا زوال

شق میں بنو امیہ کی حکومت ۴۰ھ سے ۱۳۲ھ تک رہی اور اس
ں کئی سیاسی مد و جزر رونما ہوئے مگر اس کے باوجود اموی خاندان کا
ت مسلسل جاری رہا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے بعد یزید اور یزید کے
ویہ بن یزید تخت نشین ہوا۔ معاویہ اپنے باپ کی حرکات سے سخت
ا۔ اور جب اس نے ان حرکات کے اسباب پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ جو کچھ
ہے وہ در اصل اسی بادشاہت ہی سے ہے چنانچہ وہ صرف چالیس دن کے
ت کے منصب سے دست بردار ہو گیا اور لوگوں سے کہہ دیا کہ وہ
ں کو چاہیں اپنا حکمران منتخب کر لیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر خلافت کے
سے دار کھڑے ہو گئے جن میں سے عبداللہ ابن زبیرؓ نے عراق،
ن اور بصرہ پر قبضہ کر لیا اور مکہ کو اپنا دار الخلافت قرار دیا۔ بنی امیہ
مروان بن الحکم نے دمشق میں دعویٰ کیا اور چند ہی روز میں سارے

شام اور مصر پر قابض ہو گیا۔ اس ابتری کے زمانے میں آل عباس ؓ کو بھی حوصلہ
لیکن مروان سب پر غالب آیا اور اس کے بیٹے عبدالملک نے جو اموی خاندان
چوتھا بادشاہ تھا ایسی شان و شوکت سے حکومت کی کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی
اس دور کے تمام مورخین اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان
کے عہد میں تمام دنیائے اسلام بلا استثناء خلافت امویہ کے قبضۂ اقتدار میں
تھی اور خلافت امیہ کا دائرۂ حکومت سندھ، کابل، ایران، ترکستان
شام، ایشیائے کوچک، اسپین اور تمام افریقہ تک پھیلا ہوا تھا۔

دولت امیہ کی بربادی کا سبب وہی بنو ہاشم تھے جو شروع ہی سے
کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اور مختلف وقتوں پر بڑے زور شور سے
مقابلہ کے لئے اٹھے۔ اگرچہ ولید اور ہشام کے پُر زور اور طاقتور ہاتھوں
نے اس سلطنت کو خطرے سے بچا لیا مگر حکومت کی بنیادوں میں کسی قدر
تزلزل پیدا ہو گیا اور جب اس عظمت و اقتدار کے فرمانروا اٹھ گئے تو
مروانی حکومت کے اقتدار کی گرفت کمزور ہو گئی۔ اس وقت تک خلافت
کی کوششیں صرف سادات اور علویین کی طرف سے ہوتی رہیں اور عباسی
خاندان اب تک بظاہر ایک گمنامی کی حالت میں تھا۔ علویین میں سے عبداللہ
جو محمد بن حنفیہ کے بیٹے اور حضرت علیؓ کے پوتے تھے اپنے پیروؤں
کی ایک کثیر تعداد رکھتے تھے اور ایران و خراسان میں جا بجا ان کے نقیب
نقیب مقرر تھے۔ ۱۰۰ھ میں عبداللہ علوی کو زہر دیا گیا اور چونکہ ان
کے ہاں اولاد کوئی نہ تھی اور نہ سادات میں اس وقت کوئی صاحب
اثر شخص تھا اس لئے عبداللہ علوی حضرت عباسؓ کے پڑپوتے محمد بن

کہ اپنا جانشین مقرر کر گئے۔ حضرت عباسؓ کے کئی صاحبزادے تھے
ان سب میں حضرت عبداللہؓ اپنی بے نظیر قابلیت کی وجہ سے اس
قدر ممتاز تھے کہ حضرت فاروق اعظمؓ اپنی کم سنی کے باوجود ان کی تعظیم
کرتے تھے۔ اکثر احادیث نبوی کے راوی یہی عبداللہ ابن عباسؓ ہیں اور
اگر کہا بھی بے جا نہ ہوگا کہ قرآن شریف کے پہلے مفسر بھی وہی ہیں۔ حضرت
عبداللہ ابن عباسؓ کے بیٹے علیؓ تھے جنہوں نے امیہ کے خلاف علویین
فاطمیہ کی رفاقت اختیار کی۔ یہی محمد بن علیؓ عباسی تھے جن کو عبداللہ
...ی نے اپنا جانشین مقرر کیا اور اس طرح علویین کی جمع کی ہوئی قوت
عباسی خاندان کی طرف منتقل ہو گئی۔ گویا یہ پہلا دن تھا جب دولت عباسیہ
کی بنیاد کا پتھر رکھا گیا۔ اس کے بعد آلِ عباس کے نقیب تمام عراق و
خراسان میں پھیل گئے اور ۱۰۲ھ سے ۱۲۹ھ تک ان کی طرف سے
...تیم کی کوششیں عمل میں لائی گئیں۔ بعض اوقات حکام بنی امیہ پر ان کی
سازش کا راز کھل گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کے متعلق کسی شبہ کا
اظہار ہوا ان کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔

بنی امیہ کے زوال کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ نو مسلم حاکم بنا دیئے
گئے تھے جو عرب نہیں بلکہ غیر عرب تھے۔ اس اقدام سے عربوں کے
قومی نظام کا شیرازہ جس پر خلفاء کی جنگی طاقت کا دارومدار تھا بکھر
گیا اور ان کے دلوں میں کدورت بیٹھ گئی۔ غیر عرب نو مسلم جن کو حاکمانہ
اختیارات سونپے گئے تھے عربی طرز حکومت سے بالکل ناواقف

تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ تالیف قلوب کرنا بھی نہیں جانتے
یہ نو مسلم اصل میں ان آتش پرستوں اور مجوسیوں کی اولاد تھے۔ ج
کسریٰ حکومت کرتا تھا اور جن کے آتش کدوں کی آگ حضرت فا
اعظمؓ بجھا چکے تھے۔ ان ایرانیوں نے اسلام تو بہ طیب خاطر قبول
لیکن اپنی آبائی رسوم کے ابھی تک پابند تھے۔ اور اسی کے ساتھ
آب و ہوا کی تاثیر نے بھی قدرتی رنگ آمیزی کی چنانچہ خلافت
جھگڑوں میں ان کا بہت کچھ دخل ہو چکا تھا اور چونکہ اہل بیت
محبت کا بھی دعویٰ رکھتے تھے اس لئے بنو ہاشم کے ساتھ بھی
دلی ہمدردی تھی اور شائد اسی بھروسہ پر حضرت علیؓ نے مدینہ
کوفہ کو دارالخلافت بنایا تھا مگر اس قوم میں وفا کا مادہ موجود نہ تھا اس
حضرت علیؓ کے ساتھ جو سلوک انہوں نے کیا وہی بنی امیہ
پیش آیا۔

ابتداء میں ایرانیوں کا خلافت کے جھگڑوں میں دخل دینا
نہ کسی فریق کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنا صرف مصلحت وقت اور
معاملات کی وجہ سے تھا لیکن رفتہ رفتہ انہی خیالات نے مذہبی
اختیار کر لیا اور امامت اور خلافت کے حقوق وغیرہ پر اس مذ
کی بنیاد پڑی۔ خلافت کے جھگڑے بدستور چلے آتے تھے اور
دن ایک نہ ایک مدعی خلافت کھڑا ہو جاتا تھا۔ بنی امیہ اس
بالاستقلال حکومت کر رہے تھے مگر بنی فاطمہ اور علوی اور عباسی

ہرے کے برخلاف اور بعض اوقات متفقہ طاقت کے ساتھ موجودہ
ںت کی بیخ کنی کے لئے تمام امکانی کوششیں کر رہے تھے۔ اہل
ت کے جانثار ان کی امداد کے واسطے ہر وقت تیار رہتے تھے اور
ہاشم کی کامیابی کی وجہ اُن کے نقیب تھے جو اسلامی ممالک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوششوں میں
ئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ اس جد و جہد کی وجہ سے کئی دفعہ
ی بڑی جمعیتیں ان کے گرد جمع ہوئیں اور انہوں نے بنی امیہ کے
ف کئی لڑائیاں کیں جن میں انہیں کامیابی تو نہ ہو سکی البتہ اس کا نتیجہ
ضرور نکلا کہ خاندان امیہ رو بہ زوال ہو گیا اور ان خانہ جنگیوں سے عباسیہ
بہت کچھ فائدہ اُٹھانے کا موقع ملا۔

سنہ ۱۲۶ھ میں محمد بن علی عباسی کا انتقال ہو گیا اور ان کے بیٹے امام
اہیم اپنے باپ کے جانشین ہوئے۔ امام ابراہیم کی کامیابی کا باعث
ے شخص ابو مسلم خراسانی تھا۔ جس میں فہم و فراست اور تدبیر و دانش
ساتھ ساتھ ایک بہادر سپاہی کے جوہر بھی موجود تھے۔ اس کے
تق طبری کی روایت ہے کہ ابو مسلم اصل میں غلام تھا اور اس کا نام
الرحمٰن بن مسلم تھا۔ وہ بنی عجل کے ہاں غلام تھا اور حسن خدمت کی
سے مالک نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ ایک دفعہ جب وہ حج بیت
ر کے ارادے سے مکہ میں گیا تو محمد بن علیؒ عباسی کی خدمت میں بھی
ضر ہوا۔ محمد بن علیؒ نے اس کا حسب و نسب دریافت کیا اور اس کے

متعلق اس خیال کا اظہار کیا کہ اس کے بشرہ سے مجھے معلوم ہوتا
کہ اس سے ہمارے خاندان کی خدمت میں کارہائے نمایاں ظہور
آئیں گے۔ بہر حال یہ اولو العزم خراسانی بزرجمہر کی اولاد سے تھا
ابراہیم نے اسے اپنا نائب مقرر کر کے خراسان کو بھیج دیا۔ چونکہ اس
کو خاندان عباسیہ سے دلی ہمدردی تھی اس لئے اس نے عباسیہ
طرف سے سینکڑوں نقیب جا بجا پھیلا دیئے اور آل عباس
طرف داروں کے واسطے خاص امتیازی نشان کے طور پر سیاہ لباس
مقرر کیا۔ اوّل اوّل تو اس نے خفیہ سازشوں سے کام لیا مگر آخر
۲۵ رمضان ۱۲۹ھ پنج شنبہ کی رات عام بغاوت کے لئے مقرر
تاکہ حامیان آلِ عباس جہاں جہاں بھی ہوں بیک وقت اُٹھ کھڑے
ہوں۔ ابو مسلم نے اس تاریخ تک کافی جمعیت فراہم کر لی تھی۔ چنانچہ
مقررہ وقت پر سیاہ پوش سوار اور پیادے رات کی تاریکی
پردے میں اٹھے اور چاروں طرف قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا
اس سازش کا حال خلیفہ وقت مروان الحمار پر عین بر وقت کھل گیا
اس نے فوراً عامل بلقاء کے نام حکم لکھ کر بھیجا کہ ابراہیم کو قید کر
بھیج دو۔ امام ابراہیم کے ساتھ اس وقت جمعیت بہت کم تھی اور
کے طرف دار ابو مسلم کے ماتحت خراسان کی تسخیر میں مصروف
اس لئے امام ابراہیم بغیر کسی دقت اور مشکل کے قید کر لئے گئے
ان کا قتل یقینی امر تھا۔ اس لئے انہوں نے وصیت کی کہ میرے بعد

بھائی عبداللہ جانشین ہے۔ امام ابراہیم تو قتل کر دیئے گئے لیکن ابو العباس عبداللہ کو کوفہ میں خلیفہ مشتہر کیا گیا۔ ادھر ابو مسلم خراسانی افواج اُمیہ کو پے در پے شکستیں دے کر ایران کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کی فتح مندیوں کو دیکھ کر مروان نے ایک لشکر جرار مقابلہ کے لیئے بھیجا ابو العباس عبداللہ نے اپنے چچا محمد ابن علی کو مروان کی طرف روانہ کیا اور دونوں لشکروں میں زاب کے مقام پر ایک سخت خونریز جنگ ہوئی جس میں مروان بڑی بہادری سے لڑا لیکن شکست کھائی اور مصر کی طرف بھاگ گیا۔ چند روز وہ اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ آخر گرفتار ہو کر ۱۳۲ھ میں دریائے نیل کے کنارے قرات السلاسل کے مقام پر قتل کر دیا گیا اور مروان الحمار کے ساتھ خاندان اُمیہ کا چراغ بھی شام میں گل ہو گیا۔

امام ابراہیم کا بھائی ابو العباس عبداللہ جو تاریخ کے صفحات پر "سفاح" کے عجیب نام سے مذکور و مشہور ہے خاندان عباسیہ کا پہلا بادشاہ ہوا۔ یہ شخص پانچویں پشت میں خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم بزرگوار حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا پوتا تھا سنگ دل اور جابر سفاح نے اپنے عہد حکومت میں جو ظلم و ستم کیئے وہ ان واقعات سے عین ملتے جلتے تھے جن کا سامنا کربلا کے بے آب و گیاہ میدان میں اہل بیت کو ہوا بلکہ اس دور کے بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ابو العباس عبداللہ نے جو مظالم کیئے وہ کربلا کے مظالم کی صدائے بازگشت اور میدان کربلا میں جام شہادت نوش کرنے والے اہل

بیت کی مظلومی و بے بسی کا انتقامی مظہر تھے جو آل اطہر سے جوش
عقیدت کی بناء پر روا رکھے گئے۔ ان مظالم میں سفاح نے بنو امیہ
کے خون سے جی بھر کے ہاتھ رنگے۔ خاص دمشق میں بنی امیہ کے
اسّی سرگروہ ایک دعوت کے بہانے سے طلب کیے گئے اور
عبداللہ بن علی کے سامنے ایک حمام میں لاٹھیوں اور گرزوں سے ہلاک
کر دیئے گئے اور اسی وقت ان کی نعشوں پر دسترخوان بچھا کر سب
نے کھانا کھایا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ مقتولین میں سے اگر کسی سسکتے
ہوئے آدمی کی ایک آدھ سانس کی آواز سننے میں آجاتی تھی تو اس پہ
قہقہے لگائے جاتے اور خوب تمسخر اڑایا جاتا تھا۔ اس کے بعد خاندان
امیہ میں سے جہاں بھی کوئی شخص دکھائی دیا قتل کر دیا گیا۔ سفاح نے
اعلان کر دیا تھا کہ امیہ کا بچہ بھی زندہ نہ رہنے پائے۔ اس حکم کی یہاں
تک تعمیل ہوئی کہ ہر ممکن تلاش و تفحص سے بنو امیہ کا بچہ بچہ تہ تیغ
کر دیا گیا حتیٰ کہ خلفائے بنی امیہ یعنی حضرت امیر معاویہؓ، یزید، عبدالملک
اور ہشام کی قبریں کھود ڈالی گئیں اور اگر کہیں ایک ہڈی بھی ثابت
ملی تو وہ آگ میں جلا دی گئی اس قتل و خون ریزی میں امیہ کی نسل
ختم کر دینے کی پوری کوشش کی گئی اور کسی متنفس کو بھی زندہ نہ چھوڑا
لیکن قدرت کاملہ کے فیصلے چونکہ انسان کی عقل و خرد کی دسترس سے
بالاتر ہوتے ہیں اور مشیت ایزدی جن چیزوں کو باقی رکھنا
چاہتی ہے انہیں دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اس

قیامت صغریٰ کی ہلاکت خیزیوں سے خاندان امیہ کا صرف ایک شخص
عبدالرحمٰن نامی بچ سکا یہ خوبصورت نوجوان اپنی جان بچا کر افریقہ کی طرف
بھاگ گیا۔ اگرچہ اس کا تعاقب کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی گئی
لیکن قضاء و قدر نے فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ شہزادہ اُندلس میں پھر سلطنت
امیہ قائم کرے گا اور وہ اس قدر پُر جلال سلطنت ہو گی کہ عباسی
اس کی شان و عظمت کو رشک کی نگاہ سے دیکھیں گے مگر کچھ نہیں
کر سکیں گے۔ موت کے پنجہ سے بچ کر نکلنے والے عبدالرحمٰن کا چمکتا
ہوا مقدر ہسپانیہ میں نہایت جاہ و جلال کی سلطنت عالم وجود میں
لانے کے لئے پَر تول رہا تھا اور اسے یہ سعادت بخشنے کے
لئے بیتاب تھا کہ وہ امیہ کی فرمانروائی کا وہ چراغ اندلس میں از سر نو
روشن کرے جس کی شعاعیں یورپ کے اکثر و بیشتر حصّہ کو نور اسلام
کی ضیا باریوں سے مستفیض کر دیں۔ اس لئے اسے کون مار سکتا تھا۔
خونخواری کی تلوار پورے زور سے چلتی اور انسانی زندگیوں کا خاتمہ
کرتی رہی مگر عبدالرحمٰن کا بال تک بیکا نہ کر سکی۔ کیونکہ قدرت کاملہ کو
اس کے ہاتھوں سے اُندلس میں دولت امیہ کی داغ بیل ڈالنا منظور
تھا۔ سفاح کی حکومت صرف چار برس قائم رہی اور یہ چار دن سال
اس نے خونریزی ہی میں بسر کئے۔ آخر ۱۳۶ھ میں سفاح نے چیچک
کے عارضہ سے وفات پائی اور اس کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر
منصور تخت نشین ہوا جو اپنے حسن تدبیر کی وجہ سے ایک لائق ترین

حکمران، دولت عباسیہ کا اولوالعزم بانی اور عباسی سلطنت کا نہایت کامیاب و بامراد ہیرو ثابت ہوا اور جس نے عزم و ہمت سے خلافت عباسیہ کی عظمت و سطوت کا قصر رفیع انتہائی مضبوط و مستحکم بنیادوں پر تعمیر کیا۔

اندلس میں دولت امیہ کا ظہور

عبدالرحمٰن اموی خاندان کے عظیم القدر بادشاہ ہشام بن عبدالملک کا پوتا اور معاویہ بن ہشام کا بیٹا تھا۔ ابھی اس کی عمر بمشکل پانچ برس تھی کہ اس کا باپ معاویہ فوت ہوگیا اور عبدالرحمٰن کو باپ کے سایہ شفقت سے عالم طفل ہی میں محروم ہونا پڑا۔ اس حالت کے پیش نظر اس کے دادا ہشام نے اپنے معصوم پوتے کی پرورش کا بیڑا اٹھایا اور عبدالرحمٰن اپنے دادا کی نگرانی میں پرورش پانے لگا۔ ہشام کو اپنے پوتے کے ساتھ اس وجہ سے بھی زیادہ پیار تھا کہ باپ کے انتقال کی وجہ سے وہ یتیم ہوگیا تھا اور اس بات نے ہشام کے دل میں عبدالرحمٰن کی محبت کے لیے حد سے زیادہ جگہ پیدا کر دی تھی۔ یہی کہ ہشام کی یہ بھی دلی آرزو تھی کہ عبدالرحمٰن کو اپنا ولیعہد مقرر کرے۔ اور اس خیال کے پیش نظر چونکہ عبدالرحمٰن کو ایسے اوصاف سے آراستہ

کرنا ضروری تھا جن سے وہ ولی عہد کی گرانبار ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بن جائے اس لئے عبدالرحمٰن کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا اور اسے وہ تمام اخلاق و آداب سکھائے گئے جو کسی ولی عہد میں ہونا لازمی ہیں۔

اس وقت چونکہ بنی امیہ کی قسمت کا ستارہ گردش میں آچکا تھا اور ان کے اقتدار و عظمت میں زوال کے آثار شروع ہو چکے تھے اس لئے عبدالرحمٰن اپنے خاندان کا تاج و تخت حاصل کرنے سے محروم رہا اور اسے اموی سلطنت سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ مل سکا بلکہ وہ ابھی زندگی کی صرف بیس بہاریں دیکھنے پایا تھا کہ حکومت کی عنان ہاتھوں سے نکل گئی اور عباسی تخت و تاج پر قابض ہو گئے۔ یہ انقلاب عظیم جہاں بنوامیہ کی سیاہ بختی کا باعث ہوا وہاں اس کی بناء پر امویوں کے لئے آلام و مصائب کا دور بھی اس کے ساتھ ہی شروع ہو گیا اور عباسیوں کے اولین بادشاہ ابوالعباس عبداللہ المعروف سفاح نے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی احکام جاری کر دیئے کہ کسی اموی کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ اس حکم کے ساتھ ہی عباسیوں اور ان کے کارندوں نے خاندان امیہ کے شاہزادوں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دیا جس سے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ بنی امیہ میں سے کوئی شخص ایسا باقی نہ رہے جس کی طرف سے آئندہ کبھی تخت کا دعویدار بننے کا خطرہ ہو

اور جو کہیں بعد میں یہ کہنے کا حق رکھتا ہو کہ وہ بھی تخت و تاج حاصل کرنے کا جائز طور پر مدعی ہے۔ اس اندیشہ کو مدنظر رکھتے ہوئے عباسیوں نے بنو امیہ کے خاتمہ کی مہم زور شور سے جاری کی اور اس مہم سے خوفزدہ ہو کر بہت سے شاہزادے اپنی جانیں بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ان بھاگنے والوں میں اندلس کی سلطنت امیہ کا ہیرو عبدالرحمٰن ابن معاویہ بھی تھا۔ جسے اپنی آبائی حکومت کا پایۂ تخت دمشق چھوڑ دینے پر مجبور ہونا پڑا اور وہ اپنے ایک چھوٹے بھائی اور ایک چار سال کے بیٹے کو ہمراہ لے کر عراق کی طرف چلا گیا۔ عراق میں پہنچ کر عبدالرحمٰن دریائے فرات کے کنارے ایک جنگل میں محفوظ مقام پر چھپ گیا اور اسی جگہ مستقل طور پر رہائش اختیار کی۔ اس نے اپنی طرف سے تو ایسی پوشیدہ جگہ تلاش کی جہاں آسانی سے کسی کی نظر نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن دشمن جو تعاقب میں لگے ہوئے تھے اور چاروں طرف تلاش کرتے پھرتے تھے اس طرف بھی آنکلے جہاں عبدالرحمٰن چھپا ہوا تھا اور انہیں کسی طرح یہ بھی اطلاع مل گئی کہ عبدالرحمٰن اسی جنگل میں کسی جگہ چھپ کر رہتا ہے۔ اس اطلاع کی بناء پر عباسی فوج جنگل میں پھیل گئی اور عبدالرحمٰن کی تلاش کے لئے جنگل کا کونا کونا چھاننا شروع کیا۔

عبدالرحمٰن نے جب عباسی فوج کے سپاہی جنگل میں گھومتے

اور تلاش میں سرگرم دیکھے تو اسے شک گزرا کہ یہ فوجی غالباً اسی
کو ڈھونڈھ رہے ہیں آخر اسے یقین ہو گیا کہ جنگل میں اسی کی تلاش
جاری ہے اور اگر کسی سپاہی کی نظر اس طرف جا پڑی جہاں وہ
چھپا ہوا ہے اور اسے پکڑ لیا گیا تو عباسی نہ اسے زندہ چھوڑیں گے
اور نہ اس کے ساتھی بچوں کی جان بخشی کریں گے۔ اس خطرہ کو
اپنے نزدیک آتے اور اپنی طرف تیزی سے بڑھتے دیکھ کر عبدالرحمٰن
اس جنگل سے باہر نکلا اور اسی لمحے مراکش کو روانہ ہو گیا۔ مراکش
میں پہنچ کر اس نے ایک دو روز قیام کیا تو اس عرصہ میں اسے
اپنے خاندان بنو امیہ کے چند اشخاص سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ
لوگ بھی شاید انہی امویوں میں سے تھے جو عباسیوں کی خونریزی
سے دہشت زدہ ہو کر بھاگ نکلے تھے۔ عبدالرحمٰن سے مل کر
ان لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی اور ان سب نے باہمی مشورہ کے
بعد اس رائے کا اظہار کیا کہ یہ جگہ یعنی مراکش بھی اس خطرے
سے خالی نہیں جو ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اس لئے بہتر یہ
ہے کہ ہم لوگ اندلس میں چلے جائیں۔ اندلس چونکہ بغداد سے کافی
فاصلہ پر ہے اور وہ فاصلہ ایسا نہیں کہ جلدی سے طے کر لیا جائے
اس لئے وہاں ہمیں عباسیوں کے تعاقب سے امان مل سکتی
ہے جو دوسری کسی جگہ نہیں مل سکتی۔

اندلس میں اسلام نے پہلی صدی ہجری کے آخری عشرہ یعنی

ستمبر ۷۱۱ئہ میں نوائے توحید بلند کیا تھا۔ اور سب سے پہلے اسلام کے جلیل القدر جرنیل طارق ابنِ زیاد نے صرف پانچ ہزار مجاہدین کی مختصر فوج سے ایک بہت بڑے بادشاہ راڈرک کے ایک لاکھ کے لشکر کو شکست فاش دے کر اس مُلک کو فتح کیا تھا۔ ترجمانِ حقیقت علامہ اقبالؒ نے طارق کی شجاعت و بسالت اور اس کے فولادی عزم و استقامت کی تصویر ذیل کے اشعار میں کھینچی ہے۔ ؎

طارق چوں بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن! باز چوں رسیم!
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر بُرد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست، کہ ملکِ خدائے ماست

جس زمانے میں طارق نے اندلس کو فتح کیا تھا۔ اُس وقت سے لے کر یعنی پچاس سال سے یہ ملک عربوں کے قبضہ میں چلا آتا تھا۔ اور ایک ماتحت صوبہ کی حیثیت سے اسلامی خلافت کے دائرہ اقتدار میں شامل تھا۔ لیکن اس وقت اندلس میں سخت بدامنی کا دور دورہ تھا۔ اور وہاں کے اکثر و بیشتر سردار خانہ جنگی میں اس حد تک مبتلا تھے۔ کہ ملک کے داخلی ضبط و نظم کا شیرازہ بہت پریشان

ہو چکا تھا۔

عبدالرحمٰن کو جب اس کے اموی ساتھیوں نے اندلس میں پناہ گزین ہونے کا مشورہ دیا تو اس نے بھی اس خیال کے ماتحت ان کی رائے سے اتفاق کیا کہ یہ ملک واقعی بغداد سے اتنی دور کے فاصلے پر ہے کہ عباسی فوجیں آسانی کے ساتھ یہاں نہیں پہنچ سکتے بلکہ ان کے لیئے اتنے دور کے فاصلے کو طے کر کے اندلس میں پہنچنا بہت محال ہوگا۔ چنانچہ اس تجویز پر سب کے متفق ہونے کے بعد عبدالرحمٰن نے کہیں سے ایک چھوٹی سی کشتی مہیا کی۔ اور اپنے ساتھیوں کی مختصر سی جماعت کو اپنے ہمراہ اس کشتی میں سوار کر کے اندلس کی طرف روانہ ہوا کچھ عرصہ کے بحری سفر کے بعد یہ جماعت اندلس کے ساحل پر جا پہنچی۔ اور سب لوگ کشتی سے اتر کر ساحل کے قریب ہی ایک پُر فضا مقام پر قیام پذیر ہو گئے۔ اندلس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی عبدالرحمٰن نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا۔ کہ اس نے بارگاہِ خداوندی میں اپنے صحت و سلامتی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچ جانے پر سجدۂ شکر و سپاس ادا کیا۔ اور اسی کے ساتھ اپنی آئندہ کامیابی کے لئے خلوص قلب سے دعا مانگی۔

اس اثناء میں وہاں کے لوگوں کو پتہ چل گیا۔ کہ بنی امیہ کا ایک شہزادہ ان کے ملک میں وارد ہوا ہے۔ تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔

اور ادھر ادھر سے لوگ وہاں آنا شروع ہو گئے۔ اموی شہزادے کی آمد کی خبر جہاں جہاں تک پہنچی وہیں سے لوگ جوق در جوق آ کر عبدالرحمٰن کے گرد جمع ہوتے رہے حتیٰ کہ تھوڑے سے عرصہ میں سات آٹھ سو اشخاص کی ایک ایسی جمعیت فراہم ہو گئی جس پر بلا شبہ ایک لشکر کا گمان ہوتا تھا۔ اس ہجوم اور لوگوں کے ذوق ارادت کو دیکھ کر عبدالرحمٰن کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے اندلس کے دار الخلافہ قرطبہ میں جانے کا ارادہ کیا۔ ارد گرد جمع ہونے والے لوگوں نے بھی قرطبہ جانے کے فیصلہ کی تائید کی اور عبدالرحمٰن اپنے تمام ساتھیوں کی معیت میں قرطبہ کی طرف چل دیا۔ اس کے قدم جوں جوں آگے بڑھتے تھے اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے رفقاء کی فوج میں بھی زیادہ سے زیادہ آدمی بڑھتے جاتے تھے کیونکہ جو شخص بھی سنتا تھا کہ بنو امیہ کا شہزادہ قرطبہ میں جا رہا ہے وہی ہجوم کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا۔ اس طرح عبدالرحمٰن کی فوج میں قرطبہ کے قریب پہنچنے تک بڑا بھاری اضافہ ہو گیا۔ جب قرطبہ کے گورنر کو اطلاع ملی کہ ایک اموی شہزادہ بڑے زبردست لشکر کے ہمراہ قرطبہ کی جانب بڑھا چلا آ رہا ہے تو اسے اپنا اقتدار خطرے میں محسوس ہوا اور وہ اس بات کے لئے آمادہ ہو گیا کہ آنے والے شہزادے سے ہر قیمت پر مقابلہ کرے چنانچہ گورنر نے اپنی فوج کو تیاری کا حکم دیا اور اسے تیار کر کے شہر سے باہر نکلا۔ قرطبہ کے

باہر ایک وسیع میدان میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں اور زور دار لڑائی شروع ہو گئی۔ فریقین کے کمانڈر جوش افزا اور ولولہ انگیز نعروں اور تقریروں سے اپنی اپنی فوج کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور مختلف قسم کی باتوں سے اپنے اپنے لشکروں کو دشمن کے پسپا کرنے اور اس پر فتح پانے کی ترغیب دیتے تھے لیکن دونوں فوجوں میں دو الگ الگ جذبے کام کر رہے تھے گورنر قرطبہ کے فوجی تو اپنے حاکم کے احکام کی تعمیل میں مصروف پیکار تھے اور اس کے علاوہ کوئی بات ایسی نہ تھی جو ان فوجوں میں لڑائی کا جوش اور جانیں قربان کر کے فتح و کامرانی حاصل کرنے کا مجنونانہ جذبہ پیدا کرتی۔ مگر عبدالرحمٰن کی فوج محض جوش ارادت کی بناء پر جنگ آزما تھی وہ لڑائی کی ڈیوٹی دینے یا کسی حاکم کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے نہیں لڑتی تھی بلکہ اس جذبہ کے ساتھ کہ جس شہزادے کے ساتھ اُسے والہانہ عقیدت ہے اس کو کامیابی سے ہمکنار کرے اور اس کے ناموس و آبرو پر کسی طرح بھی آنچ نہ آنے دے خواہ اس کے لیے اس کو جان ہی کی بازی کیوں نہ لگانی پڑے گو وہ اپنے محبوب شہزادے کو مظفر و منصور دیکھنا چاہتی تھی اور یہ جذبات ایسے خلوص و ایثار کی بنیاد پر پیدا ہوئے تھے جسے دنیا کی کوئی طاقت پسپا نہیں کر سکتی۔ خلوص و ایثار کا جذبہ وہ بے پناہ طاقت ہے کہ اگر پہاڑ بھی اس کے ساتھ ٹکرانے کی کوشش کرے

تو وہ ریزہ ریزہ ہو کر رہ جائے گا مگر فریق مقابل کو شکست نہیں دے سکے گا۔ جذبۂ عقیدت اور جوش اخلاص سے لڑنے والے سپاہی کبھی ناکام نہیں ہوتے اور یہی روح عبدالرحمٰن کے لشکریوں میں کارفرما تھی لیکن گورنر قرطبہ کی فوج کو صرف ڈیوٹی کا فرض انجام دینا تھا اس لئے گورنر کی طرف سے اگرچہ اپنی فوج کو اُبھارنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی لیکن وہ ان دیوانوں کا مقابلہ کہاں کر سکتے تھے جو صرف جوشِ محبت اور جذبۂ خلوص سے جانیں لڑا رہے تھے۔ چنانچہ گورنر قرطبہ کو اپنی تمام جدوجہد کے باوجود شکست فاش کھانا پڑی اور نصرت و کامرانی کا سہرا عبدالرحمٰن کی پیشانی کی زینت بنا۔ اس کے لشکریوں نے گورنر کی فوج کو وہ زبردست شکست دی کہ اس کے بعد ان میں مزاحمت کی طاقت ہی باقی نہ رہی اور عبدالرحمٰن نے اسی معرکہ کو سر کرنے کے بعد اندلس کے تاج و تخت پر قبضہ کر لیا جس کے ساتھ ہی وہ اندلس کے فرماں روا کی حیثیت سے تختِ سلطنت پر جاگزیں ہوا۔ اس وقت عبدالرحمٰن کی عمر پچیس ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی اور وہ اندلس میں سلطنت امیہ کا پہلا بادشاہ تھا جس نے اس عظیم ترین دولت امیہ کا سرزمین اندلس میں سنگِ بنیاد رکھا جو قریباً آٹھ سو برس تک اس یورپی ملک میں داد جہانبانی دیتی رہی اور یورپ کے تمام ممالک کو علم و تہذیب کی روشنی سے منور کرتی رہی۔

عبدالرحمٰن نے جو تخت نشین ہونے کے بعد امیر عبدالرحمٰن کے
نام سے یاد کیا جانے لگا حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد
سلطنت کے داخلی نظام کی اصلاح کرنے کی طرف سب سے
پہلے توجہ کی اور معاشرے کے ہر پہلو میں نظم و نسق کی اصلاح
کی بداہنی کے زمانے میں ملک کے جو سردار باغی اور سرکش ہو
چکے تھے انہیں ایک انتظامی ضابطہ کے ماتحت زندگی گذارنے
کا پابند کیا اور بغاوت کی طرف مائل ہونے والے عناصر کی پوری
طاقت سے سرکوبی کی تاکہ انہیں پھر کبھی سر اٹھانے کی جرأت
نہ ہو سکی کہ اس کی ان سرگرمیوں کے نتیجہ میں بہت ہی تھوڑی
مدت کے اندر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک امن و
سلامتی کا ماحول قائم ہو گیا اور لوگ سکون و اطمینان سے زندگی
بسر کرنے لگے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد امیر عبدالرحمٰن
نے ملک کو خود کفیل اور خوشحال بنانے کے لئے زراعت و
کاشتکاری کو ترقی دینے کے وسائل فراہم کئے، نہروں کا ملک
کے گوشے گوشے میں جال بچھا دیا تاکہ زراعت کے لئے زمینوں
کو خاطر خواہ طریقہ پر پانی میسر آسکے اور ہر قسم کی پیداوار میں
اضافہ ہو۔ دریاؤں پر جا بجا پل بنوا کر ایک طرف سلسلہ مواصلات
کی توسیع و ترقی کا سامان کیا تو دوسری طرف اس سے نہروں کی
افراط کے لئے بھی سبیل پیدا ہو گئی۔ علاوہ ازیں ملک کے مختلف

حصوں میں بڑی کثرت سے باغات لگوائے تاکہ ملک کی عام سرسبزی و شادابی دیکھنے والوں کے لیے باعث کشش ہو۔
امیر عبدالرحمٰن کے اوصاف حمیدہ میں ایک نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ ارباب کمال کی قدر و منزلت میں اپنے حسن التفات کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرتا تھا اور خواہ کوئی کسی فن کا بھی ماہر و کامل ہو اس کے لئے اس کی قدر دانیوں اور انعاموں کا سلسلہ وسیع پیمانے پر جاری رہتا تھا حتیٰ کہ کوئی بھی صاحب فن اس کے بذل و ایثار سے محروم نہیں رہتا تھا۔ چونکہ امیر عبدالرحمٰن کو مبدء فیاض نے ابتدا ہی سے ہوشمندی، دانشوری اور ہونہاری کی دولتوں سے مالا مال کیا تھا اور یہ سب خوبیاں اس میں عالم طفلی ہی میں نمایاں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دادا ہشام نے اس کو تعلیم و تربیت بھی نہایت اعلیٰ پیرایہ میں دلائی تھی جس کی وجہ سے بچپن ہی میں اسے علوم و فنون اور سپہ گری وغیرہ میں نہایت کمال حاصل ہو چکا تھا اس لئے اہل فن اور ارباب کمال کی قدردانی کا ملکہ بھی اس میں بے انتہا موجود تھا۔ وہ ایک طرف بہترین نشانہ باز اور حیرت انگیز شہسوار تھا تو دوسری طرف نہایت ہمدرد غریب نواز، انصاف پسند، فیاض اور رحم دل بادشاہ تھا۔ عام لوگوں کے ساتھ بڑے معمولی لباس میں اور محبت و خلوص کے ساتھ ملتا تھا اور عوام کے رنج و راحت میں ہمدردی سے

شریک ہوتا تھا۔ دوسرے ممالک کے صاحب فن اور ارباب کمال جب امیر عبدالرحمٰن کے ان اوصاف کی شہرت سنتے تھے تو علوم و فنون کے کامل بڑی بڑی دور سے قرطبہ میں کھنچے چلے آتے تھے اور اپنے کمالات کی حسب منشاء داد پاتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں مختلف ممالک کے علماء و فضلاء اور ارباب کمال قرطبہ میں بکثرت جمع ہو گئے تھے اور قرطبہ دنیا بھر کے علوم و فنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔

اندلس میں بنو امیہ کی پرشکوہ سلطنت کی یہ ابتداء تھی جو عباسیوں کے ہاتھوں سے جان بچا کر اندلس کی طرف بھاگ نکلنے والے اموی شہزادے امیر عبدالرحمٰن اول کی مساعی جمیلہ سے ظہور پذیر ہوئی اور اس سنگ بنیاد پر دولت امیہ کا وہ عظیم الشان محل تعمیر ہوا جس کی شان و عظمت کی روشنی متواتر آٹھ سو سال تک یورپ کی آنکھوں میں علم و کمال اور تہذیب و تمدن کی چکا چوند پیدا کرتی رہی۔ امیر عبدالرحمٰن اوّل کے بعد اُس کے اخلاف بتدریج تخت سلطنت پر متمکن ہوئے اور ہر جانشین اپنی سلطنت کی ترقیوں میں اپنے پیش رو سے بڑھ کر چار چاند لگاتا رہا۔ امیر عبدالرحمٰن اوّل کے بعد ہشام، الحکم اوّل اور امیر عبدالرحمٰن الثانی نے اس عروج و استحکام اور تہذیب و تمدّن میں خاطر خواہ اضافہ کیا جس کی داغ بیل ان کے جد امجد نے ڈالی تھی۔

پھر امیر عبدالرحمٰن الثالث نے جو امیرالمؤمنین عبدالرحمٰن الناصر الدین اللہ کے نام سے معروف ہوا ان ترقیوں میں حیرت انگیز اضافے کئے۔ غرضیکہ اس سلطنت کی سرسبزی و خوشحالی ساتھ ہی ساتھ بڑھتی گئی اور وہ اس درجہ تک پہنچ گئی کہ امیرالمؤمنین عبدالرحمٰن الناصر الدین اللہ کے عہد میں صرف چونگی کی آمدنی سے خزانہ عامرہ کو قریباً بارہ کروڑ روپیے سالانہ وصول ہوتے تھے جن میں سے ایک تہائی فوجی ضرورتوں پر صرف ہوتا تھا، ایک تہائی امور رفاہ عامہ (پبلک ورکس)، ترقی تعلیم و تجارت اور علم و فن کی دستگیری کے لئے مخصوص تھا اور تیسری تہائی سرمایہ محفوظہ میں جمع ہوتی تھی۔ یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ مولانا ظفر علی خاں کے الفاظ کی روشنی میں اس حد کمال کو پہنچے ہوئے تہذیب و تمدن اور عروج و ارتقاء پر ایک نظر ڈال لی جائے جو خلفائے بنو امیہ کی فرمانروائی کی بدولت ہسپانیہ کے طول و عرض میں صدیوں تک قائم رہے کیونکہ یہی تہذیب و تمدن اور اموی حکمرانوں کی قدر دانی و علوم نوازی ان دانشوران باکمال کو معرض وجود میں لانے کا باعث ہوئی جو میری اس کتاب کا موضوع ہیں۔ تاجداران بنی امیہ کا پیدا کیا ہوا یہی ماحول تھا جس میں ہر قسم کے علوم و فنون کو ترقی کے مدارج طے کرنے کا موقع ملا۔ وہ جوابا بیہ فن و اصحاب کمال کی مخلوقوں کو بر لانے اور ان کے حوصلے بڑھانے کے لئے

سب سے بڑھ کر سازگار ثابت ہوا اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اندلس کی ترقیوں اور اقبالمندیوں کا وہ مرقع یہاں پیش کیا جائے جو مولانا ظفر علی خاں جیسے ادیب محقق کے کلک جواہر نگار نے الفاظ و حروف کے رنگ و روغن سے کھینچا ہے۔
وہ امیر المؤمنین عبدالرحمٰن الناصرالدین اللہ کے عہد زریں کی فیوض و برکات کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"دولت" علم اور قوت کی درخشاں ترین روایات اندلس کے امویوں کی تین نسلوں سے وابستہ ہیں۔ ہشام ثانی کا عہد شاندار جنگی کارناموں کا دور ہے۔ اس کے باپ الحکم ثانی کے زمانے میں علوم و فنون اور دانش و حکمت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے دادا عبدالرحمٰن الناصر کا عہد سلطنت (سنہ ۹۱۲ء تا سنہ ۹۶۱ء) دولت و ثروت، عظمت و جلالت اور فرخی و فراخی کے اعتبار سے ہسپانوی عربوں کے انتہائی تفوق کا زمانہ تھا۔

عربی سلطنت کے آخر الذکر دور میں (عبدالرحمٰن الناصر کے زمانے میں) اندلس پر ایک زرخیز اور گوہر ریز باغ کا گمان ہوتا تھا جس کی شادابی و دل کشائی آپ ہی اپنی مثال تھی۔ مشرق کے دل ربا اور جانفزا پودے جا بجا اس مقامی نباتات کے پہلو بہ پہلو

اُگے ہوئے نظر آتے تھے جو یورپ کی پیداوار ہونے کے باعث قدرت کی رعنائیوں سے اتنی بہرہ اندوز نہ تھی جتنی مشرق کی نباتات بہرہ یاب ہے۔ ویلنشیا اور مرشیا کے معتدل اور سیر حاصل اضلاع میں آج کل بھی آبادی کی کثرت ہے۔ لیکن اس زمانے میں اس کثرت کی ہجوم آدمی کا عالم ہی نرالا تھا۔ ان دنوں کیسٹیل قدیم کی بے شجر گھاٹیوں کا بھیانک سونا پن ضرب المثل ہے لیکن اگلے زمانے میں یہ علاقہ جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور کچھ کچھ فاصلہ پر خوشنما گاؤں آباد تھے۔ لامنچا کے میدانوں میں جو حد نگاہ تک پھیلے ہوئے چلے گئے ہیں آج جہاں چرواہے کے ریوڑ کو ایک جنگالی بھر خورش بھی اچھی طرح میسر نہیں آتی اسلام کے دور تسلط میں پکتے ہوئے اناج کی سنہری فصلیں جھومتی اور لہراتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

اراضی کی نوعیت، خاص خاص پیداواروں کے لئے اس کی مخصوص موزونیت، فصلوں کو بدل بدل کر بونے کے فوائد، مختلف قسم کی کھادوں کی تاثیر، کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے نہروں اور تالابوں کی تیاری اور پانی کی کفایت شعارانہ تقسیم۔ یہ تمام باتیں ہسپانوی مسلمانوں کو اچھی طرح معلوم تھیں۔ وہ فلسفۂ فلاحت کے پورے ماہر تھے اور جو کامیابی انہیں کاشتکاری میں نصیب ہوئی وہ عقلوں کو حیرت میں ڈال رہی ہے۔ ایک

اچپہ بھر زمین بھی ضائع نہیں کی جاتی تھی۔ پہاڑوں کے سنگلاخ پہلوؤں کو بے انتہا محنت اور کاوش سے تراش تراش کر درجہ بدرجہ چبوترے بنائے جاتے تھے اور ان پر مٹی جما کر اس میں انگور کی بیلیں بوئی جاتی تھیں۔ کسی چٹان کے گوشے میں اگر اتنی جگہ بھی موجود ہوتی تھی کہ ایک چکوترے یا زیتون کے درخت کی کاشت کو کفایت کرے تو پتھروں کو جوڑ کر ایک چھوٹی سی مثلث بنا دی جاتی تھی اور اس میں مٹی بھر کر درخت لگا دیا جاتا تھا جس کی نہایت عرق ریزی اور جانفشانی سے پرورش کی جاتی تھی۔

فصلوں کی پیداوار اکثر سو گنا ہوتی تھی۔ بہت سے اضلاع کی زمینوں کی پیداوار اور زرریزی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک ہی کھیت میں مختلف قسم کی چار فصلیں پیدا ہوتی تھیں۔ جنوبی علاقہ جس کی طبعی زرخیزی میں موسم کے اعتدال اور آفتاب کی جان پرور حرارت نے غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔ فردوس زمین کے موزوں لقب سے ملقب تھا۔ قرطبہ، غرناطہ اور مرشیا کے مضافات اپنے مناظر کے حسن کے لئے مشہور تھے اور ان کی نباتاتی بالیدگی پر سلطنت کے کسی بڑے دار الحکومت کے اطراف کی بجائے ملک کے کسی دور افتادہ قریہ کے نواح کا گمان ہوتا تھا۔ اشبیلیہ کے باغات زیتون اپنی وسعت و

دل آویزی کے لحاظ سے دنیا بھر میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے
اس شہر کے قریب دریائے النہر الکبیر کے کنارے میوہ دار
درختوں کی قطاروں سے مزین تھے اور تیس تیس میل تک
مزرعوں، قلعوں اور سدا بہار سبزہ اور پھولوں میں چھپے ہوئے
محلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا چلا گیا تھا۔ آبپاشی کے لئے ہر صوبہ میں
نہریں جاری تھیں جن کا منصفانہ انتظام دیہات کے ان ذمہ
دار لوگوں کے سپرد تھا جن کا تقرر رعایا ہی کے انتخاب سے
عمل میں آتا تھا۔ دیو قامت سنگین پل جن پر پانی لے جانے کی
نالیاں بنی ہوئی تھیں پہاڑوں کو ملاتے اور وادیوں کو قطع کرتے
ہوئے کوہستانی چشموں کا تازگی بخش پانی دور دراز کے پیاسے
میدانوں کو سیراب کرنے کے لئے لے جاتے تھے۔ مسلمانوں کو
آب اندوزی و آب رسانی کے فن میں یہاں تک مہارت حاصل ہو
گئی تھی کہ وہ ان مقامات میں بھی چشمے نکال لیتے تھے جہاں
سے بظاہر پانی کی ایک بوند کے حاصل ہونے کی بھی کوئی صورت
نظر نہ آتی تھی صدہا زمین دوز نہریں جو سنگ خارا کو کاٹ کر بنائی
گئی ہیں۔ آج بھی زبان حال سے ان کی ان تھک ہمت اور استقلال
کی شہادت دے رہی ہیں۔

عباسیوں اور فاطمیون کی باہمی آویزشوں اور مسلسل خانہ جنگیوں
نے ان دونوں حریفوں کا زور گھٹا کر اور ان کی تجارت کو روک

کہ اندلس کے امویوں کے لئے غیر محدود ترقی کے ایسے مواقع پیدا کر دیئے تھے جن سے انہوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اول تو ان کا ملک سب سے الگ تھلگ واقع تھا۔ اور دوسرے مدت ہائے مدید تک ان کی حدود سلطنت میں امن و امان قائم رہا۔ ایسی حالت میں غیر ممالک کے ساتھ ان کے تجارتی تعلقات کی روز افزوں وسعت کو کوئی چیز نہیں روک سکتی تھی اور چونکہ ان کے پاس تجارتی جہازوں کا بھی ایک بہت بڑا بیڑا موجود تھا اس لئے مال کے نقل و حمل میں ان کو خاص آسانیاں حاصل تھیں اور وہ سمندر کی راہ سے ان مقامات تک پہنچ سکتے تھے جنہیں خشکی کی طرف سے قبائلی خصومت اور مذہبی تعصب بسا اوقات دشوار گذار بنا دیتا تھا۔ اسکندریہ کی عظیم الشان تجارتی منڈی کا دروازہ تو خلفائے مغرب کی رعایا کے لئے بند تھا لیکن اس کی تلافی قسطنطنیہ نے بڑی خوبی کے ساتھ کر دی تھی جس کی آبادی مسلمانان اندلس کے ساتھ ہمیشہ مہمان نوازی کا برتاؤ کرتی تھی۔ اور دونوں ملکوں کے سیاسی تعلقات بھی دوستانہ تھے۔ تاجداران اندلس کو فرمانروایان قسطنطنیہ کے ساتھ ایک گہرا اور دیرپا اتحاد قائم کرنے پر جس دانشمندانہ مصلحت نے آمادہ کیا۔ اس کے نتائج کا اندازہ اس دولت و ثروت سے نہیں کرنا چاہیئے جس نے اسلامی

خزانوں کو معمور کر دیا تھا بلکہ اس زبردست اثر سے کرنا چاہیئے جو اس حکمت عملی نے علوم و فنون کی ہر شاخ پر ڈالا۔ خلافت مغربیہ کا آفتاب دولت و اقبال جن دنوں نصف النہار پر تھا تو اس زمانے میں اس کے تجارتی جہازوں کی تعداد ایک ہزار سے بڑھی ہوئی تھی۔ تجارتی مال کی خرید و فروخت کے لیئے مشرقی ممالک کے بعید ترین مقامات مثلاً سیلون، سغدانیہ (باختر) اور چین میں کوٹھیاں قائم تھیں اور دنیا کا کوئی سمندر ایسا نہ تھا جس کی لہروں پر امویوں کا تجارتی جھنڈا نہ لہراتا ہو۔

دولت عباسیہ کے جاہ و جلال کا افسانہ تمدن کی محفل میں گونجتا ہوا سنائی دیتا ہے لیکن اندلس کی دولت امویہ کے تمدنی کارنامے کئی ایک اعتبار سے اس کے لیئے فوقیت کا حق پیدا کر رہے ہیں۔ اس کے تعمیرات عامہ کے کاموں کی وسعت اس کے قصروں اور ایوانوں کی عظمت، اس کی مساجد و معابد کی آرائش کا تفوق ہر طرح مسلم ہے۔ اس کا کامل و مکمل نظام فلاحت اپنے نتائج کے لحاظ سے ایشیا کے باغ یعنی عراق عرب کے سب سے زیادہ زرخیز و شاداب خطوں کے زراعتی طریقوں سے لگا کھاتا تھا۔ دمشق اور بغداد کی تجارت جس کا دارومدار بڑی حد تک اونٹوں کے قافلوں پر تھا۔ اندلس کی

تجارت کے سامنے جو کارواں کے علاوہ بڑے بڑے بیڑوں میں لد کر جاتی تھی کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔

خلافت مغربیہ کی حشمت و ثروت کا بہترین معیار اس کی آبادی کی کثرت اور اس کے مداخل کی فراوانی تھا۔ محققین کا اندازہ ہے کہ عبدالرحمٰن الناصر کی رعایا کا شمار کم از کم تین کروڑ تھا پایۂ تخت قرطبہ اگرچہ بہت بڑی وسعت رکھتا تھا اس کی دولت وہم و گمان سے برتر تھی۔ اس کے مضافات شکوہ و عظمت کے آئینہ دار تھے اور وہ تمدن کی طاقتوں کا مرکز تھا لیکن سلطنت کے اکثر دوسرے شہر بھی بہت بارونق تھے اور قرطبہ کی گوناگوں برکتوں سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے تھے۔ عبدالرحمٰن الناصر کی سلطنت میں اوّل درجہ کی اسّی اور دوسرے درجہ کی تین سو میونسپلٹیاں آباد تھیں۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور قریوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ صرف ایک دریائے النہر الکبیر کے کنارے بارہ ہزار گاؤں بسے ہوئے تھے۔ آبادی ایسی گنجان تھی کہ ایک دن کے سفر میں مسافر کا گذر قصبات اور دیہات کے ایک غیر منقطع سلسلہ کے ضمن میں تین بڑے شہروں میں ہوتا تھا۔ صوبوں کے دار الحکومتوں کی دولت و حشمت اور شان و شکوہ اندلس کی حدود سے باہر اور کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اشبیلیہ اور المیریا میں پانچ لاکھ، غرناطہ میں

سوا چار لاکھ، ملاجہ میں تین لاکھ، ویلنشیا میں اڑھائی لاکھ اور تاہیدہ میں دو لاکھ نفوس آباد تھے۔

ان بڑے شہروں کی صفائی کا انتظام ہر لحاظ سے کامل و مکمل تھا۔ سڑکیں پختہ تھیں اور ان پر رات کے وقت روشنی ہوتی تھی۔ بدر روؤں کا ایک جال ہر قسم کی مرطوب غلاظتوں کو کھینچ کر لے جانے کے لئے شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر ویلنشیا کے نیچے بعض زمین دوز بدر روئیں اتنی بڑی بڑی تھیں کہ ایک چھکڑا ان میں سے بآسانی گزر سکتا تھا اور چھوٹی سے چھوٹی نالیاں بھی اتنی فراخ تھیں کہ کوڑے کرکٹ سے لدا ہوا ایک جانور ان کو طے کر سکتا تھا۔ قیام امن کے لئے ضابطہ دان پولیس کی باقاعدہ جمعیتیں کثیر تعداد میں مقرر تھیں جو دن رات ہر شارع عام اور ہر کوچہ و بازار میں گشت لگاتی پھرتی تھیں اور پہرے چوکی کے فرائض بھی بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھیں۔

مختلف اسلامی تاجداروں کے عہد میں اندلس کے محاصل کا جو اندازہ محققین نے لگایا ہے اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یورپ کے باقی تمام فرمانرواؤں کی مجموعی آمدنی بھی اتنی نہ تھی جتنی اکیلے اندلس کی تھی۔ جو مواد اس سلسلہ میں ہمارے پاس موجود ہے وہ اگرچہ اس قدر مفصل و مصرح تو نہیں جتنا ہونا

چاہیے تھا پھر بھی جس قدر ہے صحیح و قابل اعتبار ہے اور جن معدودے چند نکتہ چینیوں نے اس میں سقم نکالنے کی کوشش کی ہے ان کی جرح کسی طرح بھی قابل اعتناء نہیں ہے۔

عبدالرحمٰن الناصر کے عہد میں خلافت مغربیہ کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ انتیس لاکھ پینتالیس ہزار دینار تھی جو آج کل سکے تبادلہ کی شرح کو مدنظر رکھتے ہوئے چار کروڑ ڈالر سے بھی زائد ہوتی ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دسویں اور بیسویں صدی میں روپیہ کی قیمت کی نسبت ایک اور دس کی ہے تو خلافت مغربیہ کی دولت کی اس فراوانی پر ہمیں بے حد حیرت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہسپانیہ کا رقبہ کچھ ایسا زیادہ وسیع نہیں اس کے باوجود جو قوم ایسی مختصر جغرافی حدود کے اندر رہ کر اپنی گورنمنٹ کے خزانے میں اتنی کثیر رقم کسی دقت کے بغیر داخل کر سکتی ہو اور اس کی تجارتی خوش حالی پر اتنا بڑا خراج کوئی مضر اثر نہ ڈال سکتا ہو اس کی دولت و تمول کے اندازہ کے لئے یہی ایک واقعہ بجائے خود ایک بہت بڑی دلیل ہے اور اعداد و شمار کے ضخیم و حجیم دفاتر بھی اگر ہمارے سامنے رکھ دیئے جائیں تو اس دلیل کی قوت میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔

مال گزاری کی مدات میں سب سے بڑی مد وہ محصول

تھا جو معدنیات، زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کی آمدنی کے ایک دسویں حصے کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا اس کے علاوہ ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈالر کی رقم یہودیوں اور مسیحیوں سے اس آزادی کے معاوضہ کے طور پر لی جاتی تھی جس کی رو سے ان کو یہ حق حاصل تھا کہ مسلمان ان کے قومی قوانین رسم و رواج اور ان کے مذہب میں کوئی دست اندازی نہ کرنے پائیں۔ دوکانوں پر، جائداد کی فروخت پر اور درآمد کے مال پر بھی خاص خاص محصول لگائے جاتے تھے لیکن وہ خفیف تھے جن کا ادا کرنا لوگوں کے لئے دوبھر نہ تھا۔ ایک جنگ جو اور نبرد آزما زمانے میں آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ اس مال غنیمت کا پانچواں حصہ تھا جو جنگ میں ہاتھ آتا تھا اور تقسیم کے بعد شاہی خزانے میں داخل کر دیا جاتا تھا اس رقم کی مقدار کا تعین دشوار ہے اس لئے کہ ہر لڑائی میں مال غنیمت کی مقدار مختلف ہوتی تھی اور تقسیم کے بعد اس کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جاتا تھا اور اگر کیا بھی جاتا تھا تو وہ صحیح نہ ہوتا تھا جنگی ضرورتیں اور تعمیرات عامہ کے بڑے بڑے کاموں کے مصارف بعض اوقات غیر معمولی محصولات کا بار بھی رعایا پر ڈال دیتے تھے جو اگرچہ قانوناً جائز نہ تھا لیکن رعایا عموماً بلا احتجاج یہ سمجھ کر اس بار کو اٹھا لیتی تھی کہ اس کا مصرف اعلائے کلمۃ الحق اور شاندار

مساجد اور قومی عمارات کی تعمیر ہے۔

سلطنت کے ارکان کے حشم و خدم اور فروشکوہ میں سلاطین کی شان امارت نظر آتی تھی۔ ان کے محل، ان کے دربار اور ان کے جلوس اگر دبدبہ اور طنطنہ میں کم ہوتے تھے تو صرف خلیفۂ وقت کے کروفر سے۔ یورپ کا کوئی مسیحی تاجدار شان و شوکت میں ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ اپنی دولت کو جس کی فراہمی میں ہر شرعی اور عرفی حیلے سے کام لیا جاتا تھا بے دریغ خرچ کرتے تھے اور ان کے جود و اکرام اور بذل و ایثار کی بارش لگاتار ہوتی رہتی تھی۔ عبدالرحمٰن الناصر کے وزیر ابن شبید کی سخاوت کا ایک واقعہ اس زمانے کے مؤرخوں نے قلم بند کیا ہے جس سے سلطنت کے اعلیٰ عہدہ داروں کی بے قیاس دولت کا تخمینہ کیا جا سکتا ہے۔ معطی کے عطیہ میں ایک بہت بڑی جاگیر شامل تھی جس کے جنگلوں کے درختوں کا شمار بیس ہزار تھا۔ ساٹھ غلام اور کنیزیں تھیں جن کے انتخاب میں ان کے حسن اور سلیقہ نے حصہ لیا تھا۔ ایک سونا در الوجود گھوڑے اور خچر تھے۔ آٹھ سو نفیس زرہیں تھیں۔ ایک بہت بڑی تعداد قیمتی ہتھیاروں، خیموں، شامیانوں، قالینوں، گدیلوں، ریشمی تھانوں اور جھالروں کی تھی۔ قاقم اور سمور کے متعدد نایاب لبادے اور زربفت و حریر کی کئی قبائیں تھیں۔ کافور، اگر، مشک اور عنبر کے ڈھیر

تھے۔ ان سب پر مستزاد زر مسکوک اور نا مسکوک طلا سے
احمر بقدر ساڑھے پانچ لاکھ دینار کے تھا۔ اس شاہانہ عطیہ کی
مجموعی مالیت پچاس لاکھ ڈالر سے اوپر ہی ہوتی ہے۔
اندلس کے مسلمان فرمانرواؤں کی سیاسی فرزانگی نے کوئی
دقیقۂ احتیاط اٹھا نہ رکھا تھا جس سے ان کے اقتدار و سطوت
کی بنیاد مستحکم اور ان کی سلطنت بیرونی حملہ آوروں کی زد
سے محفوظ ہو سکے۔ بحر روم میں عبدالرحمٰن الناصر کے جنگی بیڑے
کی طاقت اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ اس کی بے قاعدہ فوج کا تو
کوئی شمار ہی نہ تھا لیکن جو فوج باقاعدہ طور پر بھرتی کی جاتی
تھی۔ اور ایک اشارے پر ہتھیار اٹھا کر مرنے مارنے کے
لئے تیار رہتی تھی اس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے متجاوز تھی۔
خلیفہ کا جیش خاصہ اپنے ساز و سامان کے تجمل اور اپنی کامل
ضابطہ شناسی و قواعد دانی کے لئے مشہور تھا۔ یہ چیدہ
جیش بارہ ہزار جنگ آزمودہ جوانوں سے مرکب تھا جن میں
آٹھ ہزار سوار تھے۔ ان سواروں کے ہتھیار جن کی نفاست
اور مضبوطی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اس زمانے کی جنگی صنعت
کے بہترین ماحصل تھے۔ ان کی وردیاں نفیس ترین ریشم کی تھیں۔
ان کے گھوڑوں کے جگمگاتے ہوئے ساز و براق پر آنکھ نہ ٹھہرتی
تھی۔ ان کی تلواروں کے قبضوں میں جواہرات جڑے ہوئے

تھے۔ ان کی پیٹیاں اور ان کی تلواروں کے نیام خالص سونے کے تھے۔

سلطنت کی سرحدات کے ساتھ پایۂ تخت کے رسل و رسائل کے واسطوں کو آسان و سریع السیر بنانے کی غرض سے پختہ سڑکیں موجود تھیں۔ جنہوں نے نہ صرف فوج کی نقل و حرکت بلکہ مال تجارت کے حمل و نقل کو سلطنت کے طول و عرض میں آسان کر دیا تھا۔ مسافروں کی حفاظت اور سلامتی کے لئے سڑکوں پر کچھ کچھ فاصلہ کے بعد سنتریوں کا پہرہ مقرر تھا جن کی جمعیتوں کے لئے سر راہ بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ پیغام رسانی کے لئے ڈاک کا بہت عمدہ انتظام تھا۔ قاصد گھوڑوں کی ڈاک بدلتا ہوا اتنی سرعت سے پیغام پہنچا دیتا تھا کہ اجنبی آدمی کو اس پر جادو کا گمان ہوتا تھا اور وہ متحیر رہ جاتا تھا۔ روشنی کے بے شمار برج طویل ساحل کے کنارے کنارے ہر کونے پر بنے ہوئے تھے اور ان کی چوٹیوں پر الاؤ روشن ہوتے ہی ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک چشم زدن میں حریفوں یا حلیفوں کے بیڑوں کے نمودار ہونے کی اطلاع ہو جاتی تھی۔

رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے خزانہ عامرہ سے بیش بہا رقمیں بار بار دی جاتی تھیں۔ ان رقوم کا مصرف اس کے

سوا اور کچھ نہ تھا کہ ملک کے کاریگروں اور مزدوروں کے لئے معاش کی ایک ایسی سبیل نکالی جائے جس میں سود منڈی اور آرائش کا دو گونہ پہلو نکلتا ہو۔ عبدالرحمن ثانی نے مملکت کے طول و عرض میں منادی کرا دی تھی کہ کسی شخص کے لئے جو کام کرنے کی قابلیت اور ارادہ رکھتا ہو بے روزگاری بھوک کی وجہ نہیں ہونی چاہیئے۔ اس اعلان میں گویا یہ مفید و نفع بخش اصول مضمر ہو گیا کہ سلطنت کی جمع کی ہوئی دولت رعایا کا مال ہے۔ یہ اسی اصول کی عام پیروی کا نتیجہ ہے کہ اس جزیرہ نما کے ہر حصہ میں جس پر کبھی مسلمانوں کی حکومت تھی ہمیں قدم قدم پر قلعوں اور مسجدوں اور پلوں اور نہروں کے آثار نظر آتے ہیں۔

بیماروں، اپاہجوں اور مصیبت زدہ لوگوں کی خبر گیری سرکار کی طرف سے ہوتی تھی۔ ان کے لئے سرکاری مکان بنے ہوئے تھے۔ جہاں ان کے علاج معالجہ، تیمار داری، اور آرائش کے تمام لوازم مہیا تھے۔ یتیموں کی تربیت اور پرورش کی کفیل خلیفہ کی جیب خاص تھی۔ قرطبہ کے ایک مدرسہ میں پانچ سو یتیم بچے شاہی خرچ سے تعلیم پاتے تھے۔ رعایا کی مربیانہ سرپرستی اور شاہانہ بذل و ایثار کی یہ ایک ایسی شریفانہ مثال ہے جس کی ستائش میں ہمیں بے اختیار تر

زبان ہونا پڑتا ہے اور جس کی موجودہ ترقی و بیداری کے زمانے میں بھی نظیر نہیں مل سکتی۔

اپنے پیش رؤں اور جانشینوں کی طرح ہسپانوی عربوں کے سر میں رومۃ الکبریٰ کی عظمت و جلال کے پر غرور نقوش مٹانے کا سودا نہیں سمایا ہوا تھا۔ یہ سچ ہے کہ رومن عہد کی جو عمارت بالکل ہی کھنڈر ہو کر رہ گئی تھی اس کا مسالہ انہوں نے اپنی عمارتوں میں ضرور صرف کیا لیکن مسلمانوں کی روادارانہ بدیع نوازی عہد قدیم کی شاندار عمارات کو جان بوجھ کر وحشیانہ طریقہ پر گزند پہنچانے سے ہمیشہ محترز رہی۔ اپنے قبضہ کے ابتدائی دنوں ہی سے ان کے نازبیت یافتہ مگر دور رس دماغ نے ان عمارات کو جنہوں نے قیاصرہ کی عظمت و جلال کو جاودانی زندگی بخش رکھی تھی۔ مرعوب اور حیرت زدہ ہو کر دیکھا تھا۔ دور اوّل کے قیصران روم کے بنائے ہوئے جو پل اور قلعے زمانے کی دستبرد سے بچ رہے تھے انہیں مسلمانوں نے نئے سرے سے درست کر دیا۔ سڑکوں کو جو سلطنت کی جنگی حکمت عملی کے ساتھ ایک گہرا تعلق رکھتی تھیں۔ مرمت کرنے کے بعد وسعت دی۔ مورتوں کے علاوہ جو انسانی شکل کی مثیل ہونے کے لحاظ سے بت پرستی کی نجاست سے آلودہ تھیں۔ یونانی یا رومن فن سنگ تراشی کے اور جس قدر

لطیف نمونے مسلمانوں کے ہاتھ آئے ان سب کی انہوں نے نہایت احتیاط سے حفاظت کی۔ مسلمانوں کے ہر فعل اور ہر جذبہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ دنیا کے سابق فرمانروا آئندہ نسلوں کے لئے اپنے صنعت گرانہ کمال کے جو عظیم بالشان اور نظر فریب نمونے چھوڑتے گئے ہیں انہیں وہ احترام و استحسان کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

خلفائے بنی امیہ کا دارلسلطنت

اس تمام حیرت انگیز تمدن کا جس کا تذکرہ سطور بالا میں کیا گیا ہے سب سے بڑا مرکز شہر قرطبہ تھا۔ شہر کیا تھا دار الخلافہ ہونے کی حیثیت سے بجائے خود ایک عظیم الشان سلطنت کا حکم رکھتا تھا۔ اس کی کثیر التعداد آبادی، اس کی بے شمار تجارتی دولت، اس کے زبردست مذہبی اقتدار اور اس کی پرغرور سیاسی طاقت نے وہ تمام لوازم فراہم کر دیئے تھے جو سلطنت کی ہیئت ترکیبی کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ اوّل درجہ کے آٹھ اور کم تر درجہ کے تین ہزار شہروں کا شمار اس کے توابع میں تھا۔ ہر سال تیس لاکھ دینار (چھ کروڑ ڈالر یا پونے انیس کروڑ روپیہ) اس کے خزانے

میں داخل ہوتا تھا۔ عہد قدیم یا قرن وسطیٰ کی کوئی قوم صنعت و حرفت، علوم و فنون اور دانش و حکمت میں اس کی آبادی کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ اس شہر کے بسنے والوں کی تعداد کسی طرح بھی دس لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ ان کے مکانات جو عموماً پتھر کے بنے ہوئے تھے ظاہری صورت کے اعتبار سے نظر فریب تو نہ ہوتے تھے کیونکہ بیرونی آرائش کا یہ فقدان مشرقی فن عمارت کا خاصہ ہے لیکن اندر جا کر دیکھنے سے آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ سجے ہوئے کمروں کی دیواروں پر طرح طرح کی گل کاری، فرش سے لے کر سقف تک انواع و اقسام کے نقش و نگار، خانہ باغ میں سبزہ و گل کا قرینہ کے ساتھ ہجوم، بکھری ہوئی روشوں پر پھولوں کی خوشبو، سنگ مرمر کے حوضوں میں فواروں کا رقص، یہ جانفزا مناظر مسلمانان قرطبہ کی معاشرت کی اندرونی جھلک دکھاتے تھے۔ بازاروں کی گلیاں آفتاب کی جانسوز شعاعوں کی تمازت سے محفوظ رہنے کے لئے اگرچہ قصداً تنگ بنائی گئی تھیں لیکن پختہ تھیں اور پانی کے نکاس کا ان میں پورا انتظام تھا اور ہر وقت کی نگرانی سے ان میں صفائی اور پاکیزگی کا یہ عالم تھا کہ آج کل کے یورپ کی سب سے زیادہ ستھری اور باسلیقہ میونسپلٹیوں کو بھی یہ صفائی نصیب نہیں ہے۔ گرمیوں میں شامیانے تان کر خنکی

کی روح پرور کیفیت پیدا کر لی جاتی تھی بازاروں کی دورویہ عمارتوں پر سائبان ہی سائبان کھنچے ہوئے نظر آتے تھے۔ جن میں سورج کی کرنیں اثر انداز نہیں ہو سکتی تھیں اور لوگ ان کے نیچے آرام سے چلتے پھرتے تھے۔ امراء اور ارکان دولت کے محلوں کو چھوڑ کر کہ وہ بھی بے شمار تھے شہر کے دوسرے باشندوں کے مکانات کی تعداد ایک لاکھ تیرہ ہزار تھی۔ دکانیں چوراسی ہزار تھیں، مسجدیں سات سو تھیں، حمام نو سو سے بھی زائد تھے۔ بازار پورے چار ہزار تین سو تھے جن میں ہر ملک کے بیش قیمت تجارتی ذخیروں کا ڈھیر اور ہر قوم کے تاجروں اور مشتریوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔

ان گنت لیمپوں کی روشنی سے قرطبہ رات کو بقعۂ نور بنا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ پیدل چلنے والا شہر اور اس کے مضافات کے بیچوں بیچ دس میل تک ناک کی سیدھ میں گشت کرتا ہوا جا سکتا تھا۔ امن وامان کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی سونا بھی اچھالتا ہوا جاتا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے آنکھ بھر کر دیکھ سکے۔ دار الخلافہ کا مجموعی رقبہ دریائے بیٹس کے کنارے کنارے کہ اندلس کے اسی ایک دریا کو مسلمانوں نے عربی نام النہر الکبیر دیا ہے چوبیس میل طویل اور چھ میل عریض تھا۔ خاص شہر

کے گرداگرد ایک مستحکم فصیل کھنچی ہوئی تھی جس کا دور چودہ میل تھا۔ بازاروں کی تعداد اور وسعت اور تجارتی مال کے تنوع اور بوقلمونی کے اعتبار سے قرطبہ ایشیا کے بارونق سے بارونق شہر پر سبقت لے گیا تھا اور باسفورس کے مغرب میں بجز ایک قسطنطنیہ کے اور کوئی شہر اس کی ٹکر کا نہ تھا۔

اس عظیم الشان دار الخلافہ کی دکانوں میں کوئی ایسی نایاب اور گراں قدر نعمت جو دستر خوان کی لذتوں یا حرم سرا کی عشرتوں میں صرف ہو سکے ایسی نہ تھی جو دستیاب نہ ہو سکتی ہو۔ یونان، اٹلی اور ایبے سینیا کی حسین و جمیل کنیزیں، گوری رنگت والے خواجہ سرا جنکے قامت کی موزونی اور اعضاء کے تناسب کے حق میں ان کا عیب ہنر ہو گیا تھا، کالے بھجنگ شیدی جن کی ڈراونی صورت اور لمبا تڑنگا جسم خلیفہ کے حشم و خدم کا ایک دل پسند عنصر تھا۔ ہر زبان کی کتابیں اور قلمی مسودے، سرزمین مشرق کے نفیس ترین مسالے اور عطریات، بے بہا جواہرات جن کی درخشانی و لمعانی جنس لطیف کے نور جمال کے لئے فانوس کا کام دیتی ہے۔ ہر رنگ اور ہر جنس کی خلعت ہائے فاخرہ جن کے زرتار حرم میں اشعار اور قطعات اور طغریٰ

بنے ہوئے تھے۔ یہ تمام لوازم عشرت اور ایسا ہی دوسرا بیش قیمت مال جو انسان کی حرص و طمع اور اس کے نفسانی جذبات کو اُبھارا کرتا ہے ہر روز قرطبہ کے گوہر بیز اور حسن آفریں بازاروں میں آنے جانے والوں کی للچائی ہوئی نگاہوں سے گزرا کرتا تھا۔

سوداگروں، مسافروں اور زائروں کے اس ہجوم کثیر کے قیام کے لئے جسے جلب منفعت کی ہوس یا سیر عجائبات کی آرزو یا زیارت کا شوق ہر روز کشاں کشاں مغرب کے شہرۂ آفاق پایۂ تخت میں لاتا تھا۔ متعدد بڑی بڑی کارواں سرایئں بنی ہوئی تھیں۔ بے استطاعت طالب علموں کے لئے جنہیں تحصیل علم کا شوق تھا حکومت نے علمی مہمان خانے مہیا کر رکھے تھے جن میں بیت المال سے ان کو مفت کھانا ملتا تھا اور وظائف الگ دیئے جاتے تھے اور قرطبہ کی متنوع زندگی کی یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جو بے اختیار دل کو بھاتی تھی۔

شہر کی آب رسانی کے لئے کوہستانی ندیوں میں سے ایک پختہ نہر جس کا طول اڑھائی فرسخ تھا کاٹ کر لائی گئی تھی۔ اس مرتفع نہر کے پتھروں کی چنائی میں جس مسالہ کا استعمال کیا گیا تھا اس میں شنگرف ملا دیا گیا تھا۔ گرد و

نواح کے سبزہ زاروں کی زمردین بہار میں شہر کے دور سے نظر آنے والے رفیع و وسیع پشتہ کی شنگرفی رنگت آنکھوں میں کھبی جاتی تھی۔ ہر محل کے بیرونی چوک اور ہر مسجد کے صحن میں چھوٹتے ہوئے فوارے فضا میں موتی بکھرتے ہوئے نظر آتے تھے کسی جگہ پیتل کا کوئی عجیب الخلقت شیر یا کریہہ المنظر مگرمچھ اپنے مہیب منہ میں سے سیلاب اگل رہا تھا۔ کسی مقام پر سنگ یشب اور مرمر کے دل کشا حوض لبریز ہو کر اپنے کناروں سے آب مصفا کی مترنم دھاریں بہا رہے تھے۔ باغ اور چمن ہر سرزمین کے درختوں، پودوں اور پھولوں سے مالا مال تھے اور ہوا ان کے شگوفوں اور چٹکتی ہوئی کلیوں کی خوشبوؤں سے لدی ہوئی تمام شہر کے گلی کوچوں میں اپنی عنبر آفریں متاع کو لٹاتی پھرتی تھی۔ شہر قرطبہ پانچ بڑے بڑے طبقوں میں منقسم تھا جن میں داخل ہونے کے لئے سات سنگین پر پیچ پھاٹک بنے ہوئے تھے۔ ان طبقوں کو دیواروں اور برجوں نے ایک دوسرے سے جدا کر رکھا تھا تاکہ شہر کی آبادی جس کی سرکشی اور شورش پسندی ضرب المثل تھی اور جن کی وفاداری کو زبردست سے زبردست حکمران کی سیاست بھی قابو میں نہ رکھ سکی تھی اسی حیلے اپنی مفسدانہ سرگرمیوں سے باز

رکھی جا سکے۔ ان پانچ طبقوں میں سے ایک طبقہ عیسیوں کی آبادی کے لئے مخصوص تھا۔ دوسرے میں یہودی بستے تھے۔ غروب آفتاب کے بعد کوئی شخص اپنی حدود سے سزائے موت کا مستوجب ہوئے بغیر نہ نکل سکتا تھا۔ ہر پھاٹک سے ایک فراخ اور پختہ شاہراہ سلطنت کے سرحدی شہروں مثلاً ملاجہ، بادجوز، اسطورغہ، تلادیرا، تالیدو، سراغوسہ اور مریڈا کی طرف جاتی تھی۔

قصر خلافت میں جو ہسپانیہ کے وزیگاتھ بادشاہوں کے محل کے موقع پر تعمیر کیا گیا تھا وسعت و رفعت اور استحکام کی کوئی شان نہ تھی جو پائی نہ جاتی ہو۔ شہر کے جن پانچ حصوں کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں ان میں سے ایک غالباً اس قصر کی حدود میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ بالاحصار بڑے بڑے ارکان سلطنت کے سرکاری مکانات، شاہی جیش خاصہ کی بارکیں اور خلیفہ کے بے شمار متوسلوں اور غلاموں کے مکان بھی اس سے متعلق تھے اسی سے ملا ہوا وہ پھاٹک تھا جو دریائے النہر الکبیر کے پل کی سمت میں کھلتا تھا۔ وہ دریا جس نے تاریخ کے کئی دفتر الٹے ہیں اور متعدد شاہی خاندانوں کو تباہی کے گھاٹ اتار کر انقلاب سلطنت کا آئے دن نیا تماشا دیکھا ہے۔ دریا کا پل روضۃ الکبریٰ کے معمارانہ کمال کا سب سے

زیادہ شاندار نمونہ تھا۔ اس کا طول چار سو گز، عرض دس گز اور سطح آب سے اس کی بلندی تیس گز تھی۔ اس کی حفاظت کے لئے انیس برج موجود تھے۔ اس کی تعمیر قیصر آگسٹس کے عہد میں ہوئی تھی۔ آج کے دن بھی یہ پل اچھی حالت میں ہے اور اس لحاظ سے گویا ساٹھ پشتوں کی جنگی اور تجارتی ضرورتیں پوری کرتا چلا آرہا ہے۔

اندلس کی سیر حاصل زمینوں کی لازوال زرخیزی ربع مسکوں کی ہر اقلیم کی لذیذ ترین نعمت کو با فراط پیدا کرنے کی قابلیت رکھتی تھی۔ ضروریات زندگی وہاں برائے نام داموں میں مل جاتی تھیں۔ بازاروں میں ہر قسم کے ماکولات فروخت ہونے کے لئے موجود رہتے تھے اور خوش ذائقہ پھل اور میوے جو مسیحی یورپ کے پایۂ تختوں میں کمیاب بلکہ نایاب تھے قرطبہ کے معمولی سے معمولی شخص کے دسترخوان کو ہر روز میسر آتے تھے۔ غریب سے غریب شخص کے لباس سے بھی راحت و آسائش کے آثار نمایاں تھے۔ پیشہ ور گداگر جو مشرقی تمدن کے دامن کا بد نما دھبہ ہیں قرطبہ کی گلیوں میں کہیں دکھائی نہ دیتے تھے۔ گداگری ذلیل اور معیوب سمجھی جاتی تھی اور حکماً ممنوع قرار دی گئی تھی۔ جو شخص حقیقت میں محتاج اور واجب الامداد تھے ان کے لئے سرکاری خیرات

خانوں کا غریب نواز دروازہ ہر وقت کھلا ہوا تھا اور جن کے لئے اعتیاج صرف کاہلی کا دوسرا نام تھا ان میں ضروری حسنی اور غیر معمولی مستعدی پیدا کرنے کے لئے محکمہ احتساب کے کارپردازوں کا تازیانہ کافی تھا۔

قرطبہ کے مضافات میں جو آبادیاں واقع تھیں ان کی تعداد مدینۃ الزہرا کے شاہی قصر کو چھوڑ کر جو وسعت اور خوبصورتی میں باقی سب پر سبقت رکھتا تھا اکیس تھی۔ گرد و پیش کے دل آویز قدرتی مناظر کی رعایت کو مد نظر رکھتے ہوئے دارالخلافہ کے اطراف کی ان آبادیوں کے نام بھی شاعرانہ تجویز کیے گئے تھے۔ کسی کا نام "وادیٔ جنت" تھا کسی کا "وادیٔ جمال" کسی کا "طریق الورد" کسی کا "حدیقۃ العجائب" اگرچہ یہ سب آبادیاں انتظام کے لحاظ سے قرطبہ کی شہری مرکزیت کے تابع تھیں لیکن باقی ہر ایک اعتبار سے ان میں بجائے خود ایک جداگانہ شہر کی شان نظر آتی تھی اور دکانوں، حماموں، سراؤں، انبار خانوں، منڈیوں اور مسجدوں کی شکل میں مایحتاج اور لوازم عشرت کی قسم سے کوئی سامان ایسا نہ تھا جو ان کی خوشحال اور کثیر التعداد آبادی کے لئے مہیا نہ ہو۔ دو آبادیاں دریا کے مقابل والے کنارے پر واقع تھیں اور باقی قرطبہ کے گرداگرد پھیلی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

سفید چمکتے ہوئے بنگلوں اور نخلستانوں اور زمردیں سبزہ زاروں کا ایک بوقلموں پٹکا ہے جو دار الخلافہ کی کمر میں بندھا ہوا ہے۔

ہر سمت ہی میلوں تک رنگترون کے باغات چلے گئے تھے جن کے کھلتے ہوئے شگوفوں نے ہوا کو دور دور تک مہکا رکھا تھا۔ سڑکوں کے کنارے اور چمنستانوں کی روشوں کے ساتھ ساتھ نہروں کے خرام ناز اور فواروں کی گوہر افشانی نے ایک جان پرور تازگی و حرارت پیدا کر دی تھی۔ بھانت بھانت کے پھول، رنگ رنگ کی کلیاں خوشبو میں لپٹی ہوئی شاخوں میں سے جھانکتی ہوئی دو رویہ درختوں کے جھرمٹوں کا سنگار بنی ہوئی تھیں۔ مکانوں کے آنگنوں کے ستون گلاب کی بیلوں سے ہم آغوش تھے۔ سنگ رخام کے فرش والی سڑکوں پر جن کا جال تمام شہر میں پھیلا ہوا تھا بے ڈھنگی چال والے اونٹوں کی قطاریں یورپ اور افریقہ اور ایشیا کے گوناگوں تجارتی اموال و تحائف سے لدی ہوئی لگاتار گذرتی تھیں۔ بادشاہی قاصد سلطنت کے دور و دراز صوبوں کے گورنروں کے نام شاہی فرامین لے کر اپنے صبا رفتار اندلسی گھوڑوں کو ڈپٹاتے ہوئے جاتے تھے۔ دریائے النہر الکبیر کے شکوہ آفریں پل پر

تاجروں، نوکروں، چاکروں، سپاہیوں، پیادوں، سواروں اور باربرداری کے جانوروں کے ہجوم سے تل دھرنے کو بھی جگہ باقی نہ رہتی تھی اور صبح سے لے کر شام تک اسی گرمیٔ ہنگامہ کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

خلفاء کی عیش پسندی نے ان دس محلوں کی عشرت اندوز تنہائیوں کے اندر جو ان کے پایۂ تخت کے اطراف میں آسمان سے باتیں کرتے ہوئے کھڑے تھے دنیا جہان کی نعمتیں اور لذتیں فراہم کر رکھی تھیں۔ لذاتِ جسمانی کے حصول کا ہر ایک سامان یہاں جمع تھا۔ حسن کرشمہ ساز یہاں پہلوئے شوق میں وہ دل آرام چٹکیاں لیتا تھا جنہوں نے کپری، سبارس اور انطاکیہ کی نازنینی پہ بھی کبھی نیل نہیں ڈالا تھا۔ یہ عشرتستان جن پر عربی صناعی کا ہر ایک کمال ختم تھا ایسی ایسی نظر افروز گلشنوں سے مزین تھے جن میں ایشیا کی چمن بندی اپنی نہایت جانفزاء شکل میں جلوہ گر تھی۔ ہوائی جھروکے جنہیں مجلا سنگ مرمر کے سڈول اور خوشنما ستون سہارے ہوئے تھے دمشقی وضع کے گل بوٹوں سے آراستہ تھے۔ دیواروں کی آرائش میں ہندوستان کے کمخواب و مشجر کی تقلید کی گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ریشم کی زمین ہے جس میں تار زر کے پھول بنے ہوئے ہیں۔ محرابوں اور طاقوں پر

قسطنطنیہ کی جھلملاتی ہوئی میناکاری صرف کی گئی تھی۔ نرالی وضع کے مرمری دریچوں میں سے روشنی ہلکی ہو کر اور چھن چھن کر اندر آتی تھی۔ مشہور شعراء کے قطعات جن میں سے اکثر شراب و شاہد کے لئے وقف تھے ہر کارنس، ہر محراب اور ہر پیل پایہ پر منقوش نظر آتے تھے۔ بے شمار فواروں کا رقص کرتا ہوا پانی اپنے سریلے زیر و بم کے ساتھ جن ظروف میں گرتا تھا وہ ٹھوس چاندی کے بنے ہوئے تھے۔

سامان آرائش عود، صندل، آبنوس اور ہاتھی دانت کا تھا جس کی نزاکت اور نقش کاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ہر قوم کی مہ جمال کنیزیں جو شاعری اور موسیقی میں ید طولیٰ رکھتی تھیں اور جن کی تعلیم و تربیت مشہور اساتذۂ فن کی نگرانی میں ہوئی تھی امیرالمؤمنین کی خدمت گزاری کے لئے موجود تھیں یہ کنیزیں یا تو فرصت کے اوقات میں اپنی شیریں اور حکمت نواز گفتگو سے اس کا دل بہلاتی تھیں یا اپنے میٹھے نغموں اور ساحرانہ اداؤں سے اس کا غم غلط کرتی تھیں۔ بے شمار گورے اور کالے خواجہ سرا جو حسن اور زشت روئی کے مثالی نمائندے تھے یا تو دبے پاؤں محلوں کی کوشکوں کے دھندلکے میں گھومتے پھرتے تھے اور یا وہ جڑاؤ پیش قبض لگائے مرصع ہتھیاروں سے سجے ہوئے حرم سرا کی ممنوعہ دہلیز کی پاسبانی

کرتے نظر آتے تھے۔

باغوں میں مشرقی صناع کی قوت متخیلہ ایک خاص ادا سے کرشمہ سنج بنی ہوئی تھی۔ خیابانوں پر رنگ برنگ کے سنگ ریزوں کا فرش تھا اور ان سنگ ریزوں کو ایسی صنعت اور کاریگری سے جوڑا گیا تھا کہ طرح طرح کے عجیب و غریب بیل بوٹوں کی شکلیں پیدا ہو گئی تھیں۔ جھاڑیوں کو ایسے سلیقہ سے تراشا گیا تھا کہ شہر پناہ کا نمونہ پیش نظر ہو جاتا تھا۔ پتوں اور شاخوں کی ان ہری فصیلوں میں برج بھی تھے، کنگرے بھی تھے اور دمدمے بھی نکلی ہوئی تھیں۔ پانی کے پوشیدہ خزانوں میں سے مقررہ فاصلوں پر فواروں کی بلوریں شاخیں ہوا میں بلند ہوتی تھیں۔ پُر اسرار بھول بھلیاں جن کے پیچ و خم سے کسی واقف کار کی رہنمائی کے بغیر چھٹکارا محال تھا اجنبی اور غیر محتاط سیر کرنے والے کی رہزنی کے لئے اپنا تاریک منہ کھولے کھڑی تھیں۔ منظر میں ایک نئی شان تفاوت پیدا کرنے کے لئے کہیں تو جھیلیں موجود تھیں جن کی صاف و شفاف سطح پر راج ہنس اور سفید پروں والے دوسرے آبی پرندے تیر رہے تھے۔ کہیں مصنوعی کھوہیں تھیں جن کے ٹھنڈے سایہ میں راحت و آرام پرورش پا رہے تھے۔ کہیں سدا بہار بیلوں کے اخضری سائبان سر پر تنے ہوئے تھے۔ کہیں مختلف رنگوں کی خوبصورت پتیوں کے

پودوں کی قطاریں کھڑی تھیں جن کی رنگت پر دور سے قوس قزح کا گمان ہوتا تھا۔ کہیں جادو کے پانی سے سینچے ہوئے وسیع قطعات پھیلے ہوئے تھے جن میں خوشبودار جھاڑیوں کے جھرمٹ اور رنگین گھاس کے تختوں میں ملی ہوئی بوقلموں پھولوں کی کیاریاں اس قرینہ سے تیار کی گئی تھیں کہ پھولوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور خلیفۂ وقت کی مدح و ستائش کے اشعار کی عبارت نمودار ہو گئی تھی۔ الغرض فرش زمین پر منجرکا گویا ایک ایسا تھان کوسوں میں بچھا ہوا تھا جو ایران اور بلجیئم کی کارگاہوں کو خواب میں بھی نصیب نہ ہوا ہو گا۔

قرطبہ کے ان مضافاتی محلوں میں سب سے زیادہ قدیم قصر رصافہ تھا جس کی مشہور چار دیواری میں عبدالرحمٰن اوّل نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ گزارا تھا۔ قصر رصافہ محض تفریح و تفنن ہی کا مقام نہ تھا بلکہ تاریخ میں اسے ایک خاص علمی اہمیت حاصل ہے۔ اوّل اوّل مشرقی کی نباتاتی دنیا کے عجائبات کی پرورش کا آغاز علمی اصولوں پر اسی قصر کے باغات میں ہوا تھا۔ اس غریب الوطن تاجدار کے دل سے اپنے شامی گھر کی عزیز یاد کبھی محو نہ ہوتی تھی اسی وجہ سے اس نے اس محل کا نام اپنے ایک آبائی محل کے نام پر رکھا تھا جو دمشق میں واقع تھا۔

خلفائے اندلس کے دوسرے محلات کو بھی جو نواح قرطبہ میں واقع تھے موقع یا ساخت یا آرائش کی شان خصوصی کے باعث لقب حاصل کرنے کی کوئی نہ کوئی امتیازی وجہ ضرور حاصل تھی۔ ایک محل اپنے بے شمار فواروں کے لئے مشہور تھا ایک میں پھولوں کی فراوانی اور رنگا رنگی کا بے مثال اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک کا نام ان شاندار قدرتی مناظر کی رعایت سے جو خوش نصیب لوگوں ہی کا حصہ ہو سکتے ہیں "مقام محمود" رکھا گیا تھا۔ ایک محل اپنی میناکاری، نقش و نگار اور گوناگوں زیب و زینت کی بدولت "قصر التاج" کے موزوں نام سے موسوم تھا۔

قرطبہ سے تین میل شمال مغرب کی جانب کوہستان مورینیا کے دل افروز دامن میں قصر مدینۃ الزہرا واقع تھا۔ مشرق کی تاریخ اپنی روایات کی رنگینی کے لئے مشہور ہے۔ اس قصر کی تعمیر کا قصہ بھی نہایت دل کش ہے۔ مؤرخین عرب کا بیان ہے کہ عبدالرحمٰن الناصرالدین اللہ کی ایک ذی ثروت حرم کی آخری ساعت جب قریب آئی تو اس خیال سے کہ دنیا میں اس کا آخری کام اسلامی احسان کا کوئی پسندیدہ ترین کارنامہ ہونا چاہیئے اس نے اپنے سرتاج سے خواہش ظاہر کی کہ جس دولت سے آپ کی خسروانہ فیاضی نے مجھے نہال

کیا تھا۔ وہ مسلمان اسیروں کو فدیہ دے کر چھڑانے پر صرف کی جائے۔ خلیفہ نے اپنی نیک نہاد حرم کی مشفقانہ وصیت کی تعمیل میں شمال کی مسیحی حکومتوں کی طرف اپنے قاصد دوڑا دیئے ان حکومتوں کے فرمانروا اس کے حلیف یا باج گزار تھے اور انہوں نے کوئی دقیقہ اس کی مدعا برآری کا اُٹھا نہ رکھا۔ بہت تلاش کی لیکن ایک بھی مسلمان قیدی کسی مسیحی سلطنت کی گرفت میں نہ تھا جسے خلیفہ تاوان دے کر رہا کراتا۔ آخر اس نے ایک اور چہیتی حرم الزہرا کے مشورہ کی بناء پر مرحومہ کے خزانے کو ایک ایسے قصر کی تعمیر میں لگانے کا ارادہ کر لیا جس کا بے مثال تجمل اس کے پر شکوہ عہد کی موزوں ترین یادگار ہو۔ سلطنت کے سالانہ محاصل کا ایک ثلث جو یہودیوں اور مسیحیوں کے خراج اور مال غنیمت کے خمس کو چھوڑ کر بیس لاکھ دینار سے زیادہ ہوتا تھا قصر کی تعمیر کے مصارف کے لئے اس نے اپنی طرف سے زیادہ کیا۔ دس ہزار کاریگر اور اٹھائیس ہزار بار برداری کے جانور روزانہ تعمیر کے کام پر لگائے جاتے تھے۔ عرب مؤرخین نے پوری تفصیل اور نہایت وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ اس محل کی تعمیر میں مسالہ کس قدر صرف ہوا اور کس قیمت کا مسالہ استعمال کیا گیا۔ کاریگروں کی نوعیت کیا تھی اور ان کو مزدوری کتنی دی جاتی تھی۔ اس تفصیل کا مطالعہ اگرچہ پریشان

کن ہے لیکن ساتھ ہی سبق آموز بھی ہے اور اس کی باریکی میں اس حیرت انگیز داستان کی صداقت جھلک رہی ہے جو دوسری صورت میں ہمارے وہم و گمان کی رسائی سے قریب قریب باہر ہوتی۔ عمارت کا نقشہ قسطنطنیہ کے سب سے زیادہ باکمال مہندسوں کی صناعانہ دقت نظر نے تجویز کیا تھا۔ دیواریں پتھر کی تھیں اور ان کی پیمائش ۲۷۰۰×۱۴۰۰ ہاتھ تھی اور ان میں تمام وہ استحکامات موجود تھے جو ایک زبردست قلعہ کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ جامع مسجد کی طرح قصر مدینۃ الزہرا کا مسالہ بھی بڑی حد تک غیر ممالک سے فراہم کیا گیا تھا اور تعمیر کی نگرانی بازنطینی معماروں سے متعلق کی گئی تھی جن کو مدد دینے پر اعلیٰ درجہ کے مقامی صناع مامور تھے۔ خلیفہ کو اس کام سے اس قدر دل بستگی تھی کہ وہ اس کی نگرانی بذات خود کرتا تھا اسی شغف و انہماک کے عالم میں ایک مرتبہ جب اس کے مسلسل تین جمعے قضا ہو گئے تو قاضیٔ قرطبہ منذر نے بھرے مجمع میں اسے سرزنش کی کہ کیوں اس نے خدا کے فرض کو چھوڑ کر لہو و لعب سے دل لگایا۔

نیو میڈیا، یونان اور اندلس کی معادن سنگ نے مدینۃ الزہرا کے لئے نفیس سے نفیس سنگ مرمر بہم پہنچائے۔

ناربان، ٹراگونا، یوٹیکا اور کارتھیج کے بت کدوں کے کھنڈروں سے خوشنما رومانی الاصل پیل پائے دستیاب ہوئے۔ بازنطینی شہنشاہ نے اپنے دوست کے لئے متعدد ستونوں کا قیمتی تحفہ روانہ کیا جن کی خوبصورت سبز اور گلابی رنگت نے دیکھنے والے کے دلوں کو لبھا لیا۔ مدینۃ الزہرا تین بڑے طبقوں میں منقسم تھا۔ اوّل تو پہاڑی کی ڈھلوان پر محل کی سربفلک عمارت تھی جس میں حریم خلافت واقع تھا۔ حرم سرائے میں چھ ہزار تین سو بیبیاں اپنے غلاموں اور ملازموں سمیت رہتی تھیں جن کی مجموعی تعداد سترہ ہزار تھی۔

طبقۂ پایئں میں شہر کے رخ کی جانب جیش خاصہ، خواجہ سراؤں اور خواصان دربار کی اقامت کے لئے چار سو مکانات کے بعد باغات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو نفیس ترین اشجار مثمر و غیر مثمر کے جھرمٹوں سے آراستہ تھے اور جن کی زینت کو مصنوعی آبشاروں اور سنہری مچھلیوں سے بھرے ہوئے صاف و شفاف چشموں نے دوبالا کر رکھا تھا۔ سبزہ و گل کے اس فردوس کی چار دیواری حدود کے اندر مقامی اور غیر ملکی نباتات کی ہر صنف جس سے اندلس کے ماہران فن واقف تھے موجود تھی۔ پیچ و خم کھاتی ہوئی پختہ روشوں کے وسیع لہریا فرش میں طرح طرح

کے رنگین سنگ پارے جڑے ہوئے تھے اور ان کے دونوں
طرف شمشاد اور سرو ناز اپنی بہار دکھا رہے تھے با بوقلموں
سدا بہار جھاڑیاں نئی نئی وضع کی تراش و خراش کے ساتھ
باغبان کے سلیقہ کی شہادت دے رہی تھیں۔ گرمی کے موسم
میں منطقہ حارہ کی بڑی تمازت بکھیرنے والے آفتاب سے
پناہ لینے کے لئے باغ میں چہل قدمی کرنے والوں کو پُر
لطف کوشک اور سایہ دار منڈوے قیلولہ کی دعوت دینے
کے لئے موجود تھے۔ آب رسانی میں مہندسوں کی قوت ایجاد
نے حیرت انگیز مخترعانہ کمالات دکھائے تھے۔ کہیں اُبلتے
ہوئے چشموں کی پاکیزہ سطح پر ہزار ہا فواروں کی نور افشاں
سربلندی نگاہ کے لئے جادو کے ڈورے بٹ رہی تھی،
کہیں ننھی ننھی مصنوعی ندیاں دریاؤں کی قدرتی روانیوں کا
منہ چڑاتی ہوئی بہہ رہی تھیں جن کی معاون نالیاں سنگ مرمر
کے زینوں کے کٹہروں کے پہلوؤں میں کھدی ہوئی تھیں۔
کہیں پری پیکر سرد خانے بنے ہوئے تھے جن کی منقش بلوریں
چھتوں پر فواروں کی گھومتی ہوئی ٹونٹیوں میں سے ننھی ننھی
پھوار گر کر فانوس خیال کا نقشہ کھینچ دیتی تھی، کہیں جوش و
خروش سے بہتے ہوئے آبشار دل آویز بلندیوں سے گر رہے
تھے جن کی لاجوردی گہرائیوں میں قوس قزح کی رنگیلی پری ناچتی

ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ بعض حوض صنعتِ سنگ تراشی کے کمال کا نمونہ تھے اور ان میں دو کا ذکر مؤرخین نے نہایت خصوصیت سے کیا ہے۔ بڑا حوض پیتل کا تھا جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ یہ حوض قسطنطنیہ سے آیا تھا اور اس پر اُبھردیں کام میں دل فریب انسانی مورتیں بنی ہوئی تھیں دوسرے کا ظرف جسے شامی کاریگروں نے تیار کیا تھا۔ سبز سنگ مرمر کا تھا اور اس کے کناروں پر سونے میں ڈھلے ہوئے اور جواہرات سے جگمگاتے ہوئے بارہ عجیب الخلقت جانوروں اور پرندوں کی شبیہیں تھیں۔ ان عجیب و غریب وحوش و طیور کے منہ سے پانی کے فوارے چھوٹ چھوٹ کر ظرف میں گرتے تھے۔

قصر مدینۃ الزہرا کے صدر دروازے پر اس مہ جمال خاتون کی مورت مرمری صنعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نصب تھی جس کے مشورہ نے یہ طلسمی محل عالم مثال سے لا کھڑا کیا تھا اور جس کا نام اس کی وجہ تسمیہ تھا۔

قصر کا وہ حصہ جس کی تفصیل کے شوق میں عرب مؤرخین کا قلم سر کے بل چلتا ہے اس کا وسطی ایوان تھا جس کی گنبد نما عمارت سفید سنگ مرمر کے ایک بلند چبوترہ پر کھڑی ہوئی اندر اور باہر سے اپنے مالک کی لیے انداز دولت

اور اپنے صانع کی لطافت مذاق پر گواہ تھی۔ اس ایوان کی شکل مدور تھی۔ اس کے گنبد کو مرمر اور بلور کے سڈول ستون سہارے ہوئے تھے جن کے پایوں میں موتیوں اور یاقوتوں کی پچی کاری کی گئی تھی گنبد اور دیواریں جھلکتے ہوئے سنگ سلیمانی کی تھیں چھت میں سونے اور چاندی کی اینٹیں لگائی گئی تھیں جن کی سنہری اور روپہلی قطاریں یکے بعد دیگرے جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ محرابوں کے گوشوں اور حاشیوں پر جو کتابے منقوش تھے ان میں بازلطینی مینا کاری کی لازوال افشاں کا رنگ چمک رہا تھا۔ دروازے عود و صندل کے تھے جن میں ہاتھی دانت اور آبنوس اور طلائے احمر کی نقش کاری کے ساتھ بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ گنبد کے نیچے وسط ایوان میں سنگ سماق کا ایک ظرف جسے ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھا جا سکتا تھا پارہ سے بھرا ہوا رکھا تھا کسی خاص حکمت سے غالباً آئینوں کے استعمال سے آفتاب کی شعاعیں اس ظرف میں جمع کر کے ڈالی جاتی تھیں ظرف کسی چھپی ہوئی کل کے زور سے تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگتا تھا اور ہر طرف نور کے برق وش لمعات پھیلنے لگتے تھے جن کی ناقابل برداشت تابانی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرتی ہوئی دول خارجہ کے سفرا کو مرعوب و مبہوت کر

دیتی تھی اور ان ہی پر ہیبت بٹھانے کے لئے اس حکیمانہ اختراع کا بصیرت افروز جلوہ رہ رہ کر دکھایا جاتا تھا۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو ایک باجبروت تاجدار کے ایوان کی بجائے اس قسم کا نظارہ کسی تھیٹر یا تماشا گاہ کی اسٹیج کے لئے زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔

تاریخ خلافت میں قصر مدینۃ الزہرا کا یہ ایوان متعدد بڑی بڑی تمکنت افروز رسموں اور حیرت انگیز واقعات کا منظر بنا رہا ہے۔ اسی ایوان میں سلطنت کے ولی عہد کی ولی عہدی کے اعلان عام کی رسم انجام پاتی تھی۔ یہیں تاجدار وقت کی وفات پر شہزادے اور امراء اور حکام سلطنت اور صوبجات کے گورنر نئے فرمانروا کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ یہیں یورپ اور افریقہ اور ایشیا کی سلطنتوں کے سفیروں کو اس شکوہ و تجمل کے ساتھ باریابی کا شرف بخشا جاتا تھا۔ جس کے مقابلہ میں قسطنطنیہ کے رسوم اور بغداد کے خسروشاں کی مزعومہ عظمت کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ اسی جھلملاتے اور جگمگاتے ہوئے گنبد کے نیچے مختلف ممالک کے بادشاہوں نے آکر بڑی منت کے ساتھ اس اندلسی فرمانروا کی چشم التفات کا ایک گوشہ اپنی طرف منعطف کرایا تھا جو ان کی قوم

اور ان کے مذہب کا موروثی دشمن تھا۔ ان تقریبوں پر دربارِ قرطبہ کی شان و شوکت قابل دید ہوتی تھی۔ ایوان مذکور کی زیب و زینت کو جو پہلے ہی کچھ کم نہ تھی ریشمی قالینوں اور زربفت کے پردوں سے دوبالا کر دیا جاتا تھا۔ خلیفہ ایک جواہر نگار تخت پر جس میں الماس، یاقوت، رمانی اور زمرد اپنی آب و تاب سے نگاہوں کو خیرہ کئے دیتے تھے، اپنے خاندان کے حلقہ میں جلوہ گر ہوتا تھا۔ امرائے دربار اور ارکان سلطنت خلعت ہائے فاخرہ پہنے اپنے اپنے مقررہ مقام پر حاضر ہوتے تھے۔ ایوان کے گرد و پیش جیش خاصہ کی صفیں آراستہ ہوتی تھیں جس کا نادر ساز و سامان دنیا کی کسی شاہی گارڈ کی فوج کو میسر نہ تھا۔ خواجہ سراؤں اور پیش خدمتوں کا سفید براق لباس عظمت و جلال کے اس زرنگار مرقع کے حسن کو بڑھا رہا تھا جسے دیکھ دیکھ کر کوہستان پرینیز اور جرمن جنگلوں کے وحشی حیران تھے اور دل میں کہتے تھے کہ ان نفرت انگیز کافروں کا تمدن بھی عجیب، ہوش ربا ہے۔ اور ان کی سطوت و جبروت اور رعب و جلال میں بلا کی شان ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔

مدینۃ الزہرا کی مسجد بھی شان و شوکت میں محل سے ملتی جلتی تھی اور ایک لحاظ سے اس کا آرائشی حسن دار الخلافہ

کی جامع مسجد پر بھی فوقیت لے گیا تھا جس کے نمونے پر
اس کی عمارت بنائی گئی تھی۔ اس کے پہلوؤں میں پانچ
درجے تھے اور اس کی خوبی و خوشنمائی میں ایشیائی کاریگروں
نے اپنا پورا زور کمال صرف کر دیا تھا۔ اس کی محراب اور
منبر میں مشرقی صنعت اور لطافت مذاق کے حیران کن
عجائبات کرشمہ ریز تھے۔ مجلا پتھر کا ایک دس ہاتھ مربع
اور چالیس ہاتھ اونچا مینار جو ابھروں گل کاری سے مزین تھا
اس شاندار معبد کے سر پر آسمان کی فضاؤں سے ہم کلام
تھا۔ صحن میں گیروے رنگ کے سنگ مرمر کا فرش تھا اور
ایک نہایت نفیس فوارہ دار حوض جس پر ملمع چڑھا ہوا تھا
عبادت گزاروں کے استعمال کے لئے پانی سے لبالب بھرا رہتا
تھا۔

مدینۃ الزہرا غیر محسوس طور پر ترقی کرتے کرتے ایک شاہی
محل سے بتدریج ایک چھوٹا سا شہر ہو گیا۔ محل کے گرداگرد
امرائے دربار، تجار اور افسران فوج کے پر تکلف مکان
بن گئے۔ سڑکوں کے دونوں طرف درخت نصب ہو گئے
جن کی شاخوں نے ہم آغوش ہو کر راہ رو لوگوں کے لئے
پتوں کا ایک مسلسل زمردیں سائبان تان دیا ایک بھی مکان
ایسا نظر نہ آتا تھا جو باغوں کی فضاؤں میں چھپا ہوا نہ ہو۔ جن

میں بیرونی ملکوں کے نایاب پودوں کا ہجوم اور آبِ رواں کی فراوانی روح کی آسائش کا بہترین سامان تھی۔ پہاڑ کے پہلوؤں تک کو ان سبز خود رو جھاڑیوں سے جو ہمیشہ ان پر اگی رہتی تھیں معرا کر دیا گیا تھا اور ان کی بجائے انجیروں اور باداموں کے درخت بو دیئے گئے تھے۔ کچھ فاصلہ پہ وسیع قطعات میں گلاب کی کاشت کی گئی تھی جس سے ہوا مہکی رہتی تھی اور اسی مناسبت سے اس نواح کا نام "جبل الوردات" پڑ گیا تھا۔

ان حماموں کے علاوہ جو حرم سرا اور اس کے متوسلین کے استعمال کے لئے مخصوص تھے مدینتہ الزہرا کی آبادی کی جسمانی طہارت کے لیے تین سو حمام موجود تھے۔ خلفاء کا قیام چونکہ زیادہ تر مدینتہ الزہرا ہی میں رہتا تھا اس لئے یہ مقام شعر و ادب، دانش و حکمت اور تمام فنون لطیفہ کا مرکز بن گیا۔ بڑے بڑے دار الحکمت اور علمی مجالس اس کی حدود میں قائم ہو گئیں۔ دربار اندلس تاریخ میں اپنے علمی مباحثوں اور ادبی مناظروں کے لئے مشہور ہے۔ اہل علم و فضل کے یہ مناظرے اب خلیفہ اور اس کے ارکان دولت کے سامنے خلافت کے نئے علمی مرکز کی مجلسوں میں ہونا شروع ہو گئے تھے۔

مدینتہ الزہرا کی تعمیر میں چالیس سال کا زمانہ صرف ہوا۔ پچیس سال تک تو عبدالرحمٰن الناصر اسے بنواتا رہا اور پندرہ سال میں اس کے بیٹے الحکم نے اس کی تکمیل کی۔ چاندی سونے کے موجودہ بازاری نرخوں کے لحاظ سے اس کی مجموعی لاگت پچاس کروڑ روپیہ قرار پاتی ہے۔ ہر قوم کے سیاحوں اور مبصروں کی متفقہ شہادت تاریخ میں درج ہے کہ موقع کی خوبصورتی، شاہانہ شان و شوکت اور عمارتی حسن میں مدینتہ الزہرا کا محل اور شہر دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

قرطبہ آج کل ایک بھائیں بھائیں کرتا ہوا ویرانہ ہے اس کی اس اجڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر مشکل سے تصور ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں دولت و اقبال کا آفتاب تجلی ریز رہ چکا ہے اس کے مضافات کی گنجان آبادی کے علاوہ دور تک صناعوں، کاریگروں اور پیشہ وروں کی بستیاں پھیلی ہوئی چلی گئی تھیں جن کے لئے دارالخلافہ کی تجارت کی ہمہ گیری بڑے نفع انگیز مشاغل بہم پہنچاتی تھی۔ پانچ ہزار پن چکیاں دریائے النہر الکبیر کی تیز رفتار موجوں کے سہارے قائم تھیں۔ غیر قوموں کے ساتھ اہل اندلس کے وسیع تجارتی تعلقات کی بدولت ملک میں اقصائے عالم سے روپیہ کھنچا چلا آتا تھا جس کی فراوانی نے تاجروں اور کارخانہ داروں کی

اولوالعزمیوں کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ ہر بڑے شہر میں صنعت و حرفت کے کارخانے وسیع پیمانے پر کھل گئے تھے۔ ہر شہر میں مساجد موجود تھیں۔ جن کے امام فرائض امامت کی انجام دہی کے علاوہ قضاۃ کے منصب پر بھی مامور تھے اور دارالخلافہ کے حکام کو اپنی کارگزاری کی نہایت باقاعدگی کے ساتھ اطلاعات بھیجا کرتے تھے۔

علوم و فنون کی سرپرستی میں عبدالرحمٰن الناصر اپنے فیاض سے فیاض اسلاف میں کسی سے کسی طرح کم نہ تھا۔ بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی میں وہ خود کامل دستگاہ رکھتا تھا اور عرب اس ملکہ کی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ اس کی قدر دانی اور بذل و ایثار کی شہرت دنیا کے ہر گوشہ سے مشاہیر عصر اور ارباب کمال کو قرطبہ میں کھینچ لائی۔ دارالخلافہ میں جا بجا مکتب، مدرسے، دارالعلوم اور بیت الحکمت قائم ہو گئے تھے۔ علم طب کا آفتاب ترقی کے نصف النہار پر پہنچ گیا۔ قرطبہ کے یہودی طبیب اپنی معلومات کی وسعت اور تنوع کے لحاظ سے دنیا میں بے مثال سمجھے جاتے تھے۔ اکثر اطبا حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے کہ یہ ان کے کمالات کا واجبی اعتراف تھا لیکن وہ ایسے مخیر واقع ہوئے تھے کہ بایں ہمہ جلالت قدر ان کا دروازہ ہر بازو

مساکین کے لیئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا اور نادار و ناتواں مریضوں کا علاج وہ بالکل مفت کرتے تھے۔

علوم ہیئت و کیمیا نے جو بغداد کے مشاہدات اور دمشق و قاہرہ کے تجربات پر مبنی تھے ایسی ترقی کی جو دنیا میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ شاہی قصر میں، شاہزادوں کے محلوں میں، امراء کے دولت کدوں میں اور علماء کے گھروں میں ہر وقت علم کا چرچا تھا اور ان مسائل کی چھان بین کے لیئے جن سے ہر شخص کو دلچسپی تھی سبھی طرح کے وسائل اختیار کیئے جاتے تھے۔ کہیں دقیق علمی تحقیقاتیں ہو رہی تھیں، کہیں خطبوں اور تقریروں کے ذریعہ سے طالبان فن کی معلومات میں اضافہ کیا جا رہا تھا۔ کہیں شعر و شاعری کا بازار گرم تھا۔ ارباب سخن بدیہہ گوئی کا اعجاز دکھاتے تھے اور ادیبانہ مسابقت کے لیئے مشاعرے ترتیب دیئے جاتے تھے۔ علم کی اس بے قیاس دولت سے مردوں ہی کی جیبیں بھری ہوئی نہیں تھیں عورتوں کا دامن بھی اس کے موتیوں سے لدا ہوا تھا۔ علم کی ہر سود مند اور آرائشی صنف کی تحصیل میں ہر پیشہ اور ہر طبقہ کے مرد و زن یکساں سرگرم نظر آتے تھے۔

جب جوانی کی دوپہر ڈھل گئی اور پیرانہ سری کی حسرت

افزا ناتوانیوں نے عبدالرحمٰن الناصر الدین اللہ کی شام زندگی کا خمیر ظلمت اٹھانا شروع کیا تو اس نے عنان حکومت اپنے ولی عہد الحکم کو سونپ دی۔ دربار کی عیش نواز زندگی کو چھوڑ کر جس کی نمود محض بے بود تھی اس نے ایک زاہد مرتاض ابوایوب نامی کی صحبت اختیار کی اور باقی ایام نماز روزہ، توبہ و استغفار اور صدقہ و خیرات میں بسر کیے۔

جب اس جلیل القدر تاجدار کا انتقال ہوا تو اس کے روزنامچہ میں جو اس کے خفیہ سے خفیہ خیالات کا عمر بھر پردہ دار رہا تھا حکیمانہ جامعیت سے بھری ہوئی ایک عبارت دیکھی گئی جس میں زندگی کی ناکامیوں اور انسانی عظمت کی بے ثباتیوں کی تصویر یوں کھینچی گئی تھی :۔

"میں نے پچاس سال تک حکومت کی۔ میرا عہد امن و امان اور جاہ و جلال کا عہد تھا۔ میری رعایا مجھے عزیز رکھتی تھی، میرے دشمن مجھ سے ڈرتے تھے۔ میرے حلیف میرا ادب کرتے تھے۔ روئے زمین کے بڑے بڑے تاجدار میری دوستی کے آرزو مند تھے۔ میری کوئی خواہش نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔ میری کوئی تمنا نہ تھی جو انسان کے دل میں پیدا ہو سکتی ہو اور وہ بر نہ آئی ہو۔ مجھے شہرت بھی حاصل

ہوئی مجھے اقتدار بھی نصیب ہوا میں نے عیش و عشرت کے مزے بھی لوٹے لیکن اپنی طویل عمر پر جب میں نظر ڈالتا ہوں تو فقط چودہ دن ایسے نکلتے ہیں جنہیں میں کامل راحت اور پوری خوشی کے دن کہہ سکتا ہوں۔

تعریف کا سزاوار وہی الہ العالمین ہے جس کا جلال ازلی اور حسن کی قدرت ابدی ہے وہی ہمارا معبود برحق ہے اور بجز اس کے اور کوئی خدا نہیں۔

اموی تاجداروں کی علوم نوازی

امیر المؤمنین عبدالرحمٰن الناصر الدین اللہ (عبدالرحمٰن ثالث) نے اپنے عہد جہانبانی میں اندلس کو جس تہذیب و تمدن کے فیوض سے مالا مال کیا اور تعمیر و ترقی کے جو حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے ان کا اندازہ اس کیفیت سے بخوبی ہو سکتا ہے جو اندلس اور اس کے دارِسلطنت قرطبہ کے متعلق گزشتہ صفحات میں درج کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ان حالات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس طرح ہندوستان میں مغل تاجداروں کا عہد سلطنت علماء و شعراء اور ارباب کمال کے لئے اس زمانے کی سب سے اچھی جائے پناہ تھی جو انہیں سکون و راحت کی زندگی مہیا کرتی تھی اسی طرح اندلس میں اموی

جہانداروں کا دور فرمانروائی اہل کمال اور علماء و فضلا کے لئے اس وقت کا بہترین ملجا و ماوی تھا جس سے ان کو اطمینان و آسائش کے خاطر خواہ وسائل حاصل ہوتے تھے یہی وجہ تھی کہ عبدالرحمن الناصر کی قدر دانی اور علوم نوازی کا شہرہ سن کر دور دراز ملکوں کے ارباب کمال قرطبہ میں جمع ہو گئے تھے لیکن علوم و فنون کی سرپرستی اور علما و مشاہیر کی قدردانی کا یہ سلسلہ عبدالرحمن الناصر ہی کے ذوق سلیم تک محدود نہ تھا بلکہ اس کے بعد اس کے بیٹے الحکم کی بلند حوصلگیوں سے اس میں اور بھی حیرت انگیز اضافہ ہوا اور اندلس کو ایک مرکز علوم فنون کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

الحکم المستنصر باللہ اپنے باپ عبدالرحمن الناصر کے بعد رمضان ۳۵۰ھ (مطابق اکتوبر ۹۶۱ء) میں اندلس کے تخت خلافت پر بیٹھا اگرچہ اس نے عبدالرحمن کی وفات کے چند سال پہلے ہی سے عملی طور پر سلطنت کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا مگر صحیح معنوں میں حکومت کی ذمہ داریاں اس پر تخت نشین ہونے کے بعد عاید ہوئیں۔ خلیفہ الحکم انصاف پسندی اور دانشمندی میں دور دور مشہور تھا چنانچہ مشہور مورخ ابن خلدون کا بیان ہے کہ خلیفہ الحکم ثانی کو علوم ادب و حکمت سے بہت شغف تھا اور اہل علوم کو

بہت کچھ انعام و اکرام دیا کرتا تھا اگرچہ اس خاندان کے
دیگر خلفاء بھی علم دوست تھے اور کتابیں جمع کرنے کے
عادی تھے مگر جو کتب خانہ اس نے جمع کیا اس کی نظیر نہیں
ملتی۔ اس کا خیال تھا کہ علم کی جس قدر اشاعت کی جائے
کم ہے چنانچہ اس نے دارالسلطنت میں ستائیس مدرسے
ایسے قائم کئے تھے جہاں غریبوں کے لڑکے مفت تعلیم
حاصل کیا کرتے تھے اور قرطبہ کا دارالعلوم اس زمانے میں
قاہرہ کے الازہر اور بغداد کے مدرسہ نظامیہ سے کسی طرح
بھی کم نہ تھا۔ ۲۔ صفر ۳۶۶ھ مطابق یکم اکتوبر ۹۷۶ء کو
کچھ کم سولہ برس کی حکومت کے بعد الحکم ثانی نے انتقال کیا
علامہ شبلی نعمانی اپنے مقالات میں لکھتے ہیں کہ الحکم کے بعد
اس کا جانشین ہشام ثانی اگرچہ فلسفہ کا دشمن نکلا اور اس کے
بعد ایک مدت تک کسی نے فلسفہ کی سرپرستی نہ کی لیکن حکم
نے فلسفہ دانوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا تھا جس کا سلسلہ
اخیر زمانے تک برابر باقی رہا۔ احمد اور عمر دو حقیقی بھائی
۳۳۰ھ میں تحصیل علم کے بعد بغداد گئے اور ۳۵۱ھ میں
یعنی الحکم کی تخت نشینی کے ایک سال بعد وہاں سے
واپس ہوئے۔ حکم نے دونوں کو اپنے خاص درباریوں
میں داخل کیا۔ اسی طرح مشہور فاضل محمد بن عبدون الجبلی نے

بھی اسی غرض سے ۳۴۷ھ میں ممالک مشرقیہ کا سفر کیا اور ابو سلیمان محمد بن ظاہر بن سیستانی سے جو اس زمانے کا سب سے بڑا منطق دان تھا منطق کی تحصیل کی۔ وہ ۳۵۱ھ میں اندلس کو واپس آیا اور حکم نے اس کو طبابت کی خدمت سپرد کی۔

حکم کے دربار میں اور بھی بہت سے فلسفہ دان تھے جن میں سے احمد بن حکم بن حفصون اور ابو بکر احمد بن جابر خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے خود اور بالواسطہ در واسطہ ان کے شاگردوں نے فلسفہ دانوں کا ایک متقن خاندان قائم کر دیا یہاں تک کہ ابو عبداللہ بن الکتانی نے جس نے ۴۲۰ھ میں انتقال کیا جب منطق کی تکمیل کرنا چاہی تو محمد بن عبدون جبلی کے علاوہ فلسفہ دانوں کی ایک جماعت کثیر جن میں عمر بن یونس، احمد بن حکم، ابو عبداللہ بن ابراہیم القاضی، ابو عبداللہ محمد بن مسعود، محمد بن میمون، ابو القاسم بن نجم، سعید بن فتحون، ابو الحارث اسقف اور ابو مرین بجانی ایسے نادر روزگار دانشور شامل تھے موجود تھی اور ابو عبداللہ نے ان سب کی شاگردی کا شرف حاصل کیا اور ان سے علمی فیض اٹھایا۔

ایک خاص واقعہ جو اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر

ہے یہ ہے کہ خلیفہ الحکم نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہود و نصاریٰ کی بھی سرپرستی کی۔ اس نے یہود و نصاریٰ کے بھی اکثر علماء کو دربار میں جگہ دی اور انہیں اس بلند مرتبہ تک پہنچایا کہ وہ اپنے مذہبی علوم میں بغداد کے دست نگر نہ رہے۔ ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ حکم کے زمانے تک اسپین کے یہودی اپنے مذہبی رسوم اور فقہی مسائل میں بغداد کے یہود کے محتاج تھے اور وہیں سے فتوے منگواتے تھے لیکن خلیفہ حکم نے حسدای بن اسحاق کو جو ایک نامور یہودی عالم تھا دربار میں داخل کیا اور مال و دولت سے مالا مال کر دیا اس نے مشرقی ممالک سے تمام مذہبی تاریخیں زر خطیر صرف کر کے منگوائیں اور اس وقت سے اندلس کے یہودی بغداد سے بے نیاز ہو گئے۔ حکم کے طرز عمل نے تعلیم کے دائرہ کو نہایت وسیع کر دیا یعنی مسلمان یہود و نصاریٰ سب میں فلسفہ و معقولات کی تعلیم پھیل گئی۔ ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان فرقوں میں باہمی علمی تعلقات قائم ہو گئے۔ یہود و نصاریٰ پہلے بھی مسلمان کی شاگردی سے عار نہ رکھتے تھے لیکن اب مسلمانوں کو بھی غیر مذہب والوں کی شاگردی سے عار نہ رہی بہت سے نامور علمائے اسلام کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم طب میں عیسائی علماء کے شاگرد تھے۔

ان باتوں سے وسعت علمی کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ فلسفہ کو ایک محفوظ جائے پناہ مل گئی کیونکہ فلسفہ کی تعلیم پر جو زیر بھی عائد ہوئی تھی وہ مسلمانوں تک محدود تھی۔ عیسائی اور یہودیوں سے کوئی تعرض نہ کر سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکم کے بعد جب فلسفہ کا کوئی سرپرست نہ رہا تو بھی کوئی فلسفہ سے تعرض نہیں کرتا تھا۔ حکم کے بعد کئی صدیوں تک فلسفہ شاہانہ عنایات سے محروم رہا یہاں تک کہ موحدین کی سلطنت قائم ہوئی۔

یہ سلطنت محمد بن تومرت نے قائم کی تھی جو امام غزالی کا شاگرد اور بڑا عالم تھا۔ اشعری مذہب میں امام غزالیؒ کی وجہ سے معقولات کا کسی قدر رنگ آگیا تھا اس لئے فلسفہ کے ساتھ کوئی تعصب باقی نہ رہا۔ عبدالمومن نے جو اس سلسلہ کا سب سے پہلا بادشاہ تھا۔ علوم و فنون پر شاہانہ حوصلہ سے توجہ کی اور عبدالملک بن زہر کو جو اس زمانے کا بہت بڑا عالم تھا اپنے خاص مقربین میں داخل کیا۔ عبدالمومن کے بعد اس کے جانشین یوسف بن عبدالمومن نے جو ۵۵۸ھ میں تخت نشین ہوا حکم اور مامون الرشید کے زمانے کی یاد تازہ کر دی۔ وہ خود بہت بڑا عالم تھا اور علوم عربیہ میں کوئی شخص اس کا ہمسر نہ تھا۔ صحیح بخاری اسے زبانی یاد تھی اور فقہ

میں بھی بہت اچھی مہارت رکھتا تھا۔ ان علوم سے فارغ ہوکر اس نے فلسفہ پر توجہ کی۔ فلسفہ کی تصانیف دور دور سے منگوائیں اور ابن طفیل کو جو فلسفہ میں بو علی سینا کا ہمسر تھا ندیم خاص مقرر کر کے اس خدمت پر مامور کیا کہ تمام اطراف و اکناف سے علماء اور اہل فن طلب کئے جائیں اور ان کو علمی خدمات دی جائیں چنانچہ ابن طفیل نے آئمہ فن کی ایک بڑی جماعت وہاں جمع کر دی اور ان سب کو مختلف قسم کی علمی خدمات سپرد کی گئیں۔

اندلس میں فلسفہ عرب کو مشکل دو سو برس کا زمانہ گزرا ہوگا کہ یکایک اس کی آئندہ ترقی میں مذہبی تعصب، ملکی انقلابات اور غیر ممالک کے حملوں سے سخت رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ خلیفہ الحکم ثانی کو یہ عزت نصیب ہوئی کہ دسویں صدی عیسوی میں وہ مشہور و معروف سلسلۂ تعلیم و تعلم اس کی ذات سے جاری رہا جس نے یورپ کے مسیحیوں پر ایسا اثر ڈالا کہ آج تک تاریخ تمدن میں اس کا بڑا مرتبہ سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس خلیفہ کے زمانے میں اندلس نے ایک عظیم الشان بازار کی شکل اختیار کر لی تھی جہاں مختلف ممالک کی علمی تصانیف لائی جاتیں اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں۔ جو کتابیں اندلس اور شام میں لکھی جاتی تھیں وہ مشرقی

میں مشہور ہونے سے پہلے اندلس میں مشہور ہو جایا کرتی تھیں۔ خلیفہ الحکم نے ابو الفرج اصفہانی کو ایک ہزار دینار زر خالص محض اس لئے روانہ کئے تھے کہ اس کی شہرۂ آفاق کتاب الاغانی کا پہلا نسخہ حاصل کیا جائے اور یہ حقیقت ہے کہ اس کتاب کو قبل اس کے کہ عراق میں کوئی جانے اندلس میں لوگوں نے پڑھ لیا تھا۔ قاہرہ، بغداد، دمشق اور اسکندریہ میں خاص خاص لوگ مقرر تھے جن کا کام یہ تھا کہ قدیم و جدید علوم پر جو کتابیں وہاں لکھی جائیں وہ جس قیمت پر بھی میسر آئیں بہم پہنچائی جائیں۔

الغرض خلیفہ الحکم ثانی نے اندلس کو تمام دنیا کے علوم و فنون سے معمور کر دیا اس کا محل بالکل ایک کارخانہ معلوم ہوتا تھا جہاں سوائے اس کے کہ کہیں کتابیں نقل کی جا رہی ہیں۔ کہیں تراجم ہو رہے ہیں اور کہیں ان کی جلد بندی ہو رہی ہے دیکھنے والے کو اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اس کے کتب خانہ کی فہرست ہی پوری چوالیس جلدوں پر مشتمل تھی جس میں کتابوں کے نام کے سوا اور کچھ درج نہیں تھا بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کتب خانہ کی کتابوں کی تعداد چار لاکھ سے کم نہ تھی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں کم از کم چھ مہینے کی مدت صرف ہوتی

تھی کہ خود الحکم انساب و سیر کے علوم میں کامل تجربہ رکھتا تھا
اور ایسی کوئی کتاب مشکل ہی سے مل سکتی تھی جس کو اس
نے خود نہ پڑھا ہو۔ اس کا معمول تھا کہ پڑھنے کے بعد
کتاب کے ابتدائی خالی ورق پر مصنف کا نام، کنیت،
نسب اور اس کا خاندان، قبیلہ، تاریخ ولادت و تاریخ
وفات اور وہ واقعات جو اس کے متعلق مشہور ہوا کرتے
تھے لکھ دیا کرتا تھا۔ وہ خود اپنا وقت ان علماء و فضلاء کے
ساتھ جو تمام عالم اسلامی سے آآ کر اس کے دربار میں جمع
ہوتے تھے ان ہی مضامین پر گفتگو کرنے میں صرف کیا کرتا
تھا اس زمانہ میں اندلس کا خراج پانچ کروڑ سے زائد تھا لیکن یہ
رقم بھی خلیفہ الحکم کے علمی شوق کی تکمیل کے لئے کفایت
نہیں کرتی تھی۔ نفح الطیب کے مصنف علامہ مقری کا
بیان ہے کہ خلیفہ تمام ممالک اور اطراف سے کتابیں بہم
پہنچاتا تھا۔ یہاں تک کہ شاہی خزانہ ان مصارف کے لئے
تنگ ہونے لگا۔ الحکم کے کتب خانہ کی وسعت کا اندازہ
اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ صرف عربی دیوانوں کے
ناموں کی فہرست اسی ۸۰ صفحات پر مشتمل تھی۔

اندلس کے امراء کو خلیفہ حکم کی تخت نشینی کے پہلے
ہی سے علم و حکمت کا شوق شروع ہو گیا تھا جس کی وجہ

کچھ تو ان کے ملک کی عمدہ آب و ہوا کا اثر تھا اور کچھ یہودیوں اور عیسائیوں سے ربط و ضبط پیدا ہونے کا نتیجہ تھا۔ افسوس ہے کہ آج اندلس کی آب و ہوا کا اثر بالکل ہی جداگانہ نظر آتا ہے اور جہاں اس زمانے میں علوم کے چرچے تھے وہاں آج جہالت کی تاریکی نظر آرہی ہے مگر شاید اس کا باعث یہ ہے کہ اہل عرب اب وہاں نہیں ہیں بلکہ ان کی بجائے انہی لوگوں کی اولاد ہے جو اہل عرب سے پہلے اندلس کی خستہ حالی کا باعث تھے ورنہ مسلمانوں نے اس ملک کو عروج و کمال کی جس انتہا تک پہنچایا تھا اس کا مٹ جانا آسان نہ تھا۔ خلیفہ الحکم کی کوششیں جن کے بار آور ہونے کے لئے زمانہ بالکل تیار اور لوگوں کی طبائع بالکل آمادہ تھیں۔ ازمنہ وسطیٰ کی ایک عظیم الشان علمی و ادبی تحریک کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔ علم و ادب کے ذوق اور فنون کے اصناف لطیفہ کے شوق نے دسویں صدی عیسوی میں دنیا کے اس برگزیدہ خطہ میں تحمل و رواداری اور مروت و بردباری کی ایک ایسی روح پھونک دی تھی جس کی نظیر موجودہ زمانے میں بھی مشکل سے مل سکتی ہے۔ عیسائی، یہودی اور مسلمان سب ایک ہی زبان بولتے، ایک ہی نظمیں پڑھتے اور ایک ہی قسم کے علمی و ادبی مطالعوں میں منہمک رہتے تھے۔ تمام بندشیں

جو آدمی کو آدمی سے جدا رکھتی ہیں اُٹھ گئی تھیں اور سب لوگ باہم مل کر ایک ہی مشترک تہذیب و تمدن کی ترقی میں کوشاں نظر آتے تھے۔ قرطبہ کی مساجد جہاں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ تھے علمی اور فلسفی تعلیمات کی پرجوش مرکز بن گئی تھیں مگر وہ مہلک سبب جو مسلمانوں میں ہمیشہ ذہنی تہذیب و ترقی کا مانع رہا ہے یعنی مذہبی تعصب وہ اندر ہی اندر الحکم کے کارہائے نمایاں کی بربادی کا انتظام کر رہا تھا۔ دارالسلام بغداد کے علمائے مذہب نے خلیفہ مامون الرشید کی نجات اخروی کے بارے میں شبہ کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ اس نے فلسفۂ یونان کو پھیلا کر اسلامی عقائد میں تزلزل پیدا کیا۔ اندلس کے متعصب اہل مذہب نے بھی اس سے کم سختی کا برتاؤ نہیں کیا۔ اور حکم کے بیٹے ہشام کا جب زمانہ آیا تو حاجب المنصور نے اسے کمزور پاکر تمام طاقت و قوت خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔ الحکم ثانی کی وفات کے وقت ہشام کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی۔ صفر ۳۶۶ھ مطابق اکتوبر ۹۷۶ء میں وہ المؤید باللہ کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ الحکم نے انتقال کے وقت محمد بن ابی عامر کو جو اس کا کاتب تھا اس لڑکے (ہشام) کا ہاتھ پکڑا دیا اور بادشاہ بیگم صبح کو جو ہشام کی والدہ اور بہت

لائق خاتون بھی اتالیقہ مقرر کیا تھا لیکن ابن ابی عامر نے حق نمک ادا نہ کیا اور حکومت خود غصب کر لی جس کے بعد وہ وزیر سلطنت کی بجائے مختار کل بن کر حاجب المنصور کے لقب سے حکومت کرنے لگا۔ یہ محمد بن ابی عامر جو خلیفہ الحکم ثانی کا کاتب تھا خود حاکم بننے کے بعد خاندان مرابطین کا جسے الملثمین بھی کہتے ہیں پہلا بادشاہ ہوا اندلس میں اس خاندان کے بادشاہوں نے ۵۴۲ھ تک حکومت کی۔ ان کی اصل بربر کے ایک قبیلہ صنہاجہ سے تھی اور ان کے مرد چہروں پر نقاب ڈالتے تھے اس لئے ان کا نام ملثمین مشہور ہو گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ حمیر کے عرب تھے۔ ان کے قبیلہ میں پہلا بادشاہ ابوبکر بن عمر ہوا ہے جسے مراکش میں امیر المسلمین کا خطاب حاصل تھا اس کے بعد یوسف بن تاشفین بادشاہ ہوا جس نے نصاریٰ کے مقابلہ میں اندلس کے مسلمانوں کی مدد کی اور ملک کی حالت ناگفتہ بہ پا کر خود قبضہ کر لیا۔ ۵۰۰ھ میں اس جلیل القدر بادشاہ نے وفات پائی اور اس کا بیٹا علی بن یوسف تخت نشین ہوا۔ علی بن یوسف کے زمانے میں ظلم و جور بہت زیادہ پھیل گیا۔ اور محمد بن تومرت نے ان مظالم اور بدعتوں کے خلاف آواز بلند کی اور ایسی کوشش کی کہ رفتہ رفتہ مرابطین (ملثمین)

کی حکومت برباد ہو کر موحدین کی حکومت قائم ہوئی جس کے
پہلے بادشاہ کا نام عبدالمومن تھا۔

حاجب المنصور نے حکومت حاصل کرنے کے بعد خلیفہ الحکم
کے کتب خانہ کو جو اتنی محنت سے جمع کیا گیا تھا تمام کھنگال
ڈالا اور فلسفہ، ہیئت اور قدما کے دیگر علوم کی کتابوں کو
قرطبہ کے منظر عام پر جمع کر کے آگ لگا دی اور جو بچ رہیں
انہیں یا تو دریا برد کر ڈالا یا محل شاہی کے حوضوں میں ڈبو
دیا، صرف دینیات، صرف و نحو اور طب کی کتابیں اس کی
دستبرد سے بچ رہیں۔ طلیطلہ کے مؤرخ سعید کا بیان ہے)
منصور کے اس فعل کو اس زمانے کے مؤرخ عوام الناس
میں قبولیت حاصل کرنے کی نیت کی طرف منسوب کرتے
ہیں تاکہ ملکی اغراض کے حصول میں مخالفت کا اندیشہ کم ہو
جائے اور خلیفہ الحکم جس کے تخت پر وہ غاصبانہ قابض ہو
گیا تھا اس کے نیک نام پر دھبہ آئے۔ اندلس میں فلاسفہ کے
طبقہ کو بہت کم مقبولیت حاصل تھی۔ عوام الناس ان کی
کوئی پروا نہیں کرتے تھے اور امیروں اور دولت مندوں
کے اثرات سے زیادہ وہ ان کے اثرات سے بے چین
نظر آتے تھے۔ خلیفہ منصور کے زمانے کے بعد سے تھوڑی
تھوڑی مدت کے لئے اور وہ بھی بعض بعض اوقات فلسفہ

کو آزادی نصیب ہوئی ورنہ ہمیشہ علانیہ اس کی مخالفت ہوتی رہی جو لوگ اس طرف توجہ کرتے تھے ان کے بارے میں معتقدان مذہب بے دینی کے فتوے لگا دیتے تھے اور جو لوگ حکمت اور فلسفہ کے علوم میں دستگاہ رکھتے تھے وہ اپنے علوم کو صرف قریبی دوستوں تک پوشیدہ رکھتے تھے تاکہ وہ کہیں مرتد اور کافر نہ مشہور کر دیئے جائیں۔

بنو امیہ نے اندلس میں جو کام کیا تھا اسے گیارہویں صدی عیسوی کے ان انقلابات نے جو اس ملک میں ظہور پذیر ہوئے سرے ہی سے برباد کر دیا۔ قرطبہ جو علوم و حکمت کی تعلیم کا مرکز تھا لوٹ لیا گیا۔ خلفاء کے محل زیر و زبر ہو گئے اور تمام کتب خانے برباد کر دیئے گئے۔ خلیفہ الحکم کے کتب خانے کی باقی ماندہ اشیاء سستے داموں بیچ ڈالی گئیں اور تمام ملک میں پھیل گئیں۔ مورخ سعید کہتا ہے کہ میں نے بعض کتابیں طلیطلہ میں دیکھی ہیں وہ تسلیم کرتا ہے کہ اگر منصور کی تحقیق و تلاش اس قدر ہوشیاری سے ہوتی جس کا جوش مذہب تقاضا کر رہا تھا تو بلاشبہ یہ کتابیں بھی اپنے مضامین کے لحاظ سے سپرد آتش کر دینے کے قابل تھیں لیکن اس خوبصورت سرزمین میں

فلسفہ نے اس قدر گہری جڑیں کر لی تھیں کہ جس قدر اس کے برباد کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اسی نسبت سے اس کو تازہ زندگی نصیب ہوتی تھی۔ مؤرخ ابن سعید اس واقعہ کا شاہد ہے کہ اس کے زمانے میں جو ۱۰۶۸ھ کا زمانہ تھا علوم قدیمہ کا مطالعہ اور تحصیل ایسی سرگرمی سے جاری تھی جیسے کہ ہمیشہ رہی ہے۔ باوجود اس بات کے کہ بعض حکام وقت اب بھی مخالفت پر آمادہ رہا کرتے تھے اور ہر سال جہاد کے لئے جانے کا لزوم فلاسفہ کی تحقیق و توجہ میں خلل پیدا کیا کرتا تھا بعض بادشاہ بے شک اس طرح کے بھی ہو گزرے ہیں جو ان علوم کی ترقی و رواداری کی طرف مائل نظر آتے تھے مگر تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ فلسفہ کو نہ کسی پناہ وغیرہ کی ضرورت پڑی ہے اور نہ کسی قسم کی نوازش کی احتیاج ہے اسے نہ کسی کے حکم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور نہ کسی کی اجازت کی۔ انسان کی بیداریٔ خیال کا یہ ایک ایسا نتیجہ ہے جو اپنے نشو و نما کے لئے کسی کا شرمندۂ احسان نہیں ہونا چاہتا۔ بہر حال الحکم کا زمانہ گو فلسفہ کے لئے بہترین زمانہ سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں ایک بھی بڑے آدمی کا نام نظر نہیں آتا بر خلاف اس تعصب کے جو علماء

حکماء کے ساتھ اس زمانہ میں کیا جاتا تھا۔ ابن باجہ، ابوبکر رازی، ابن زہر اور ابن رشد کے خیالات اہل یورپ کی زندگی کی موجوں میں جو اصلی حقیقی زندگی ہے نمایاں نظر آتے ہیں۔

مذہبی تعصب کی انتہا نے فلسفہ کے متعلق ملکی ماحول کو اس قدر تنگ کر دیا کہ آئندہ کے لئے اس کے پنپنے اور ترقی پذیر ہونے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی چنانچہ علامہ مقری نے اپنی مشہور تصنیف نفح الطیب کے باب اوّل میں جزیرہ اندلس میں علوم وفنون کے اوصاف و حالات میں لکھا ہے کہ خاص لوگوں کو فلسفہ اور ہیئت کی طرف زیادہ توجہ تھی لیکن عوام الناس کے ڈر کے مارے اس کو ظاہر نہیں کرتے تھے اگر ان لوگوں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ فلاں شخص فلسفہ پڑھتا ہے یا نجوم و ہیئت کا شغل رکھتا ہے تو عام طور پر وہ زندیق مشہور ہو جاتا تھا اور لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیتے تھے اور محض شبہ ہی میں سنگسار کر کے یا جلا کر اس کو مار ڈالتے تھے بعض وقت تو سلطان کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی تھی اور بعض اوقات عوام الناس کے خیال و لحاظ سے سلطان ہی اس کو قتل کرا دیتا تھا۔ یہ تو اکثر ہوا ہے کہ ان علوم

کی کتابوں کو بادشاہوں نے اپنے آپ جلوا ڈالا ہے چنانچہ منصور ابن ابی عامر نے ابتدائی عروج میں عوام الناس کی خاطر ایسا ہی کیا تھا۔ اگرچہ اس میں کوئی بات قابل یقین نہیں ہے کہ آیا منصور خود پوشیدہ طور پر ان علوم کا شائق تھا یا نہیں جیسا کہ اس بات کے متعلق حجازی اور بعض دیگر مؤرخین نے ذکر کیا ہے۔

عیسائی اور دوسرے مغربی مؤرخوں نے تعصب کے معاملہ میں اندلس کے مسلمانوں کے خلاف بہت الزام طرازی کی ہے اور منصور ابن ابی عامر کے بارے میں سطور بالا میں شبہ کی بناء پر لوگوں کے سنگسار کرنے یا جلوانے کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ بھی الزام طرازی کے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو مسلمانوں کو محض بدنام کرنے کے لیے غیر مسلم اور خصوصاً عیسائی مؤرخین نے جاری کر رکھا تھا ورنہ حقیقت حال کے ساتھ ایسے واقعات کا کوئی تعلق نہ تھا البتہ تعصب مذہبی کے جذبات کا اظہار ضرور کیا جاتا تھا مگر مسلمانوں میں اس کی ابتداء بھی عیسائی اور یہودی ہمسایوں کے سخت متعصبانہ رویہ کی وجہ سے ہوئی تھی۔ افسوس ہے کہ مغرب کے مؤرخین نے اس حقیقت کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا اور مسلمانوں

کو اپنی تنگ نظری کا نشانہ بنا لیا لیکن جہاں تک واقعات کی صحیح صورت کا تعلق ہے اس کا اندازہ نواب عماد الملک کے ان الفاظ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے رسائل میں قلمبند کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اندلس کے عوام اہل اسلام کے ساتھ یہ صفت علم دشمنی کی مخصوص تھی۔ بظاہر اسباب اندلس کے نصاریٰ کی محبت سے مسلمانوں کو یہ بات حاصل ہوئی تھی کہ اندلس کے اصل باشندے اس وقت سے آج تک متعصب مشہور ہیں اور ہمیشہ علمی کتابوں اور علماء سے دشمنی کرتے آئے ہیں چنانچہ انتزاع سلطنت کے بعد جب فرڈی نینڈ اور اس کی ملکہ ازابلہ ملک پر قابض ہوئے مسلمانوں کا خزینۂ اندوختہ ان کے ہاتھ سے بہت کچھ تلف ہوا اور اسی ہزار کتابیں ایک مرتبہ جلائی گئیں۔ ایک انگریز مؤرخ کا قول ہے کہ اندلس کے لوگوں کو متعصب ترین بادشاہان اسلام کے وقت میں جس قدر آزادی حاصل تھی اتنی نصرانی بادشاہوں میں سے زیادہ سے زیادہ آزاد منش اور علم دوست بادشاہ کے وقت میں بھی کبھی حاصل نہیں ہوئی۔

نواب عماد الملک نے ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حقیقت میں خود ملت اسلام نے

کبھی علم کے ساتھ دشمنی نہیں کی تھی بلکہ عوام کی جہالت اور سلاطین کی پولیٹیکل ضروریات کبھی کبھی علم اور علماء کی سرپرستی پر آفت لائے ہیں۔ اصل میں بمصداق الناس اعداء ما جھلوا علم و جہل میں تباین ہے اور عالم و جاہل میں سرشتی اختلاف ہے۔ جاہل قوم کے کالانعام ہوتے ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر مسلمانوں میں اسلام کبھی علم کے مٹانے کا باعث نہیں ہوا بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح نصرانی بادشاہ اندلس نے دولت کے زوال کے وقت عربی کتب خانے جلائے اور لاکھوں نسخے برباد کر دیئے اور نصرانی فاتحانِ مصر نے رومیوں کی علمی دولت میں آگ لگائی ویسا کبھی کسی مسلمان بادشاہ نے نہیں کیا اور نہ یورپ کی طرح اختلاف مذہب یا تفلسف کی وجہ سے لوگ زندہ آگ میں جلائے گئے۔ البتہ حاجب المنصور نے بعض خاص وجوہ کی بناء پر اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی غرض سے کتابوں کے ذخائر کو نذرِ آتش کرنے میں قدرِ عافیت دیکھی مگر عیسائی مؤرخین نے اسی واقعہ کو سامنے رکھ کر اس پر اپنی من گھڑت داستانیں مبالغہ آمیز رنگ میں تصنیف کیں جو سر تا سر غلط اور بے بنیاد تھیں کیونکہ اسلام کے

سایہ میں علوم و فنون کو جو ترقی ملی وہ اور کسی کے عہد میں نہ مل سکی۔

گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ خلیفہ الحکم کے بعد محمد بن تومرت نے سلطنت موحدین قائم کی جو امام غزالیؒ کا شاگرد اور بہت بڑا عالم تھا۔ اس وقت تک اندلس کا شاہی مذہب فقہ میں مالکی اور عقائد میں حنبلی یا مجسمی تھا۔ موحدین کی سلطنت جب قائم ہوئی تو سلطنت کا بانی چونکہ اشعری تھا اس وجہ سے سلطنت کا مذہب بھی اشعری قرار دیا گیا۔ اشعری مذہب میں امام غزالیؒ کی وجہ سے کسی قدر معقولات کا رنگ آگیا تھا اس لئے فلسفہ کے ساتھ بھی تعصب کی حالت وہ نہ رہی جو پہلے تھی۔ خاندان موحدین کے پہلے بادشاہ عبدالمومن نے ۵۴۲ھ سے ۵۵۶ھ تک حکومت کی۔ اس کی حکومت کا انداز پورے طور پر احکام شرعیہ پر تھا۔ علم و حکمت کی حمایت کی جاتی تھی اور علماء کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ محمد بن تومرت نے سلطنت مرابطین کا خاتمہ کر کے عبدالمومن کو تخت نشین کیا تھا اور چونکہ وہ امام غزالیؒ کا شاگرد تھا اس لئے اس کی حکومت کی طرز بھی انہی اصول کے موافق تھی جو امام غزالیؒ کی تمنا تھی۔ علامہ شبلی الغزالی

(صفحہ ۲۴۸) میں ابن خلدون (کتاب ثالث) اخبار بربر فصل ثالث سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عبدالمومن کے خاندان کی حکومت کا یہ طور تھا کہ علماء کی عزت کی جاتی تھی اور تمام واقعات و معاملات میں ان سے مشورہ لے کر کام کیا جاتا تھا۔ داد خواہوں کی فریاد سنی جاتی تھی۔ رعایا پر عمال ظلم کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی۔ ظالموں کا ہاتھ روک دیا گیا تھا۔ شاہی ایوانوں میں مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں۔ تمام سرحدی ناکے جہاں یورپ کے ڈانڈے ملتے تھے فوجی طاقت سے مضبوط کر دیئے گئے تھے اور غزوات و فتوحات کو روز افزوں ترقی حاصل تھی

یہ لکھا جا چکا ہے کہ عبدالمومن نے علوم و فنون پر شاہانہ حوصلہ سے توجہ کی اور عبدالملک بن زہر کو جو اس زمانے کا بہت بڑا عالم تھا اپنے خاص مقربین میں داخل کیا۔ عبدالمومن کے بعد اس کا بیٹا یوسف اپنے باپ کے جانشین کے طور پر ۵۵۸ھ میں تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ یوسف بہت ہی فاضل اور بلند حوصلہ بادشاہ تھا اور اس زمانے کے اہل سیف اور اہل قلم دونوں ہی میں ممتاز نظر آتا ہے۔ اس نے اپنے زور بازو سے طلیطلہ

کے عیسائیوں سے بہت سے اسلامی شہر واپس لیے
فلسفہ اور عقلیات میں اسے خاص دلچسپی تھی۔ یہی وجہ
ہے کہ ابن طفیل کو اس نے اپنا ندیم خاص اور صیغۂ علمی
کا افسر مقرر کیا تھا۔

یوسف نے ۵۸۰ھ میں وفات پائی اور اس کے
بعد اس کا بیٹا یعقوب المنصور تخت نشین ہوا۔ وہ نہایت
اولوالعزم اور عالی قدر بادشاہ تھا۔ جس کے زمانے میں
موحدین کی سلطنت عروج وکمال کی انتہا تک پہنچ گئی
تھی۔ اس کے جاہ و جلال کی عظمت اور فتوحات کی
وسعت بھی اپنی جگہ پر تاریخ کے ایک سنہری باب
کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اسی کے ساتھ علوم نوازی کے
سلسلہ میں اس نے جو حیرت انگیز کارنامے انجام دیے
ان کی مثال بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ منصور کے علمی
کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فقہا کو
خود اپنے اجتہاد سے کام لینے اور کسی مجتہد یا امام کی تقلید
نہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ جس کی پورے طور پر تعمیل کی جاتی
تھی۔ عدالتوں میں فقہ کی پابندی اٹھادی چنانچہ جو فیصلہ کیا
جاتا تھا قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سے کیا جاتا تھا
ابن خلکان نے منصور کے حالات میں جہاں اس واقعہ

کا ذکر کیا ہے وہاں لکھا ہے کہ ہمارے زمانے میں مغرب سے جو علماء آئے مثلاً ابو الخطاب ابن وحیہ، ابو عمرو، محی الدین عربی وغیرہ سب کا یہی طریقہ تھا یعنی کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ منصور کے جذبہ علوم پروری کی وجہ سے اس کے دربار کو ارباب کمال بھی ایسے مل گئے تھے جن پر آج تک اسلام کو ناز ہے اور حقیقت یہ ہے کہ موحدین کی سلطنت کی بنیاد مذہب ہی کی سطح پر قائم ہوئی تھی۔ اس سلسلہ کا بانی محمد بن تومرت امامت اور مہدویت کا مدعی تھا اور اسی حیثیت سے اس نے سلطنت کی بنیاد قائم کی تھی۔ سلطنت کا صدر مقام مراکش تھا جو صحرا نشین بدوؤں کا گویا کعبہ تھا اور جہاں ہر طرف بدویت اور سادہ عربیت کے آثار نظر آتے تھے۔ فوجی اور ملکی ارکان ٹھیٹ مذہبی خیال کے لوگ تھے۔ سلطنت کی ملکی قوت محض اس بات پر موقوف تھی کہ مذہبی جوش کا رنگ قائم رکھا جائے۔ عیسائیوں نے اسپین کے اکثر حصے دبا لئے تھے۔ ان کے مقابلے میں صرف مذہبی جوش کی قوت سے عہدہ برآئی ہو سکتی تھی اور منصور نے جو اس سلسلہ کا تیسرا تاجدار تھا اسی قوت سے کام لے کر عیسائیوں پر وہ عظیم الشان فتوحات حاصل کی تھیں۔

جن سے عیسائی سلطنت میں ایک بہت بڑا تغیر رونما ہو گیا۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دربار فقہا اور محدثین کے ہاتھ میں تھا اور تمام ملک پر انہی کے خیالات چھا گئے تھے اس موقعہ پر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ موحدین چونکہ خود اشعری تھے اس لئے انہوں نے اس مذہب کو شاہی مذہب قرار دیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اندلس میں مسلمانوں کی علمی زندگی مشرقی ممالک کی بہ نسبت بالکل جداگانہ حالت رکھتی تھی۔ مشرقی ممالک میں علوم و فنون کی ابتداء دولت عباسیہ سے ہوئی جس کا صدر مقام بغداد تھا۔ عباسی حکومت کا مایۂ خمیر پارسی اور عیسائی قومیں تھیں اور اس وقت تک ان کا ہر قسم کا لٹریچر زندہ موجود تھا ان کی آمیزش سے اسلامی علوم و فنون میں ابتداء ہی سے فلسفہ کا رنگ آگیا اور گو ایک مدت تک فقہاء و محدثین بہت کچھ دامن بچاتے رہے لیکن آخر مذہب و فلسفہ اس طرح شیر و شکر ہو گئے کہ اس کے بعد عقائد کو فلسفہ سے جدا کرنا گوشت کے ناخن سے جدا کرنے کے مترادف ثابت ہوا۔ لیکن اندلس کی حالت اس کے بالکل برخلاف تھی۔ اندلس میں اسلامی حکومت

کی ترکیب بالکل خالص اور بے میل تھی یعنی عرب کے سوا کسی دوسری قوم کا شائبہ نہ تھا۔ عرب کے قبائل اس کثرت سے وہاں جا کر آباد ہو گئے تھے کہ اندلس حجاز و نجد کا ایک ٹکڑا بن گیا تھا۔ مفتوحہ قوموں کا کوئی علمی لٹریچر موجود نہ تھا اور تھا تو وہ اس قدر کمزور تھا کہ فاتح قوم کے لٹریچر پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا تھا۔ مذاہب میں سے جس مذہب کا یہاں رواج ہوا وہ مالکی مذہب تھا جو عرب کے دل و دماغ کا آئینہ تھا۔ ان اسباب سے ملک کی آب و ہوا میں عربیت، عربیت میں مذہب اور مذہب میں مختلف امور کا اثر آگیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں فلسفہ کی مخالفت کا پر زور جذبہ پیدا ہو گیا لیکن بایں ہمہ چونکہ مشرقی ممالک سے علمی تعلقات قائم تھے یعنی تحصیل علوم کے لئے اندلس سے لوگ مشرق کو آتے تھے اور یہاں کے اہل کمال قدر دانی کی امید پر مغرب کا سفر کیا کرتے تھے اس لئے اندلس اور مراکش میں بھی کبھی کبھی فلسفہ کا جلوہ نظر آجاتا تھا۔
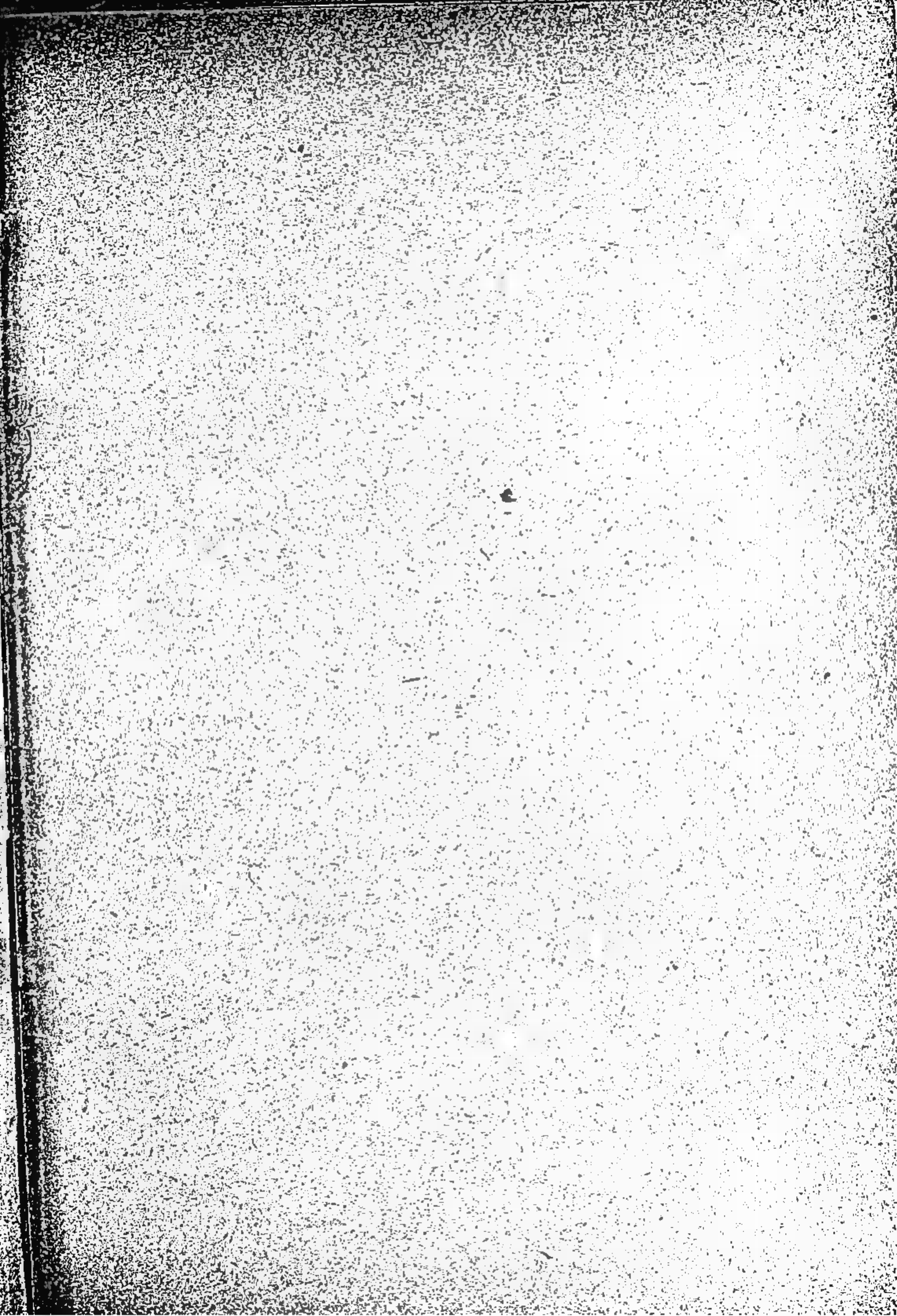
دانشورانِ اندلس

اندلس میں مسلمان خلفاء و سلاطین کی اولوالعزمی اور ذوقِ علوم نوازی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس ملک کی سرزمین ایسے باکمال دانشوروں اور علماء و حکماء کا گہوارہ بن گئی جن کے کارناموں پر علوم وفنون کی تاریخ آج تک فخر کرتی ہے اور جن کی علمی کاوشیں مغرب اور مشرق دونوں میں علم و فن کا نام بلند کرنے کا باعث ہوئیں اگرچہ ان بادشاہوں نے اپنی قدر دانی کے شہرہ سے دنیا بھر کے اربابِ کمال کو اندلس میں کھنچ آنے کی طرف راغب کر دیا تھا۔ اور ممالک عالم کے گوشہ گوشہ سے کاملینِ علم و فن تاجدارانِ اندلس کی ہدایات کے مطابق یہاں بلا لیئے گئے تھے نیز بہت سے علماء از خود بھی اسلامی سلطنت کی

عزت افزائی اور علوم پروری کی شہرت سن کر اس جگہ سمٹ آئے تھے لیکن اسی کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کا ذوق سلیم اندلس میں ایک ایسا علمی ماحول پیدا کرنے کا موجب ہوا تھا جس کے خرد افروز اثرات نے اس خطہ ارض کے بطن سے بھی نادر روزگار علماء و حکما کو جنم دیا اور ایسے ایسے آئمۂ فن کو پروان چڑھایا جن کی عظمت اور جن کی شہرت و ناموری کے آفتاب سے دنیا کا گوشہ گوشہ جگمگا اٹھا۔ چنانچہ امیر عبدالرحمٰن الناصر الدین اللہ الحکم المستنصر باللہ، یوسف بن تاشفین، عبدالمومن، یوسف بن عبدالمؤمن اور یعقوب المنصور باللہ جیسے علم دوست اور علوم نواز سلاطین کی علمی قدر دانیاں جن اصحاب کمال کے آسمان شہرت پر جلوہ گر ہونے کا باعث ہوئیں ان میں علامہ ابن رشد، علامہ ابن باجہ، ابن طفیل، ابوبکر بن زہر، ابو جعفر ہارون ترجالی، ابن ابی اصیبعہ اور ابو مروان بن زہر بے مثال علم و فضل اور عالمگیر شہرت و عظمت کے بزرگ تھے۔ ان کے علاوہ اندلس کی مردم خیز سرزمین نے اور بھی بہت سے علماء حکما پیدا کئے جن میں سے ایک بڑی تعداد انہی فضلائے دہر کے شاگردوں اور حواریوں پر مشتمل تھی اور ان کے فیوض صحبت نے اندلس

کو دانشوران عصر کے متعدد خاندانوں کا مسکن بنا دیا جو اپنے کمال فن کی بدولت دنیا بھر کے شعور مند انسانوں سے داد و تحسین حاصل کرتے رہے اور جن کے علمی کارنامے آج تک زندۂ جاوید شہرت کے حامل تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بہرحال جن اہل کمال کے اسماء گرامی سطور بالا میں درج کیے گئے ہیں۔ آئندہ اوراق میں ان کا انفرادی تذکرہ ہدیۂ ناظرین ہے اور اس سلسلہ کا آغاز امام المعلم ثانی علامہ ابن رشد کے سوانح حیات سے کیا جاتا ہے۔

---

(۱)

علامہ ابن رشد

علامہ ابن رشد کے حالات قلم بند کرنے سے پیشتر میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں نے اسلام کے اس فیلسوف اعظم اور فاضل اجل کے علمی کارناموں کو نئی دنیا کے سامنے لانے اور ان سے استفادہ کرنے کی طرف وہ توجہ نہیں کی جس کا اسے ہر لحاظ سے حق حاصل ہے اور اس جلیل القدر فرزند ملت کے نتائج فکر کو مشعل راہ بنانے سے افسوسناک حد تک اغماض برتا ہے لیکن اس کے مقابلہ پر یورپ کے تمام علماء و دانشور ابن رشد کے فلسفہ اور اس کے نظریات سے آج تک مستفید ہو رہے ہیں اور ان پر کاربند ہونا اپنے لئے باعث

فخر تصوّر کرتے ہیں گویا مسلمانوں کا فرض مغرب کے اہل علم انجام دے رہے ہیں اور مسلمان اس طرف سے قطعی طور پر غافل ہیں۔ یہ حقیقت کتنی جگر خراش ہے کہ ابن رشد کی علمی شان و عظمت اور فلسفیانہ ژرف نگاہی کا جو حق مسلمانوں کو حاصل تھا۔ جن کی امت کا وہ ایک ممتاز فرد تھا اس حق پر یورپ کے غیر مسلم علماء نے تو ہر ممکن تگ و تاز سے قبضہ کر لیا مگر مسلمان اس حق سے بہت حد تک محروم رہ گئے اور اسے حاصل کرنے کی معمولی کوشش بھی نہ کر سکے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے بھی اس حقیقت کا نہایت دلسوزی سے اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں نے ابن رشد کے بارے میں انتہا سے بے التفاتی کا ثبوت دیا ہے کہ اسلامی لٹریچر میں اس کا ذکر بھی بڑی حد تک مفقود دکھائی دیتا ہے چنانچہ علامہ شبلیؒ نے اپنے مقالات میں ابن رشد پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

"یہ عجیب بات ہے کہ ابن رشد کے حالات اسلامی تذکروں اور تاریخوں میں بہت کم ملتے ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ نے مختصر طور پر اس کا تذکرہ کیا ہے (علامہ مقری کی (نفح الطیب میں

اس سے بھی زیادہ مختصر ہے۔ ابن الابار اندلسی نے بھی اجمال سے کام لیا ہے۔ یہ تمام کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں۔ ذہبی کی کتاب ہم نے نہیں دیکھی لیکن پروفیسر رینان نے اس کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں بھی ایسی تفصیل نہیں جو ابن رشد کے شایان شان ہو۔ پروفیسر رینان نے جو فرانس کا نہایت مشہور مصنف گزرا ہے خاص ابن رشد کے حالات میں ایک ضخیم کتاب فرنچ زبان میں لکھی جس میں ابن رشد کی سوانحعمری تفصیل سے لکھی۔ رینان کو بڑا موقع یہ حاصل تھا کہ ابن رشد کے یہودی شاگردوں نے جو کچھ ابن رشد کے متعلق لکھا تھا وہ اس کے پیش نظر تھا۔ رینان نے ابن رشد کے فلسفہ پر بھی نہایت تفصیل سے بحث کی ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کی ضخامت چار سو صفحوں سے متجاوز ہو گئی ہے۔ بیروت کے ایک عیسائی مورخ نے اپنی کتاب آثار الادہار میں اس کی مدد سے ابن رشد کا کسی قدر مفصل تذکرہ لکھا ہے۔ انطون نے ابن رشد کے حالات میں ایک مستقل کتاب عربی زبان میں لکھی جو حال ہی

اسکندریہ سے شائع ہوئی ہے لیکن اس کی اصل غرض ایک مسلمان عالم (شیخ محمد عبدہٗ) سے مجادلہ کرنا تھا چنانچہ اصل مقصد کو چھوڑ کر ساری کتاب مجادلہ اور مشاتمہ سے بھر دی ہے۔ اردو زبان میں بھی ابن رشد کے متعلق دو ایک مضمون لکھے گئے ہیں جن میں سے نواب عماد الملک کا مضمون گو مختصر ہے لیکن چونکہ رینان سے ماخوذ ہے قابل استناد ہے"

علامہ شبلیؒ اپنے اسی مقالہ کی ابتداء میں لکھتے ہیں:۔

"اس مضمون میں جو چیز لحاظ کے قابل ہے یہ ہے کہ اگرچہ مسلمان اپنے علوم و فنون اور اپنے اسلاف کی یادگاروں کی پرستش کے دعویدار ہیں لیکن یہ دیکھ کر ان کو سخت حیرت ہوگی کہ ابن رشد جس کی تصنیفات کا ان کو نام و نشان بھی نہیں ملتا یورپ میں ایک مدت تک اس کی تصنیفات تمام بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں داخل درس رہیں اور سینکڑوں اہل فن ان تصنیفات کے شروح و حواشی لکھنے میں مصروف تھے۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوگا کہ یورپ

نے یونان اور عربی فلسفہ کو اب جو نظر انداز
کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔"

اس اقتباس سے یہ امر پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یورپ کے لوگ ابن رشد سے کس قدر متاثر ہوئے اور اس کے حالات لکھنے میں انہوں نے کس قدر دلچسپی کا مظاہرہ کیا مگر اس کے برخلاف مسلمانوں نے ابن رشد سے کتنی دوری اختیار کی اور اس کے حالات کو ضبط تحریر میں لانے سے کس حد تک پہلو تہی روا رکھی حالانکہ اس کی تصنیفات آج بھی اسلام کی سب سے بڑی علمی یادگار ہیں۔ بہر حال علامہ شبلیؒ نے فرانسیسی مصنف موسیو رینان کی جس تصنیف "ابن رشد اور فلسفہ ابن رشد" کو اس قدر مستند قرار دیا ہے کہ اس کی مدد سے لکھے ہوئے نواب عماد الملک کے مختصر مضمون کی حیثیت بھی کلیتاً قابل اعتماد ہو گئی ہے اس تصنیف کا اردو ترجمہ اس وقت میرے سامنے ہے اور میں اس کی روشنی میں ابن رشد کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج ذیل کرتا ہوں۔ علامہ شبلیؒ نے بھی مقالات میں موسیو رینان ہی کی کتاب سے اپنا مقالہ "ابن رشد" اخذ کر کے لکھا تھا مگر وہ بہت مختصر ہے اور ابن رشد کی علمی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ قارئین کو اس کے حالات سے ضروری تفصیل کے ساتھ روشناس کرایا جائے۔

قاضی ابوالولید محمد بن احمد بن محمد ابن رشد ۵۲۰ھ (مطابق ۱۱۲۶ء) میں بمقام قرطبہ پیدا ہوا۔ ابوالولید اس کی کنیت اور حفید لقب تھا اس کی تاریخ پیدائش کے بارے میں بعض اختلافات پائے جاتے ہیں مگر ابن الابار اور انصاری دونوں کے نزدیک یہی تاریخ صحیح ہے۔ عبدالواحد کا بیان ہے کہ جس وقت ابن رشد کا ۵۹۵ھ (مطابق ۱۱۹۸ء) میں انتقال ہوا تو اس کی عمر پچھتر ۷۵ سال کی تھی۔ ابن رشد خود اپنی تصنیف شرح ارسطاطالیس کے باب دوم مقالہ فلکیات میں ۱۱۳۸ء کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے جسے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اپنی تحریروں میں وہ قرطبہ کو بار بار یاد کرتا ہے۔ شرح جمہوریت میں جہاں وہ افلاطون کی زبانی یہ کہتا ہے کہ تہذیب ذہنی کے معاملہ میں یونانی قوم کو قدرت نے خاص طور پر ممتاز فرمایا ہے۔ وہی زبان سے ساتھ ہی یہ بھی کہہ جاتا ہے کہ ملک اندلس کو مگر اس پر برتری حاصل ہے۔ اپنی کلیات میں وہ خاص طور پر جالینوس کے برخلاف دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا میں سب سے عمدہ آب و ہوا اقلیم پنجم کی ہے جس میں قرطبہ واقع ہے۔ منصور کے دربار کا ایک واقعہ کتب تاریخ میں درج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بادشاہ کے سامنے ابن رشد اور ابوبکر ابن زہر اشبیلوی

کے درمیان ایک مباحثہ ہوا تھا کہ ان دونوں اصحاب کے مقامات ولادت میں سے کونسی جگہ کو علمی اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔ ابن رشد نے بیان کیا تھا کہ اگر اشبیلیہ میں کوئی عالم وفات پائے اور لوگ اس کی کتابوں کو فروخت کرنا چاہیں تو قرطبہ لاتے ہیں جہاں ان کی خاطر خواہ قیمت ملتی ہے اس کے برخلاف اگر کوئی موسیقار قرطبہ میں آجائے تو اس کی مزامیر کو اشبیلیہ لے جاتے ہیں جہاں ان کی بڑی مانگ ہے۔

خاندان

ابن رشد کا خاندان اندلس میں ایک بہت جلیل القدر خاندان تسلیم کیا جاتا تھا اور مقامی عہدہ داروں کی نگاہ میں اس کی خاص قدر و منزلت تھی۔ اس کا دادا جس کا اپنا نام بھی پوتے کے نام کی طرح ابوالولید محمد تھا اور ابن رشد کی طرح وہ بھی قرطبہ کا قاضی تھا فقہائے مالکیہ میں بڑا بلند مرتبہ رکھتا تھا پیرس کے شاہی کتب خانے میں اس کے فتووں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے جسے قرطبہ کی جامع مسجد کے پیش امام ابن الفران نے مرتب کیا تھا۔ اندلس اور عرب ممالک کے تمام شہر حتیٰ کہ خاندان مرابطہ کے بادشاہ تک اس سے فیض حاصل کرنے والوں میں داخل تھے اور اس ذی علم قاضی کے فتووں پر عمل کیا کرتے تھے۔ فلسفہ کا مذہب کے

بڑا امام

سانحہ جو تعلق ہے اس کی جھلک ان فتووں میں بھی دکھائی دیتی ہے اور اس عجیب و غریب کتاب کے بعض صفحوں پر خود ابن رشد کے خیالات کے ماخذ بھی نظر آتے ہیں۔ اس کے دادا نے ملکی معاملات میں بعض پہلوؤں سے کچھ حصہ لیا تھا۔ ایک دفعہ کسی بغاوت کے سلسلہ میں اس کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ اندلس کے صوبہ داروں کی اطاعت کا پیغام حاکمان مراکش کے پاس لے جائے۔

ابن رشد نے اس صدی کے نہایت مشہور لوگوں کی صحبت میں اپنا زمانہ بسر کیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی حدیث کی مشہور کتاب موطا کا راوی اول یحیی صمودی اسپین ہی کا رہنے والا تھا اور اس وجہ سے موطا کو ان ممالک میں اس قدر درجہ قبول حاصل تھا کہ قرآن کے بعد شمار کی جاتی تھی ابن رشد کی تعلیم پہلے اسی سے شروع ہوئی وہ موطا کو زبانی یاد کرتا تھا اور اپنے باپ کو سناتا تھا۔ حافظ ابوالقاسم بن بشکوال، ابومروان بن میسرہ، ابوبکر بن سمخون ابوجعفر بن عبدالعزیز اور ابو عبداللہ مازری سے بھی حدیث کی تحصیل کی علم فقہ ابو محمد بن رزق سے حاصل کیا۔ ادب اور عربیت اندلس کے نصاب تعلیم کا لازمی جزو تھا اس لئے نہایت محنت اور شوق سے اس کی تحصیل کی۔ ابوالقاسم بن طلیسان کا بیان

ہے کہ ابوتمام اور متنبی کا دیوان اس کو زبانی یاد تھا اور اکثر صحبتوں میں ان کے اشعار وہ ضرب المثل کے طور پر برجستہ پڑھتا تھا ان علوم کی تکمیل کے بعد اس نے طب کی طرف توجہ کی۔ اس زمانے میں اس فن کا ماہر امام ابوجعفر بن ہارون ترجالی تھا۔ وہ اشبیلیہ کا رہنے والا تھا اور وہاں کے اعیان میں گنا جاتا تھا۔ ابوبکر بن عربی جو امام غزالی کے شاگرد تھے۔ ان سے حدیث کی تحصیل کی تھی۔ طب میں اس نے نہایت کمال حاصل کیا تھا۔ ارسطو اور دیگر حکمائے متقدمین کی تصنیفات کا بڑا ماہر تھا۔ علوم نظریہ کے ساتھ معالجہ میں بھی کمال رکھتا تھا۔ اور اس تعلق سے سلطان وقت یعنی یوسف بن عبدالمومن کے دربار کا ملازم تھا۔ ابن رشد نے ابوجعفر کی خدمت میں ایک مدت تک طب کی تحصیل کی اور طب کے علاوہ اور علوم بھی اس سے حاصل کئے۔ فلسفہ میں وہ براہ راست ابن باجہ کا زیر بار احسان نظر آتا ہے۔ ابن طفیل (جسے الہیات کے عیسائی علماء ابوبکر کے نام سے یاد کرتے ہیں)، بھی ابن رشد کی زندگی پر بہت بڑا اثر ڈالنے والا تھا تمام عمر اس کے اور ابن زہر کے خاندان عظیم کے بہت گہرے تعلقات رہے۔ اسی خاندان کے اراکین کو یہ عزت حاصل تھی کہ بارھویں صدی عیسوی میں اسلامی

اندلس میں علوم کی اشاعت ان کے ذریعہ سے ہوئی
ابوبکر ابن زہر (اصغر) اس کا ساتھی تھا کیونکہ دونوں
شاہی طبیب تھے اور ابو مروان ابن زہر مصنف "تیسیر"
سے اس کے اس قدر دوستانہ تعلقات تھے کہ جب
ابن رشد نے "کلیات" تصنیف کی تو اس خواہش کا
بھی اظہار کیا کہ اس کا دوست ابو مروان ابن زہر بھی
ایک رسالہ "جزئیات" پر لکھے تاکہ ان دونوں کی تصنیفیں
مل کر فن طب کے لئے ایک نصاب کامل بن جائیں۔
علاوہ ازیں حضرت شیخ محی الدینؒ ابن العربی جو ایک
مشہور و معروف صوفی گزرے ہیں ان سے بھی بڑے
تعلقات تھے۔ مگر انہوں نے علم تصوف کی مناسبت
اس میں نہ پائی اس لئے اپنے علوم بتانے سے انکار کر دیا۔
ابن رشد نے ایک زمانے میں جب کہ وہ قرطبہ کا قاضی
تھا شیخ سے درخواست کی تھی کہ علم تصوّف کے اسرار
سے کچھ مجھے بھی آگاہ فرمائیں لیکن شیخ نے کہا کہ ہمیں
اجازت نہیں ہے اور بتانے سے انکار کر دیا۔
ابن رشد کی زندگی کا وہ حصّہ جو ملکی معاملات سے متعلق
نظر آتا ہے وہ بھی اپنی جگہ ایک عجیب شان رکھتا ہے۔
مذہبی تعصب جو خاندان موحدین کے جذبۂ انقلاب کا

روح و رواں تھا عبدالمومن اور یوسف کے ذوق علم و حکمت کے اثر سے ایک قلیل زمانے کے لئے رُک گیا۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ مرابطین کی تباہی علمی کتابوں کی بربادی کی وجہ سے جس کا انہوں نے حکم دیا تھا ظہور میں آئی۔ جب عبدالمومن کا زمانہ آیا تو اس نے نہایت سختی کے ساتھ ان وحشیانہ حرکتوں کو روکا اور اس صدی کے علماء ابن زہر ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رشد اس کے دربار کے بہت ذی رسوخ لوگوں میں سے تھے۔ ۵۴۸ھ (مطابق ۱۱۵۳ء) میں ابن رشد مراکش میں دکھائی دیتا ہے جہاں وہ علمی درسگاہوں کی بابت عبدالمومن کی تحریکات کی تائید کر رہا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے مشاغل ستارہ بینی و مشاہدات فلکی سے بھی غافل نہیں ہے۔ عبدالمومن کا جانشین یوسف اپنے زمانے کے بہت ذی علم بادشاہوں میں سے تھا۔ اس کے دربار میں ابن طفیل کو بہت رسوخ حاصل ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیگر تمام ممالک سے علماء و فضلا کھنچ کر اسی دربار میں چلے آئے۔ ابن طفیل ہی کے ذریعہ سے ابن رشد کو دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ مؤرخ عبدالواحد نے خود ابن رشد کے ایک شاگرد کی زبانی یہ واقعہ سنا تھا کہ کس طرح پہلی مرتبہ دربار میں اس کی پیشی

ہوئی تھی۔ ابن رشد کی عادت تھی کہ اپنے دوست و احباب سے اس قسم کے قصے بیان کیا کرتا تھا۔ یہ قصہ اس نے جس طرح بیان کیا اسی طرح وہ بروایت در روایت عبدالواحد تک پہنچا جسے اس نے قلمبند کر لیا۔ وہ ابن رشد کی زبانی کہتا ہے کہ "جب میں امیرالمومنین کے حضور میں پیش ہوا تو وہاں تنہا ابن طفیل کو موجود پایا جس نے میری تعریف شروع کی اور میرے خاندان کی شرافت اور قدیم حسب و نسب کا ذکر کیا۔ اس سلسلہ میں ابن طفیل نے ازراہ نوازش میرے متعلق مختلف قسم کے تعریفی الفاظ کہے جن کا میں اپنے آپ کو مشکل ہی سے مستحق پاتا ہوں۔ میرا نام اور میرے باپ کا نام پوچھنے کے بعد امیرالمومنین (یوسف) نے اس طرح گفتگو شروع کی :-

"افلاک کے متعلق حکماء کی کیا رائے ہے؟
وہ اسے قدیم سمجھتے ہیں یا حادث؟"

یہ سن کر مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی اور ہاتھ پاؤں سن ہو گئے اور میں اس سوچ میں ڈوب گیا کہ کونسا عذر کروں چونکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ابن طفیل اور امیرالمومنین دونوں نے متفقہ طور پہ میرا امتحان لینے کی کوشش کی ہے اس لئے میں نے سرے سے انکار ہی کر دیا کہ میں نے فلسفہ

بالکل نہیں پڑھا۔ امیر المؤمنین پر میرے پس و پیش کرنے کی وجہ ظاہر ہو گئی اور انہوں نے ابن طفیل کی طرف رخ کر کے اس مسئلہ پر گفتگو شروع کی۔ انہوں نے ایک ایک کر کے ارسطو، افلاطون اور دیگر فلاسفر کی تحقیقاتوں پر روشنی ڈالی اور ان کے علاوہ فقہائے اسلام کے تمام دلائل کی توضیح کی جو فلاسفہ کے مقابلہ میں وہ لایا کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ امیر المؤمنین کا حافظہ اس قدر قوی ہے کہ وہ علماء بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتے جو اپنا تمام وقت انہی تحقیقاتوں میں صرف کیا کرتے ہیں۔ بہر حال امیر المؤمنین نے سمجھ لیا کہ میرے تردداّت کیونکر رفع ہو سکتے تھے چنانچہ انہوں نے خود ہی ایسا سلسلۂ کلام شروع کیا جس سے مجھے آپ سے گفتگو کرنے کی جرأت ہوئی۔ اصل میں امیر المؤمنین کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ فلسفہ میں میری استعداد کہاں تک ہے؟ جب دربار برخاست ہوا اور واپسی کی اجازت ملی تو مجھے کسی قدر زر نقد، ایک خلعت فاخرہ اور ایک گھوڑا مرحمت ہوا۔"

اگر ہم اسی مؤرخ پر اعتبار کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف کی صریح خواہش اور ابن طفیل کے اشارے ہی سے ابن رشد نے ارسطو کی شرحیں لکھنا شروع کی تھیں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک روز ابن طفیل نے بلا بھیجا

اور کہا کہ آج امیر المومنین مجھ سے شکایت کر رہے تھے کہ ارسطو بالکل زاویہ گمنامی میں پڑا ہوا ہے اور اس کے ترجمے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ خدا کرے کہ مجھے کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اس کے رسالوں پر شرحیں لکھ دے اور صاف عبارت میں اس کے مضامین کی توضیح کر دے تاکہ عوام بھی اس کی تصنیفات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کام کے لئے جس لیاقت کی ضرورت ہے وہ تم میں بدرجۂ فائق موجود ہے اس لئے بہتر ہے کہ تم یہ کام شروع کر دو۔ تمہاری اعلیٰ ذہانت، عام فہم طرز بیان اور اس انہماک کو جو کتابوں کے مطالعہ میں ہے میں خوب جانتا ہوں اس لئے امید ہے کہ تم اس کام میں کامیابی حاصل کر سکو گے تم خود دیکھتے ہو کہ مجھے اس ذمہ داری کو برداشت کرنے سے جو چیز روک رہی ہے وہ میری پیرانہ سالی ہے اس کے علاوہ امیر المومنین کی خدمت کے متعلق جو بہت سے کام میرے ذمہ ہیں وہ اس پر مستزاد ہیں۔

ابن رشد کہتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے میں نے اپنی تمام تر توجہ اس کام کی طرف جس کے لئے ابن طفیل نے کہا تھا صرف کرنا شروع کی۔ یہ ہیں وجوہات جنہوں نے مجھے ان شرحوں کے لکھنے کے لئے آمادہ کیا جو میں نے

ارسطو پر لکھی ہیں۔ ابن طفیل اپنے فلسفیانہ قصے میں جو ایک شخص کی طرف اشارہ کرتا ہے اس سے بلاشبہ اس کی مراد ابن رشد ہی سے ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ تمام فلاسفہ جو ابن باجہ کے بعد گزرے ہیں اس کے مقابلہ میں بہت کم رتبہ رکھتے ہیں۔ خود ہمارے معاصرین جو اس کے بعد آئے ان کی حالت ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے۔ اور ابھی تک کسی درجہ کمال کو نہیں پہنچے حتیٰ کہ اس بات کا اندازہ کرنا بھی فی الحال ناممکن ہے کہ ان میں کیا کیا اصلی خوبیاں ہیں؟

یوسف کے زمانے میں ابن رشد کو جو رسوخ ہمیشہ حاصل رہا اور جن بڑی بڑی خدمتوں پر وہ مامور رہا ان سے پورے طور پر وہ متمتع ہوتا رہا۔ ۵۶۵ھ (مطابق ۱۱۶۹ء) میں وہ اشبیلیہ کے قاضی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ کتاب الحیوان ارسطو کے حصہ چہارم کی شرح میں جو اسی سال ختم کی تھی بیان کرتے کرتے وہ عذر کرنے لگتا ہے کہ اس زمانہ کے حالات و معاملات میں اس کی مصروفیت اس قدر ہے اور پھر اپنے مکان میں جو قرطبہ میں ہے، اور جہاں اس کی سب کتابیں ہیں بہت دور پڑا ہوا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس سے کچھ سہو ہو گیا ہو جسے

نظر انداز کرنا ہی مناسب ہوگا۔ ۵۶۷ھ مطابق ۱۱۷۱ء میں اپنے وطن قرطبہ کی طرف اس کی مراجعت ہوئی۔ یہ یقیناً یہی زمانہ ہے جب کہ اس نے ارسطو کی عظیم الشان شرح کی تصنیف کی بنیاد ڈالی ہوگی۔ اس کتاب میں وہ جا بجا شکایت کرتا ہے کہ سرکاری کاموں کی وجہ سے فرصت نہیں ملتی بلکہ انہی میں زیادہ وقت صرف ہو جاتا ہے اور قلب کا اطمینان باقی نہیں رہتا جو ایسے کاموں کے لئے لازمی ہے۔ کتاب مختصر المجسطی کے مقالہ اول کے اختتام پر وہ لکھتا ہے کہ مجھے مجبوراً صرف اہم مسائل کی حد تک محدود رہنا پڑا ہے۔ میری مثال اس شخص کی سی ہے جس کے چاروں طرف آگ لگ اٹھی ہو اور صرف اتنا موقعہ باقی ہو کہ جو اشیاء بے حد ضروری ہیں وہی اپنے ساتھ لے جا کر جان بچا لے۔ اس کے فرائض منصبی اس قسم کے تھے کہ خلفائے موحدین کی قلمرو کے مختلف حصوں میں متعدد اوقات اسے سفر کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ کبھی وہ آبنائے جبل الطارق کے اس طرف اور کبھی اُس طرف دکھائی دیتا تھا۔ کبھی وہ مراکش میں نظر آتا تھا اور کبھی اشبیلیہ میں اور کبھی قرطبہ میں اور انہی مختلف مقامات پر وہ شرحیں لکھنے میں مصروف رہتا تھا

۵۷۴ھ (مطابق ۱۱۷۸ء) میں مراکش ہی میں بیٹھے بیٹھے
اس نے "جوہر الکون" کا ایک حصہ لکھا تھا۔ ۵۷۵ھ
(مطابق ۱۱۷۹ء) میں اشبیلیہ میں بیٹھ کر اس نے مذہب
پر جو رسائل لکھے ہیں ان کو اختتام تک پہنچایا۔ ۵۸۱ھ
(مطابق ۱۱۸۵ء) میں یوسف نے اسے پھر مراکش میں
طلب کیا اور ابن طفیل کی جگہ طبیب اول مقرر کر دیا۔
اس کے بعد یوسف نے اسے قرطبہ کے قاضی القضاۃ
کا عہدہ عطا کیا جس پر اس کے باپ اور دادا دونوں مامور
رہ چکے تھے۔ یعقوب المنصور بادشاہ کے زمانے میں دربار
میں اس کا رسوخ پہلے سے کہیں زیادہ نظر آتا ہے منصور
اس کے ساتھ علمی مضامین پر مکالمے کرنا پسند کرتا تھا
اور اس مسند پر جگہ دیتا تھا جو اس کے دربار میں خاص
الخاص لوگوں کے لیئے آراستہ کی جاتی تھی اور پھر
اس قدر بے تکلفانہ باتیں ہوتی تھیں کہ ابن رشد بادشاہ
کو کبھی کبھی "اسمع اخی" (سنو میرے بھائی) کے الفاظ
سے خطاب کر جاتا تھا۔ ۵۹۱ھ (مطابق ۱۱۹۵ء) میں
جب منصور قسطلیہ کے بادشاہ الفانسو نہم کے مقابلہ کے
لیئے جنگی تیاریاں کر رہا تھا جو (الارک دالرکوئل) کی فتح پر
منتج ہوئیں اس وقت بھی ابن رشد بادشاہ کے ساتھ ہی

ساتھ دکھائی دیتا تھا۔ ابن ابی اصیبعہ تفصیل کے ساتھ
بیان کرتا ہے کہ اس موقعہ کیا کیا مراعات خسروانہ اس کے
شامل حال ہوتی رہیں۔ پھر انہی مراعات سے دشمنوں
کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور یہی ان کی
پریشانیوں کے اسباب تھے جن میں ابن رشد کی زندگی کے
آخری چار سال بسر ہوئے۔

ابن رشد کے اخلاق و اطوار بالکل حکیمانہ تھے۔ وہ
نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھا۔ ایک مدت تک
عہدۂ قضا پر مامور اور دربار شاہی میں مقرب و ممتاز رہا
لیکن جاہ و ثروت سے اس نے بذاتِ خود مطلقاً کوئی
فائدہ نہ اٹھایا۔ اس کو جو کچھ ملتا تھا وہ اسے وطن اور
اہل وطن پر صرف کرتا تھا۔ دربار شاہی کے تقرب سے
بھی اس نے جو کام لیا وہ خلائق کی کار برآری اور عوام
کی نفع رسانی تھی۔ حلم اور عفو کی یہ حالت تھی کہ ایک
شخص نے اسے مجمع عام میں برا بھلا کہا اور سخت توہین
کی لیکن وہ بجائے اس کے کہ مخالف سے انتقام لیتا
اُلٹا شکر گزار ہوا کہ اس کی بدولت مجھ کو اپنے حلم
کے جانچنے اور آزمانے کا موقع ملا چنانچہ اس کے
صلہ میں کچھ روپے نذر کئے لیکن ساتھ ہی اس کو یہ بھی

نصیحت کی کہ اوروں سے یہ سلوک نہ کرنا اور نہ ہر شخص اس قسم کے احسان کا قدر دان ہوتا ہے ابن رشد کے مزاج میں انتہا درجے کا رحم تھا۔ وہ مدتوں قاضی القضاۃ رہا لیکن کبھی کسی کو قتل کی سزا نہیں دی اور اگر کبھی ایسا ہی موقع آپڑتا تو وہ عدالت کی مسند سے علیحدہ ہو جاتا اور کسی کو اپنا قائم مقام بنا دیتا۔ مطالعہ اور کتب بینی کا اسے بے حد شوق تھا۔ ابن الابار کا بیان ہے کہ ساری عمر میں صرف دو راتیں ایسی گزریں جن میں وہ کتب بینی اور مطالعہ سے باز رہا۔ ان میں سے ایک اس کے نکاح کی رات تھی اور دوسری وہ رات تھی جس میں اس کے باپ نے وفات پائی۔

وہ انتہا درجے کا فیاض اور سخی تھا اور اس کی فیاضی دوست و دشمن سب کیلئے یکساں تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر میں صرف دوستوں کو دوں تو میں نے وہ کام کیا جس کو خود میرا دل چاہتا تھا لیکن احسان اور فضیلت یہ ہے کہ مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ سلوک کیا جائے۔ ابن رشد وطن کا نہایت شیفتہ تھا۔ افلاطون نے جمہوریت پر جو کتاب لکھی ہے اس میں یونان کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ یہاں کے لوگوں کو تمام دنیا کی بہ نسبت علوم عقلیہ

سے خاص مناسبت ہے۔ ابن رشد نے اس کتاب کی
شرح میں اپنے وطن اندلس کو بھی یونان کا ہم پایہ قرار دیا۔
جالینوس کا قول ہے کہ دنیا میں سب سے عمدہ آب و ہوا
یونان کی ہے مگر ابن رشد نے کتاب الکلیات میں اس
کے برخلاف دعویٰ کیا اور لکھا کہ اس فخر کا مستحق یونان
نہیں بلکہ قرطبہ ہے۔ ایک دفعہ منصور کے دربار میں ابن
زہر اور ابن رشد میں یہ بحث ہو گئی کہ اشبیلیہ اور قرطبہ
میں کس کو ترجیح ہے۔ ابن زہر اپنے وطن اشبیلیہ کو
ترجیح دیتا تھا مگر ابن رشد نے اس کے خلاف ایسی توجیہہ
سے دلائل دیئے جن سے دونوں شہروں کی فضیلت کا
صحیح اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

...بتی کے اسباب

ایک وقت تھا کہ ابن رشد کو امیر المومنین یوسف بن عبدالمومن
اور یعقوب المنصور باللہ کے دربار شاہی میں خاص مسند پر
جا گزیں ہونے کا شرف حاصل تھا اور اس کے قرب سلطانی
پر لوگ حسد کھاتے تھے لیکن زمانے نے یکایک ایسی گردش
کی جس کے نمونے اسلامی بادشاہوں کے درباروں میں
روزانہ دیکھنے میں آیا کرتے تھے۔ اس گردش کا نتیجہ یہ برآمد
ہوا کہ ابن رشد بادشاہ منصور کی نظروں سے گر گیا اور
قصبہ الیسانہ میں جو قرطبہ کے نزدیک ہی واقع تھا جلا وطن

کر دیا گیا۔ اس قصبہ میں پہلے یہودی رہا کرتے تھے اور یہی اصل میں اس قصبہ کے مشہور ہونے کی وجہ تھی جو افریقہ کے عیسائی مؤرخ لادن نے لکھی ہے اور اس کے زمانہ سے لے کر اب تک ہر شخص اس پر آسانی سے یقین لاتا رہا ہے۔ اس قصہ میں مذکور ہے کہ حکیم مظلوم (ابن رشد) بادشاہ کے غضب سے قصبہ الیسانہ میں جا کر اپنے ایک فرضی شاگرد کے یہاں پناہ لیتا ہے جس کا نام موسیٰ میمونی ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دشمنوں نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ لوگوں میں اس کو یہودی النسل مشہور کریں۔

ابن رشد پر شاہی عتاب ہونے کے اسباب پر لوگوں نے طرح طرح کے قیاسات کا اظہار کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ابن رشد، قرطبہ کے گورنر ابویحییٰ اور منصور کے بھائی ان تینوں میں بہت گہرے دوستانہ روابط تھے جو ابن رشد کے اخراج کا باعث ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ امیرالمومنین کے ساتھ اس نے آداب شاہی کو مدنظر نہیں رکھا تھا۔ عبدالواحد اور ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ ابن رشد نے حیوانات کے حالات پر ایک رسالہ (شرح کتاب الحیوان ارسطو) لکھا تھا اس کے بیان کے سلسلہ میں ایک جگہ زرافہ

کی بابت یہ لکھ دیا کہ میں نے اس قسم کا ایک چوپایہ شاہ بربر کے یہاں دیکھا ہے۔ شاہ بربر سے اس کی مراد یعقوب المنصور سے تھی۔ عبدالواحد کہتا ہے کہ علما جب کبھی علمی مضامین پر بحث کرتے ہیں تو درباریوں اور کاتبوں کے استعمال کے تعریفی الفاظ ترک کر دیا کرتے ہیں۔ یہی صورت اس موقعہ پر پیدا ہوئی تھی۔ منصور کو اس آزادانہ گفتگو سے ملال ہوا اور شاہ بربر کے خطاب کو اس نے اپنے لئے باعث توہین سمجھا۔ ابن رشد معذرت کے طور پر یہ کہتا ہے کہ میرے پڑھنے والے نے غلطی کی ہے اور ملک البرین کی جگہ ملک البربر پڑھا ہے لیکن میں نے ملک البرین لکھا تھا جس کے معنی افریقہ اور اندلس کا بادشاہ کے تھے۔ یہ دونوں الفاظ واقعی اس طرح لکھے جاتے ہیں کہ معمولی اعراب کے سوا دونوں کی صورت ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔

انصاری نے اس سلسلہ میں ایک اور روایت بیان کی ہے جس میں علمائے مذہب میں سے ایک صاحب کے عقیدہ کا ذکر ہے جنہوں نے ابن رشد کے شہر بدر کرنے میں خاص حصہ لیا تھا یعنی تمام مشرق میں اور اندلس میں بھی ایک پیشین گوئی مشہور ہوئی کہ ایک خاص دن

ایک سخت طوفان باد آئے گا۔ جو تمام بنی نوع انسان کو برباد کر دے گا۔ لوگ یہ سن کر بہت خوفزدہ ہو گئے اور پہاڑی غاروں اور تہ خانوں وغیرہ میں چھپنے کا انتظام کرنے لگے۔ ابن رشد اس زمانہ میں قرطبہ کا قاضی تھا۔ عامل وقت نے تمام علماء اور دیگر ذی وجاہت و اہل الرائے لوگوں کو جمع کیا۔ ابن رشد نے یہ جرأت کی کہ اس مسئلہ پر طبعی نقطۂ نظر سے غور کیا۔ ایک صاحب جو مذہبی عالم تھے اور جن کا نام عبدالکبیر تھا اس گفتگو میں شریک ہو گئے اور ابن رشد سے پوچھنے لگے کہ قوم عاد کے متعلق جو یہ حال مذکور ہے کہ اس طرح وہ تیز و تند ہوا سے برباد ہو گئی، کیا تمہیں اس سے انکار ہے؟ ابن رشد نے اس کا جو جواب دیا وہ اس واقعہ کے متعلق جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے کسی قدر پایۂ ادب سے گرا ہوا تھا۔ تاریخی نقطۂ نظر سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ ایسے ناجائز ہیں کہ علمائے مذہب انہیں کبھی بخش نہیں سکتے۔ ابن رشد کے دشمنوں کو یہ ایک موقع مل گیا۔ اور وہ اس بات کو لے اڑے اور مشہور کر دیا کہ قاضی شہر ملحد و بے دین ہو گیا ہے۔ عبدالواحد کہتا ہے کہ ابن رشد کے دشمنوں کو اس کی "شرح" کا خود اس کے قلم

کا لکھا ہوا ایک نسخہ مل گیا جس میں کسی قدیم مصنف کے یہ الفاظ نقل تھے کہ "سیارۂ ناہید (زہرہ) خدا ہے" انہوں نے یہ جملہ اس سے پہلے کی عبارت کو چھپا کر منصور کو دکھایا اور کہا کہ یہ ابن رشد کا کلام ہے اور اس بے گناہ کو مشرک قرار دیا۔

ان قصوں کے متعلق ہم جو چاہیں رائے قائم کریں لیکن اس میں شک نہیں کہ ابن رشد کی تذلیل کا باعث فلسفہ تھا۔ فلسفیانہ مشاغل نے منصور کی نظر میں اس کی مذہبی حالت کو مشتبہ کر دیا تھا۔ تمام تعلیم یافتہ لوگ جو خوش نصیبی سے محسود خلائق ہو جاتے ہیں اسی قسم کے الزاموں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ منصور نے یہ سن کر قرطبہ کے تمام بڑے بڑے لوگوں کو طلب کیا اور ابن رشد کو بھی بلایا اور اس کے اصول کو خلاف مذہب قرار دے کر جلاوطن کرنے کا حکم دیا۔ علامہ شبلی اس واقعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ابن رشد کی یہ باتیں (جو اس کی بربادی کی وجہ ثابت ہوئیں) اگر اس کی ذات تک محدود رہتیں تو چنداں شورش نہ ہوتی لیکن وہ قاضی القضاۃ تھا، فقیہہ تھا، طبیب تھا

اور یہ سب تعلقات اس قسم کے تھے کہ اس کے معتقدات اور خیالات تمام ملک میں پھیل جاتے تھے۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ابن رشد سے جن لوگوں کو حسد تھا انہیں اس سے بڑھ کر کیا موقعہ مل سکتا تھا؟ ان لوگوں نے اس آگ کو اور بھڑکایا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر منصور علانیہ ابن رشد سے باز پرس نہ کرتا تو رعایا اس کی طرف سے بدگمان ہو جاتی۔ غرض منصور نے یہ حکم دیا کہ ابن رشد مع اپنے شاگردوں اور پیروؤں کے مجمع عام میں حاضر کیا جائے۔ چنانچہ قرطبہ کی جامع مسجد میں ایک عظیم الشان مجمع ہوا جس میں ابن رشد ایک مجرم کی حیثیت سے لایا گیا۔ اس مجمع میں تمام علماء اور فقہاء شریک تھے۔ سب سے پہلے قاضی ابو عبداللہ بن مروان نے تقریر کی اور کہا کہ ہر چیز میں نفع اور ضرر دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس بناء پر نافع اور مضر ہونے کا فیصلہ نفع یا ضرر کے اعتبار سے کیا

جاتا ہے۔ قاضی ابو عبداللہ کے بعد ابو علی بن
حجاج سفر جو خطیب تھے کھڑے ہو کر اعلان
کیا کہ ابن رشد ملحد اور بے دین ہو گیا ہے۔
یہ سب ہوا لیکن اسلامی آزادی اور فراخ حوصلگی
کا پھر بھی اتنا اثر تھا کہ یورپ کی مجلس انکویزیشن
کی طرح یہ فتویٰ نہیں دیا گیا کہ مجرم زندہ جلا
دیا جائے۔ حاسدوں نے یہ بھی شہادت دی
تھی کہ ابن رشد کے خاندان کا کچھ پتہ نہیں چلتا
کیونکہ اسپین میں جو قبائل آباد ہیں ابن رشد کو
کسی سے خاندانی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق
اگر ہے تو بنی اسرائیل کے خاندان سے ہے
اس بناء پر یہ قرار پایا کہ اسے موضع لوسینیا میں
بھیج دیا جائے کیونکہ یہ خالص بنو اسرائیل کی
بستی تھی اور ان کے سوا اور کوئی قوم یہاں
سکونت نہیں رکھتی تھی۔
نواب عماد الملک نے ابن رشد کی جلا وطنی کے اسباب
پر اپنے رسائل میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔
"ابن رشد کے اخراج کی کتنی ہی تاویلیں کیوں
نہ کی جائیں۔ اصل حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے

کہ خلیفہ کو بعض امور نے اس کی طرف سے
بدگمان کر دیا تھا۔ حساد نے موقع پاکر عجیب
چغلیاں شروع کیں۔ جس کسی کو کوئی بات
جھوٹی یا سچی ہاتھ لگی جاکر امیر کے کانوں
تک پہنچا آیا۔ امیر تو بدگمان ہو ہی چکا تھا
الحاد کا بہانہ اسے اچھا مل گیا۔ چند فقہا کو
جمع کر کے بعلت زندقہ اس کے اخراج
کا فتویٰ دلوا دیا اور اس کے ساتھ ہی تمام
ملک میں منادی پٹوا دی کہ کوئی علوم فلسفہ
کی تحصیل نہ کرے اور تمام معقولات کی
کتابوں کے جلا دینے کا حکم دے دیا۔ عجب
نہیں ہے کہ جس طرح امیر حکم بن عبدالرحمٰن
المستنصر باللہ کے بعد اس کے حاجب المنصور
نے عوام الناس کو اپنا طرفدار بنانے کے لئے
حکم کا کتب خانہ جلوا دیا تھا اور علوم عقلیہ
کی تعلیم موقوف کرا دی تھی۔ اسی طرح اس
خلیفہ کو بھی جو اتفاقاً اس کا ہم لقب ہے
یہی ضرورت پیش آئی ہو یعنی چونکہ خود اس کو
علوم حکمیہ میں بہت توغل تھا اور حکما سے

وقت کو اپنے دربار میں نہایت پیش پیش
رکھا کرتا تھا اور ابن رشد سے ابو یحییٰ اپنے
بھائی کی دوستی کی وجہ سے بدگمان ہو ہی
چکا تھا اور شائد اس کے فضل و کمال کا رشک
بھی فی الجملہ اس کے دل میں سما گیا تھا اس
لئے الحاد کے بہانہ کو اس نے غنیمت جانا
جس سے اول تو ابن رشد نکالا گیا اور دوسرے
اس نے عوام الناس سے خود اپنی برأت
اور حیات کا صداقت نامہ حاصل کر لیا کیونکہ
ہمیشہ سے عوام علماء اور حکماء کے دشمن ہیں؛
اس قسم کے حالات تھے جن سے عوام میں غم و غصہ
کی لہر دوڑ گئی اور عوام کے بڑھتے ہوئے اضطراب کے
پیش نظر منصور کو فیصلہ کن کارروائی کے لئے یہ قدم اٹھانا
پڑا کہ اس نے نہ صرف ابن رشد کو جلاوطن کرنے کا حکم
صادر کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس نے تمام صوبجات میں یہ
احکام بھی جاری کئے کہ اس قسم کی خطرناک تعلیم کی ممانعت
کر دی جائے اور جن کتابوں سے طبیعت اس طرف مائل
ہوتی ہے انہیں جلا دیا جائے۔ اس حکم عام میں صرف یہ
چند امور مستثنیٰ قرار دیئے گئے تھے کہ جو کتابیں فن طب

و ریاضی پر ہوں اور صرف اس قدر ابتدائی ہیئت کی کتابیں جو دن رات کی ساعتیں اور سمت قبلہ کے معلوم کرنے کے لئے ضروری ہوں برباد نہ کی جائیں۔ انصاری نے اس تمام فرمان کی نقل درج کی ہے جسے ابو عبداللہ ابن عیاش کاتب نے جو امیرالمومنین کا کاتب تھا نہایت تاکیدی الفاظ میں لکھا تھا۔ ابن ابی اصیبعہ نے ابو بکر ابن زہر کے ذکر میں امیرالمومنین یعقوب المنصور کا یہ فرمان حسب ذیل عبارت میں نقل کیا ہے:

قد کان فی سالف الدهر قوم خاضوا
فی بحور الاوهام و اقرلهم عوامهم
بشغوف علیهم فی الاتام حیث لا داعی
یدعوا الی الحی القیوم ولا حاکم یفصل
بین المشکوک فیه والمعلوم فخلدوا
فی العالم صحفا مالها من خلاق مسودة
المعانی والاوراق بعدها من الشریعة
بعد المشرقین وتباینها تباین الثقلین
یوهمون ان العقل میزانها والحق برهانها
وهم یتشعبون فی القضیة الواحدة
فرقاً ویسیرون فیها شواکل وطرقاً الخ

(ترجمہ) "قدیم زمانے میں کچھ لوگ ایسے تھے جو وہم
کی پیروی کرتے تھے۔ اس کے باوجود عوام
ان کے کمال عقل کے گرویدہ ہو گئے تھے
ان لوگوں نے اپنے خیال کے موافق کتابیں
تصنیف کیں جو شریعت سے اس قدر دور
تھیں جس قدر مشرق سے مغرب دور ہے
ہمارے زمانے میں بعض لوگوں نے انہی
ملاحدہ کی پیروی کی اور انہی کے مذاق پر
کتابیں تصنیف کیں۔ یہ کتابیں بظاہر قرآن
مجید کی آیات سے آراستہ ہیں لیکن ان کی
تہ میں الحاد و زندقہ ہے۔ جب ہم کو ان
حالات کی خبر ہوئی تو ہم نے ان کو دربار
سے نکال دیا اور حکم دیا کہ ان کی تصنیفات
جہاں بھی ہاتھ آ جائیں جلا دی جائیں۔"

یہ فرمان اس موقعہ پر باشندگان مراکش اور سلطنت کے
دیگر بڑے بڑے شہروں کے لوگوں کو سنانے کے لئے
روانہ کیا گیا تھا۔ اس کی ہر سطر سے اس نفرت کا اظہار
ہوتا ہے جس کے بھڑکانے والے حکمت و فلسفہ کے
آزاد خیال طلبہ تھے اس قسم کی بعض شکایتوں سے زیادہ

لغو اور بے لطف تر کوئی دوسری شے نہ ہوگی جو ہزاروں مرتبہ پہلے بھی پیش کی جا چکی ہیں اور اب بھی پیش کی گئیں اور ان امور سے ناراضی کا اظہار کرتی ہیں جن کی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں کی جا سکتی بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو جو لوگ ایسی شکائتیں زیادہ کیا کرتے ہیں خود انہی کی طبیعتوں میں ان شکایات کا باعث اور اصل منبع نظر آئے گا۔

الغرض جو انقلاب ابن رشد کی بربادی کا باعث ہوا وہ در اصل شاہی دربار کی ایک سازش کا نتیجہ تھا جس میں مذہبی تعصب رکھنے والی جماعت کو اہل فلسفہ پر کامیابی حاصل ہوئی۔ صرف ابن رشد اس تعصب کا شکار نہیں بنا بلکہ اور بھی متعدد بڑے بڑے لوگ، علماء، اطباء، فقہا، قضاۃ اور شعراء بھی اس بلا میں گرفتار ہوئے چنانچہ ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے کہ ابن رشد کے ساتھ ابو جعفر الذہبی، فقیہہ عبداللہ محمد ابن ابراہیم قاضی بجایہ، ابوالربیع الکفیف، ابوالعباس الحافظ اور الشاعر القری بھی اس علت میں شہر بدر کئے گئے کہ علوم اولیہ میں ان کو زیادہ توغل تھا۔ ابن ابی اصیبعہ کہتا ہے کہ منصور کی ناراضی کا سبب یہی تھا کہ تمام لوگ اپنی فرصت کے اوقات فلسفہ اور قدما کے علوم کی تحصیل میں صرف کرتے تھے۔ فلاسفہ کی اس تذلیل کا ذکر بعض شعراء نے اپنی نظموں میں بھی کیا ہے۔ خاص

طور پر ابوالحسن ابن جبیر نے کینہ توز پھبتیوں کے پیرائے میں ابن رشد کی ایک ایسی ہجو کہی ہے جس کی بحر فتح مند مخالفین کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس ہجو کے چند اصل اشعار جن کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا اور فرانسیسی سے ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا گیا تھا ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج ذیل کئے جاتے ہیں :-

الآن قد ایقن ابن رشد
ان تو الیفہ توالف
یا ظالماً نفسہ تامل
ھل تجد الیوم من توالف

(۲) لم تلزم الرشد یا ابن رشد
لما علا فی الزمان جدک
وکنت فی الدین ذا ریاء
ما کان ھکذا جدک

(۳) نفذ القضاء باخذ کل مموہ
متفلسف فی دینہ متزندق
بالمنطق اشتغلوا فقیل حقیقۃ
ان البلاء موکل بالمنطق

ترجمہ:- (۱) اب ابن رشد کو یقین ہو گیا کہ اس کی تصنیفات

کیسی مضر شے ہیں۔ اے وہ شخص! جس نے خود اپنے آپ کو بے حرمت کیا ذرا سوچ تو سہی کہ اب کوئی ایک شخص بھی ایسا ہے جو تیرا دوست بننا پسند کرتا ہے؟

(۲) "اے ابن رشد! جب تیری کوششیں اس صدی میں اس قدر بلند پروازی حاصل کرنے لگیں تو تو رشد و ہدایت کی راہ پر قائم نہیں رہا تو نے مذہب سے دغا کی۔ تیرے دادا کا طریق عمل یہ نہ تھا!"

(۳) "تقدیر نے ان تمام مکذبین مذہب کو جو فلسفہ کو مذہب سے ملاتے رہتے ہیں الحاد کی تعلیم دیتے ہیں نیچے گرا دیا۔ وہ منطق میں مشغول ہوئے اور یہ بات سچ ثابت ہو گئی کہ منطق ہی تمام مصیبتوں کی جڑ ہے؟"

علامہ شبلیؒ نے اس سلسلہ کے دو اور شعر بھی لکھے ہیں جو یہ ہیں:-

تفلسوا وادعوا علوما
صاحبها فی المعاد یشقی

واحتقروا الشرع من ازدروه
سفاهة منهم وحمقا

ترجمہ:-

ان اشعار کے ساتھ لوگوں نے جس دلچسپی کا ثبوت دیا اس سے یہ واضح ہوتا تھا کہ ابن رشد کی گرفتاری اور ذلت پر عوام میں بڑی مسرت کا اظہار کیا گیا۔ جلاوطنی کے بعد ابن رشد کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ جہاں بھی جاتا تھا ذلیل و رسوا کیا جاتا تھا۔ وہ خود بیان کرتا ہے کہ سب سے زیادہ صدمہ جو مجھے پہنچا وہ یہ تھا کہ ایک دفعہ میں اور میرا بیٹا عبداللہ قرطبہ کی مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے کے لئے گئے لیکن پڑھ نہ سکے کیونکہ چند بازاری لوگوں نے ہنگامہ برپا کیا اور ہم دونوں کو مسجد سے نکال دیا۔ لیکن ابن رشد کی اس ذلت و خواری کا زمانہ کچھ زیادہ طویل نہ تھا بلکہ تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ ایک جدید انقلابی صورت ظہور پذیر ہوئی اور فلاسفہ پھر شاہی عنایات میں داخل ہو گئے۔ مراکش سے واپس آنے پر منصور نے اپنے وہ تمام احکام منسوخ کر دیئے جو فلسفہ

کے خلاف جاری کئے گئے تھے اور پھر اس کی طرف بڑے جوش کے ساتھ توجہ فرمائی۔ علماء اور دیگر معزز لوگوں کی رائے سے ابن رشد اور دوسرے اصحاب کو جو اس کے ساتھ مصیبت میں مبتلا ہوئے تھے واپس بلا لیا اور انہی میں سے ایک شخص کو جس کا نام ابوجعفر الذہبی تھا۔ دربار کے تمام اطباء و فیلسوف کی تصنیفات کی نگرانی کے لئے مقرر کیا۔ مؤرخین نے جو واقعات تحریر کئے ہیں ان سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منصور نے جو کچھ کیا تھا ملکی مصلحت سے کیا تھا۔ وہ بذات خود بہت بڑا ذی علم اور حکمت دوست تھا اس کی طبیعت سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ اس کے مراکش سے واپسی کے بعد کے احکام اس کے شاہد ہیں۔

افریقی مؤرخ لاؤن نے ابن رشد کی تذلیل کا واقعہ بیان کرتے وقت بہت سی چھوٹی چھوٹی اور مہمل باتیں بھی بیان کی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ابن رشد کے دشمن اسے ملحد قرار دینے کے لئے کیسی کیسی چالیں چلتے رہے اور اخراج و ارتداد میں اسے کیا کیا ذلتیں نصیب ہوئیں؟ یہ تفصیلی واقعات اعتبار کے لحاظ سے اتنے گرے ہوئے ہیں کہ یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں پائی جاتی لیکن یہ بات یقین کرنے

کے قابل نہیں ہے کہ لاؤن نے خود ان قصوں کو گھڑا ہوگا۔ اس نے ضرور کسی نہ کسی عربی مصنّف کی کتاب میں دیکھا ہوگا اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن باتوں کا وہ ذکر کرتا ہے وہ نہیں تو انہی کی مانند دوسری باتیں انصاری کی تصنیف میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ انصاری کا بیان ہے کہ ابن رشد کہا کرتا تھا کہ سب سے زیادہ تکلیف مجھے اپنے بیٹے کے ہمراہ مسجد قرطبہ سے نکل جانے پر ہوئی ابن رشد کے تمام شاگرد ملحد اور بے دین سمجھے جانے لگے۔ لوگوں نے ان کے فتوے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا مگر بعض ایسے شاگرد بھی تھے جنہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان کے عقائد نیک مسلمانوں کے عقائد سے ایسے مختلف نہیں جیسے کہ سمجھے جا رہے ہیں۔ لاؤن افریقی نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے اس سے کسی قدر ملتے جلتے بعض واقعات اگرچہ دوسرے مؤرخین کے ہاں بھی ملتے ہیں لیکن یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ لاؤن افریقی نہایت جھوٹا اور مفتری تھا اس لئے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور ممکن ہے کہ ان میں سے بہت باتیں اس نے خود گھڑی ہیں جہاں تک ابن رشد کے شاگردوں کے فتوے تسلیم نہ کرنے کا تعلق ہے علمائے ظاہر نے فلسفہ ہی

کی نہیں تصوف کی بھی سخت مخالفت کی ہے چنانچہ حضرت شیخ ابن العربیؒ جو ابن رشد کے ہمعصر اور اہل تصوف کے قول کے مطابق اپنے زمانے کے قطب عالم تھے علمائے ظاہر کے نزدیک زندیق سمجھے جاتے تھے۔

تاج الدین ابن حموی نے جو اس زمانے میں مغرب کی سیر کے لئے آیا تھا ابن رشد سے ملاقات کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا یعنی (ابن رشد کو اس زمانے میں اس قدر سخت تنہائی میں زندگی بسر کرنا پڑی تھی کہ دربار شاہی میں دوبارہ رسوخ حاصل ہونے کے بعد وہ بہت دنوں زندہ نہیں رہا حالانکہ اب وقت آیا تھا جب کہ ابن رشد اپنے فضل وکمال کی داد پاتا اور اس کی دانشوری کو اس قدردانی کی نگاہوں سے دیکھا جاتا جس کا وہ صحیح معنوں میں مستحق تھا اور ارسطو کی طرح اس کے تاج فضیلت پر دولت و ثروت کا طرہ بھی نظر آتا لیکن موت کے سبے رحم ہاتھوں نے اس کا موقعہ نہ دیا۔ مراکش پہنچ کر وہ بیمار ہوا اور ۹ صفر ۵۹۵ھ (مطابق ۱۰ دسمبر ۱۱۹۸ء) کو جمعرات کے دن اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! انصاری نے بھی یہی تاریخ وفات لکھی ہے ابن ابی اصیبعہ بھی ابن رشد کی وفات کو ۵۹۵ھ کے آغاز میں واقع ہونا بیان کرتا ہے۔

مگر ایک مقام پر وہ خود یہ لکھ کر اپنی آپ تردید کرتا ہے کہ محمد الناصر نے جو یعقوب المنصور باللہ کے بعد ۲۲۔ ربیع الاوّل ۵۹۵ھ (مطابق ۲ جنوری ۱۱۹۹ء) کو تخت نشین ہوا ابن رشد کو اپنے دربار میں بلایا اور مراحم خسروانہ سے سرفراز فرمایا تھا۔ یہ تردید اس صورت میں اور زیادہ قوی ہو جاتی ہے جب کہ وہ کہتا ہے کہ ابن رشد کو دوبارہ دربار میں رسوخ اسی سال یعنی ۵۹۵ھ میں منصور ہی کے زمانے میں حاصل ہوا تھا۔ ابن العربی جو اس کے جنازے کے ساتھ تھے وہ اور یافعی، محمد بن علی شاطبی اور عام مؤرخین اہل اسلام بھی ۵۹۵ھ بتاتے ہیں۔ عبدالواحد اور ذہبی بھی اس تاریخ سے زیادہ انحراف نہیں رکھتے۔ ابن عربی کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کا یہی نام موسیو رینان نے فرانسیسی میں لکھا ہے لیکن ابوبکر ابن العربی اور محی الدین ابن العربی میں اکثر دھوکا ہو جاتا ہے اگرچہ یہ دونوں اندلسی تھے مگر اوّل الذکر کا نام ابوبکر بن العربی تھا جو امام غزالی کے شاگرد تھے۔ ان سے یہاں مراد کسی طرح نہیں ہو سکتی اس لئے کہ امام غزالی کا انتقال ۵۰۵ھ میں ہوا ہے اور ابن رشد کی وفات ۵۹۴ھ یا ۵۹۵ھ میں ہوئی۔ امام صاحب کے کسی شاگرد کا استاد کی وفات کے نوے برس بعد تک زندہ رہنا اگر ناممکن

نہیں تو عجیب ضرور معلوم ہوتا ہے ابن العربی (الف و لام تعریف کے ساتھ) شیخ عارف و کامل محی الدین ابن العربی کی کنیت ہے جنہوں نے ۶۳۸ھ میں عالم باقی کی طرف انتقال کیا۔ حقیقت میں یہی بزرگ ہیں جو ابن رشد کے جنازے کے ساتھ تھے اور جن سے ابن رشد نے تصوّف حاصل کرنے کی خواہش کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے۔ ان کی کتابیں فصوص الحکم اور فتوحات بکیہ مشہور رہیں ان کی قبر دمشق میں آج تک عظیم زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

(عبدالواحد اور ذہبی کے بیان کے مطابق ابن رشد کی وفات اواخر ۵۹۴ھ (مطابق اگست یا ستمبر ۱۱۹۸ء) میں واقع ہوئی تھی) صرف لاؤن افریقی ایک شخص ہے جو کہتا ہے کہ ابن رشد کا انتقال ۱۲۰۶ء میں ہوا۔ انصاری نے لکھا ہے کہ ابن رشد شہر مراکش کے قبرستان میں تاغزوت دروازہ کے بیرونی جانب دفن کیا گیا۔ علامہ شبلیؒ نے تحریر کیا ہے کہ شہر سے باہر جبانیہ ایک مقام ہے یہاں مدفون ہوا لیکن ایک مہینے کے بعد لوگوں نے قبر کھود کر ہڈیاں نکال لیں اور قرطبہ لے جا کر مقبرۂ ابن عباس میں جو ابن رشد کا خاندانی قبرستان ہے دفن کیں۔ واضح رہے کہ علامہ شبلیؒ نے مقالات میں

ابن رشد پر جو مقالہ درج کیا ہے وہ موسیو رینان کی اسی تصنیف سے اخذ کیا گیا ہے جس سے ابن رشد کے حالات کی تفصیل یہاں پیش کی جا رہی ہے اور علامہ شبلیؒ نے مضمون کے شروع میں بتا دیا ہے کہ "یہ مضمون تمام تر پروفیسر رینان کی کتاب "سوانح ابن رشد" سے ماخوذ ہے) انصاری نے ابن رشد کے مقام تدفین کا ذکر کرنے کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ تین ماہ کے بعد اس کی لاش کو قرطبہ لے گئے جہاں ابن عباس کے قبرستان میں خاندانی گنبد ہے۔ اسے بھی دفن کر دیا۔ ابن العربی کا بیان ہے کہ انہوں نے مراکش میں بچشم خود دیکھا تھا کہ ابن رشد کی لاش قرطبہ لے جانے کے لئے سواری پر رکھی جا رہی ہے مگر لاڈن افریقی کہتا ہے کہ اس نے ابن رشد کی قبر اور کتبہ مراکش میں باب تاگالاں کے قریب دیکھا ہے لیکن لاڈن کا بیان دوسرے مؤرخین کے مقابلہ پر بہت کم قابل اعتماد ہے کیونکہ وہ ان حالات کو قلم بند کرنے میں اپنے مسیحی تعصب کا مظاہرہ عام طور پر کرتا ہے جیسا کہ ابن رشد کی بربادی اور اس پر شاہی عتاب کے بارے میں اس نے بہت سی بے بنیاد باتیں لکھ دی ہیں حالانکہ ابن رشد کے زیر عتاب آنے کی بنیادی وجہ اس کے اور فلسفہ کے مخالفین کی درباری سازش تھی جس کو اس واقعہ

نے اور ہوا دی کہ ابن رشد نے یعقوب المنصور کو محض شاہ بربر لکھا اور امیرالمومنین کے خطاب سے مخاطب نہ کیا اس بات نے منصور کو حد سے بڑھ کر مشتعل کیا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ کسی قدر تندخو اور زود رنج طبیعت کا مالک تھا چنانچہ علامہ شبلیؒ نے اس بادشاہ کی نخوت و خود پسندی کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ بھی اس کے اشتعال کو جلد قبول کرنے کی واضح دلیل ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

"یورپ نے بیت المقدس کو جب مسلمانوں کے ہاتھ سے چھیننا چاہا اور اس ارادے یورپ کے ہر حصہ سے فوجوں کے دل بادل اُٹھ کر بیت المقدس کی طرف بڑھے تو سلطان صلاح الدین ایوبی نے منصور کے پاس قاصد بھیجا کہ یہ اسلام کی حمایت کا وقت ہے۔ منصور ہر طرح اعانت دینے کے قابل تھا اور اعانت دینا چاہتا بھی تھا لیکن اتنی بات پر برہم ہو گیا کہ صلاح الدین نے خط میں اس کو امیرالمومنین کے لقب سے مخاطب نہیں کیا تھا۔"

اسی طرح کی لغزش ابن رشد سے ہوئی تھی جسے منصور معاف نہیں کر سکتا تھا۔

تباہی کے اسباب

ابن رشد نے اپنی یادگار چند لڑکے چھوڑے جن میں سے بعض علوم مذہب و فقہ حاصل کر کے اضلاع و قصبات کے قاضی مقرر ہوئے ان میں سے ایک جو ابو محمد عبداللہ بہت مشہور و معروف طبیب گزرا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے باپ کے حالات کے ساتھ آخر میں اس کے بھی بعض حالات درج کر دیئے ہیں۔ وہ امیر الناصر (ابن یعقوب المنصور) کا طبیب تھا۔ اور دفع امراض کے طریقہ پر اس نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ان تمام حالات سے واقف ہونے کے بعد گاٹیلس رومی کے سفر کے اس قصہ کو باور کرنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ ابن رشد کے لڑکے جرمنی کے بادشاہ ہوہنس ٹاالفلیس کے دربار میں پہنچے تھے۔ نواب عماد الملک لکھتے ہیں کہ ابن رشد کا بڑا لڑکا ابو عبداللہ علم طب میں اور چھوٹے یعنی قاضی ابوالقاسم اور ابوالحسین علوم دینی میں فائق اور صاحب اعتماد و رائے تھے۔

ابن بیطار اور عبدالملک ابن زہر کا انتقال بھی اسی سال ہوا جس برس میں ابن رشد نے وفات پائی۔ ابو مروان ابن زہر اور ابن طفیل پہلے ہی فوت ہو چکے تھے یعنی بارہویں صدی عیسوی کے آخری چند برسوں میں اندلس اور مغرب کے تمام علمائے فلسفہ کا جگمگھٹا قریباً ایک ہی زمانے میں اس دنیا

سے اُٹھ گیا۔ عبدالواحد جو خلفائے موحدین کا نامور مورخ تھا ۵۹۵ھ (مطابق ۱۱۹۸ء و ۱۱۹۹ء) میں مغرب کے سفر پر روانہ ہوا تھا اور اس نے حفید ابوبکر ابن زہر سے ملاقات کی تھی جس کی عمر اس زمانے میں بہت زیادہ تھی۔ عبدالواحد کو اس نے اپنے چند اشعار بھی سنائے۔ ۶۰۳ھ (مطابق ۱۲۰۶ء) میں مراکش کے مقام پر ابن طفیل کے لڑکے سے بھی اس کی ملاقات ہوئی جس نے اپنے باپ کے چند اشعار اسے سُنائے تھے۔ اب لوگوں کے دلوں میں اس شاندار زمانے کی صرف یاد باقی رہ گئی تھی اور وہ روز بروز کمزور اور دھندلی ہوتی جاتی تھی۔

ابن رشد کی طرف جن چیزوں نے اس کے ہم عصر علماء کو خاص طور سے متوجہ کیا وہ دو تھیں۔ ایک اس کے اخراج و تذلیل کا واقعہ تھا اور دوسری چیز بے دینی کے الزامات تھے۔ تمام مؤرخ اور مسلمان سوانح نگار اس معاملہ میں ہم زبان ہیں اور جس تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں وہ اس بات کا بہترین ثبوت ہے کہ لوگوں میں اس واقعہ نے کس قدر ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ لیکن فرانسیسی مؤرخ رینان نے ابن رشد کے سوانح حیات کو قلمبند کرتے ہوئے بعض جگہوں پر اپنے مذہبی تعصب کا بھی بین ثبوت دیا ہے۔ اس میں

شک نہیں کہ ابن رشد کے حالات لکھنے میں اس نے جس تحقیق و تلاش اور محنت و کاوش سے کام لیا ہے وہ کسی اور مورخ سے بن نہیں پڑا اور جس تشریح و تفصیل کے ساتھ موسیو رینان نے ابن رشد کے سوانح تحریر کئے ہیں ویسے اور کسی نے تحریر نہیں کیے حتیٰ کہ کوئی مورخ بھی اس کی طرح ابن رشد کا تعارف نہیں کرا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ رینان کی تصنیف ابن رشد کے بارے میں نہایت جامع مستند اور قابل اعتماد تسلیم کی جاتی ہے جیسا کہ علامہ شبلیؒ نے اس کا اعتراف کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ناقابل تردید و انکار ہے کہ بعض مقامات پر رینان کی رگ تعصب پھڑکے بغیر نہیں رہ سکی اور اسلام کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے ایسے خیالات کا اظہار کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جو اس کی روایتی ثقاہت اور دیانت پسندی کے دامن پر ایک سیاہ دھبہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے اس کی تصنیف مکمل و مستند ہونے کے باوجود معقولیت کے پایہ سے گری ہوئی نظر آتی ہے۔ موسیو رینان نے ابن رشد کے جو حالات فراہم کئے ہیں اگرچہ ان کا استناد ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے مگر مذہبی امور کی بات جہاں آئی ہے وہاں ساتھ ہی اس کی مسیحی

عصبیت بھی نکھر کر سامنے آگئی اور اس عصبیت کے جوش میں وہ غلط بیانی کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے چنانچہ ابن رشد کے اخراج اور اس پر عاید کردہ الزامات کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے رینان لکھتا ہے کہ:۔

" دیگر مذاہب کی طرح اسلام نے بھی ہمیشہ اپنے آپ کو قوی کرنے کے لیے یہ کوشش کی ہے کہ اپنے پیروؤں کو عقائد اسلامیہ پر بلا چون و چرا ایمان لانے کے لئے مجبور کرے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی آپؐ کی آسمانی رسالت پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور ابتدائی چھ ہجری صدیوں میں اسلام میں کفر و الحاد انتہائی حد تک پہنچ گیا تھا۔ زمانۂ حال میں بخلاف اس کے یہ کہا جا رہا ہے کہ عقائد مذکورہ میں نہ تو شبہ کرنا چاہیئے اور نہ ان کے ماننے میں کوئی حجت پیش کرنی چاہیئے اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ ہمیشہ عرب قوم ہی پر اس کا دارومدار رہے اس کے علاوہ چونکہ اس کی فطرت میں شک و وسواس داخل تھا۔ اور اتفاق سے ایسی قوموں کے قبضہ میں آیا

جو تعصب کی طرف طبعاً مائل تھیں جیسے ہسپانوی
بربر، ایرانی اور ترک۔ اس لیے ان نئے پیروؤں
کے ہاتھ میں پڑ کر ہمارے مذہب (عیسوی
مذہب) کی طرح سخت اور مخصوص عقائد اس
میں بھی پیدا ہونے لگے۔ اس کا نتیجہ اسلام
کے حق میں بھی وہی ہوا جو اندلس میں مذہب
کیتھولک کے حق میں ظاہر ہوا تھا"

موسیو رینان نے یہ خیالات ظاہر کر کے اپنے انتہائی تعصب
مذہبی ہی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ تاریخ
اسلام سے ناواقف ہونے کی نظیر اس سے بڑھ کر نہیں
مل سکتی جو رینان نے پیش کی ہے۔ تمام اسلامی تاریخیں
اور کتب احادیث عشق و ایمان کے ان جذبات سے بھری
پڑی ہیں جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں
میں حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق موجزن تھے
جو لوگ عربی کی کتابوں سے مدد نہیں لے سکتے انہیں مولانا
عبدالسلام ندوی کی کتاب اسوۂ صحابہؓ کو دیکھنے سے کسی قدر
اس تعلق کا اندازہ ہو سکتا ہے جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں
کو اپنے پیغمبر ہادی عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے ساتھ تھا۔ اس قسم کے واقعات کا اس قدر ہجوم

ہے کہ یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ رینان نے یہاں اسلام سے اپنی حیرت انگیز ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے عیسائی مؤرخ خواہ عالم ہوں یا جاہل بہت کم ایسے نظر آتے ہیں جو اسلام سے بغض نہ رکھتے ہوں اور جس قدر دنیا کو اسلام سے فیض پہنچا ہے اس سب سے انکار کر لینے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی حیرت انگیز ملکی ترقی تمام دنیا کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہے مگر عیسائی مؤرخین کسی طرح یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ ترقیاں اسلام کی خوبیوں کی طرف منسوب کی جائیں اس لئے وہ صحابہؓ کے متعلق اس قسم کے خیالات ظاہر کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اب جب کہ مسلمان ہر طرف پستی کی حالت میں نظر آتے ہیں تو اپنے مذہب کی سچی پیروی کی بدولت اس ذلت کو پہنچے ہیں مگر اہل اسلام اس کے برعکس سمجھتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ مذہب سے انکار و انحراف ہی نے انہیں اس خرابی تک پہنچا دیا ہے۔ یہ ان ہی کا خیال نہیں ہے بلکہ اگر کوئی شخص قرآن پاک کو پڑھے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی حالت کو اچھی طرح دیکھے اور تعصب سے کام نہ لیتا ہو تو وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے گا جو مسلمانوں نے اخذ کیا ہے اور یہی صحیح تاریخی نتیجہ ہے۔ مسیو رینان

نے جو کچھ خیال کیا ہے وہ ان کے تعصب کا نتیجہ ہے جس کی توقع ایک فلسفی آدمی سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ تہذیب نفس جو تعصب کی دشمن ہے اور فلسفہ کی تعلیم کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ افسوس ہے کہ وہ مسیحی حکماء میں کم نظر آتی ہے۔ انہوں نے علم حاصل کر لیا اور بہت سے لوگوں سے بازی لے گئے مگر نتیجہ علم یعنی تہذیب نفس سے بہت کم بہرہ ور ہوئے۔

بہر حال ابن رشد کی ذلت کے اسباب میں جہاں تک فلسفہ سے مسلمانوں کی بیزاری کا تعلق تھا اس کی بنیاد کئی نظریات پر قائم ہوئی تھی۔ مثال کے طور پر اشعریوں کے عقائد میں معقول اور منقول اور تہذیب و تعقل دونوں میں ملاپ پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی جیسا کہ بعد کو یلسنائیوں میں جاری رہی یہ عقائد سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں مصر میں اور موحدین کے زمانے میں اندلس میں بہت غالب نظر آتے تھے اور بعد کے زمانے تک اسلامی فرقوں کے سچے مذہبی اصول تسلیم کئے جاتے تھے۔ ہر طرف یہ نظر آتا تھا کہ لوگ ارسطو اور دیگر فلاسفہ کے علوم کے خلاف ایک شور مچا رہے ہیں۔ ۱۱۵۰ء میں خلیفہ المستنجد کے حکم سے ایک قاضی کے کتب خانے میں فلسفہ کی

جس قدر کتابیں تھیں، خاص طور پر ابن سینا اور اخوان الصفا کی تصنیفات سب بغداد میں نذر آتش کی گئیں۔ ۱۱۹۲ء میں عبدالسلام طبیب کو کفر و الحاد کے الزاموں سے مطعون کیا گیا اور لوگوں نے ایک ہجوم کر کے اس کی کتابیں ضائع کرنے کا قصد کیا۔ جو مولوی اس رسم کو ادا کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا وہ ایک کرسی پر چڑھا اور فلسفہ کے خلاف اس نے ایک تقریر کی۔ پھر ایک جلد کے بعد دوسری جلد ہاتھ میں لے کر چند کلمات میں ان کی شرمناک تعلیم کا ذکر کیا اور وہ کتابیں لوگوں کے حوالے کیں جنہوں نے ان کو آگ میں پھونک دیا۔ ربی یہودا جو میمونی کا عزیز شاگرد تھا اس بے باکانہ منظر کا عینی شاہد تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے مولوی کے ہاتھ میں ابن ہیثم کی ایک ہیئت کی کتاب دیکھی اور مولوی نے ان دائروں کو دکھا کر جن کے ذریعہ سے ابن ہیثم نے افلاک کے کرے نمایاں کئے تھے لوگوں سے کہا کہ دیکھو! کس قدر رنج کی بات ہے؟ کس قدر آفت ہے اور کتنی بڑی مصیبت ہے؟ یہ کہہ کر اس نے کتاب کو پھاڑ ڈالا اور آگ میں جلا دیا۔

ابن رشد کے زمانے کے فلسفی بھی اسی قسم کے مظالم کے شکار بنے تھے۔ خلفائے موحدین کو امام غزالیؒ کے

پیروؤں سے ایک نسبت تھی۔ اس خاندان کا بانی افریقہ میں امام غزالیؒ کا خاص شاگرد تھا۔ اس شخص کا نام محمد بن عبداللہ تومرت تھا۔ جس کا مختصر ذکر گزشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ یہ ایک نہایت معزز خاندان کا آدمی تھا۔ امام غزالیؒ کی خدمت میں رہ کر اس نے تمام علوم میں نہایت کمال پیدا کیا اور امام صاحب کے ایماء سے سلطنت موحدین کی بنیاد ڈالی۔ علامہ شبلیؒ نے "الغزالی" میں طبقات الشافعیہ ابن السبکی سے اس کے جو حالات نقل کئے ہیں وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

"محمد بن عبداللہ الصاصئے مغرب کا رہنے والا تھا اور اپنے وطن میں نشو و نما پائی۔ پھر مشرق کا سفر کیا اور فقہ و کلام کی تحصیل کی۔ وہ نہایت پرہیزگار، عابد اور قناعت پسند تھا۔ فارغ التحصیل ہو کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کمر بستہ ہوا۔ مصر میں پہنچا تو اس سختی سے لوگوں کو مناہی سے روکا کہ لوگ اس کے دشمن ہو گئے اور اس کو شہر بدر کر دیا۔ مصر سے اسکندریہ گیا اور چند روز وہاں اقامت کی۔ پھر بلاد مغرب

کی طرف روانہ ہوا ۵۱۲ھ میں مہدیا پہنچا اور اپنے کام میں مشغول ہوا وہاں سے چل کر بجایہ اور بجایہ سے مراکش گیا اور یہاں بھی نہایت آزادی سے امر بالمعروف کی خدمت انجام دی یہاں تک کہ خود شاہی خاندان سے معترض ہوا۔ بادشاہ وقت علی بن یوسف تاشفین نے اس کو دربار میں طلب کیا۔ دربار کے علماء نے اس سے کہا کہ ایسے عادل اور منصف بادشاہ کی حکومت سے ناراضی کی کیا وجہ بیان کر سکتے ہو؟ محمد بن عبداللہ نے نہایت جوش کے ساتھ کہا کہ کیا اس شہر میں علانیہ شراب کی خرید و فروخت نہیں ہوتی اور کیا یتیموں کے مال پر دست اندازی نہیں کی جاتی؟ اس کی پُر زور تقریر سے بادشاہ بھی متاثر ہوا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

محمد مراکش سے تمل اغمات میں آیا اور رفتہ رفتہ ایک جماعت کثیر اس کے ساتھ ہو گئی۔ پھر تینمل میں مقام کر کے قبیلہ مصامدہ

کی اعانت سے سلطنت کی بنیاد ڈالنی شروع
کی اور کامیاب ہوا۔"

یہی محمد بن عبداللہ سلطنت موحدین کا بانی اور امام غزالیؒ
کا شاگرد تھا جو بڑی شد و مد سے فلسفہ اور علمائے فلسفہ کی
مخالفت کرتا رہا۔ ابن باجہ جو ابن رشد کا اُستاد تھا اسے بھی
بے دینی کے شبہات پر محبس میں جانا پڑا اور اس طرح گویا کفارہ
ادا کرنا پڑا اور اگر لاؤن افریقی کے قول کا اعتبار کیا جائے
تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن رشد کا باپ جو اس زمانے میں
قاضی القضاۃ تھا اسی کا اثر تھا جس سے ابن باجہ کو رہائی
نصیب ہوئی۔ ابن طفیل کے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ فلسفیانہ
الحاد کا بانی مبانی تھا اور ابن رشد اور موسیٰ میمونی کا بے دینی
میں استاد بھی یہی تھا۔ اشبیلیہ کا فلسفی عبدالملک ابن واہب
جو ابن باجہ کا ہمعصر تھا مجبور ہو گیا کہ اپنے درس و تدریس کو
صرف مبادی علوم تک محدود رکھے۔ بعد میں اس نے فلسفیانہ
درس و تدریس کا سلسلہ ہی ختم کر دیا اور اس مضمون پر کلام
کرنے کی بھی ممانعت کر دی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس میں جان
جانے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو فلسفۂ مذہب کی
سطح پر اس قدر اُتار لایا تھا کہ اس کی اور دیگر حکماء کی تصانیف
میں ان اسرار کا پتہ بھی نہ ملے گا جن کی تصریح صرف اس کی

وفات کے بعد کی گئی۔ اسی طرح ابن حبیب اشبیلی کو صرف اس علت میں سزائے موت دی گئی کہ وہ فلسفہ پڑھا کرتا تھا جس مؤرخ (مقری) نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ فلسفہ کے متعلق کہتا ہے کہ یہ ایسا علم ہے جس سے اندلس میں لوگ نفرت کرتے ہیں۔ صرف راز و خلوت کے جلسوں میں اس کی تعلیم دی جاتی ہے اور جن کتابوں میں یہ علوم درج ہیں لوگ انہیں چھپا چھپا کر رکھتے ہیں۔ مطرف اشبیلی آج کل ان علوم کی تحصیل میں مشغول ہے اور اس کے ہم وطن اسے کافر سمجھنے لگے ہیں، جو کتابیں وہ تحریر کرتا ہے وہ کسی کو دکھاتا بھی نہیں۔

ابوبکر ابن زہر کی جو سوانح عمری ابن ابی اصیبعہ نے لکھی ہے وہ بھی اسی قسم کے واقعات سے لبریز ہے وہ کہتا ہے لوگ جانتے ہیں کہ منصور کے اس خیال کی کیا وجہ ہے کہ اس کی قلمرو میں فلسفہ و منطق کی جس قدر کتابیں ہیں وہ سب برباد کر دی جائیں اور یہ حکم کیسے دیا گیا کہ جو کتاب اس قسم کی ملے وہ علانیہ جلا دی جائے اور جو کوئی علوم عقلیہ (معقولات) میں دلچسپی ظاہر کرے اسے خوب سزا دی جائے۔ نیز جو کوئی ان کتابوں کو پڑھے یا اپنے کتب خانے میں رکھے اسے بھی سخت سزا دی جائے تاکہ ان علوم کا سدّ باب ہو جائے۔

پہلے پہل جب منصور کو یہ خیال پیدا ہوا تو اس نے ابوبکر بن زہر الحفید کو تعمیل حکم پہ مامور کیا۔ امیر خوب جانتا تھا کہ ابن زہر خود فلسفہ و منطق سے شغف رکھتا ہے لیکن ظاہر میں لاعلم بنا رہا۔ غرضیکہ ابوبکر نے اس کار مفوضہ کو اچھی طرح انجام دیا جو حکمت و فلسفہ کے شائقین کے لیئے بڑے صدمہ کی بات تھی۔ اشبیلیہ کے تمام کتب فروشوں کی دوکانیں اس نے چھان ڈالیں اور کوشش کی کہ ایک کتاب بھی باقی نہ رہے۔ جس اطاعت گزاری سے ابن زہر نے اس کام کو انجام دیا خود اس کے لئے فلسفہ کے شائق ہونے کی حیثیت میں کس قدر تکلیف دہ ہوا ہوگا بایں ہمہ وہ بھی خلیفہ کے سامنے الزام سے بچ نہ سکا اس لئے کہ کتب ممنوعہ کے مطالعہ کرنے والوں میں اس کا بھی شمار تھا۔

ابن ابی اصیبعہ نے ابن زہر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ جب منصور نے علوم عقلیہ کی تعلیم کو موقوف کرنے کا ارادہ کیا اور یہ قاعدہ جاری کر دیا کہ جو کوئی فلسفہ یا منطق کی کتابیں پڑھے پڑھائے یا اپنے گھر میں رکھے تو اس سے مواخذہ کیا جائے اور اگر جرم ثابت ہو تو سخت سزا دی جائے اس وقت اس نے ابوبکر ابن زہر کو اس

قانون کے اجراء کے لئے مقرر کیا۔ اس وقت کے لوگوں کو اور خود امیر کو خوب معلوم تھا کہ ابن زہر کا سارا خاندان فلسفی تھا اور دو پشت سے یہ فن اس کے گھر کا فن تھا خود ابوبکر ابن زہر بھی اپنے چچا اور بھائی کی مانند کامل حکیم تھا اگرچہ مصلحت کے پیش نظر ان علوم سے ناواقفی ظاہر کرتا تھا۔ امیر منصور کا ابن زہر کو اس خدمت کے واسطے منتخب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ امیر منصور کی ساری کارروائی مصلحت وقت اور تدبیر مملکت پر مبنی تھی۔ کہتے ہیں کہ ابن زہر نے فلسفہ اور حکمت کی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جلائیں سوائے اپنے کتب خانہ کی کتابوں کے۔ منصور خوب جانتا تھا کہ اس کا کتب خانہ معقولات کی کتابوں سے مالا مال ہے اور وہ خود علوم عقلیہ کا بڑا شائق ہے یعنی اس طرح سے گو عوام الناس کی شورش کو کم کرنے کے لئے ایک طرف کتب عقلیہ کے جلانے کا حکم دیا مگر دوسری طرف ایسی تدبیر کی کہ ایک اچھی تعداد ان کتابوں کی اس بربادی سے بچ جائے ابن زہر نے تمام کتب فروشوں کے پاس حکم بھیج دیا تھا کہ فلسفہ کی جس قدر کتابیں موجود ہوں فوراً اس کے پاس بھیج دی جائیں۔

ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے کہ ذیل کی حکایت میں نے ابو العباس احمد بن احمد اشبیلی سے سنی ہے " ابن زہر کے دو شاگرد تھے جنہیں وہ طب پڑھایا کرتا تھا۔ ایک روز مقررہ وقت پر جب کہ وہ طب کا درس لینے آئے تو ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک مختصر رسالہ دیکھا جو منطق پر تھا۔ ابن زہر نے کتاب کو چھین کر کمرہ کے ایک کونے میں پھینک دیا اور شاگرد کو مارنے کے لیئے اٹھا۔ طالب علم یہ دیکھ کر بھاگ گئے اور دو چار روز سامنے نہ آئے۔ آخر کار ایک دن جرأت کر کے حاضر ہوئے اور عذر کیا کہ ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ کونسی کتاب ہے۔ بے علمی میں ہم اسے لے آئے تھے۔ ابن زہر نے عذر قبول کیا اور فن طب کا درس جاری رکھا لیکن صرف اس قدر تفاوت کے ساتھ کہ طب پر کچھ دیر درس دینے کے بعد قرآن مجید کی چند سورتیں پڑھاتا اور حکم دیتا کہ ان سورتوں پر کتب تفسیر کا مطالعہ کریں نیز حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت حسنہ، احادیث اور دیگر مذہبی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھیں اور ارکان مذہب پر نہایت پابندی سے ادا کرتے رہیں۔ نوجوان طالب علم اپنے استاد کے احکام کی تعمیل کرتے رہے حتیٰ کہ جب

ابن زہر نے دیکھا کہ ان کے قلوب میں استعداد پیدا ہو گئی ہے تو خود جا کر منطق کی وہی کتاب اٹھالایا جو اس نے ان کے ہاتھوں میں دیکھی تھی اور کہا کہ اب تم میں اس کتاب کے پڑھنے کی قابلیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ لو! اس کے پڑھنے میں اب کوئی امر مانع نہیں ہے۔ یہ کہنے کے بعد ابن زہر ان طلبہ کو منطق کے مسائل سمجھانے لگا۔" مورخ مذکور (ابن ابی اصیبعہ) کہتا ہے کہ میں نے یہ واقعہ اس لئے بیان کیا ہے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ ابن زہر کس قدر راست باز اور پرہیزگار آدمی تھا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کہ اس قسم کے مظالم عوام الناس کو بہت پسندیدہ معلوم ہوتے تھے اور وہ امراء و حکام وقت بھی جو خود بڑے ذی علم اور فاضل ہوتے تھے مجبوراً ان مظالم کو روا رکھتے تھے۔ فلسفہ سے عوام الناس کی یہ مخالفت اندلس کے مسلمانوں کی سب سے زیادہ مخصوص صفت بیان کی جاتی ہے اور اس میں اقوام مفتوحہ کے اثرات کو محسوس کرنا کچھ دشوار نہیں معلوم ہوتا۔ مؤرخین نے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا کہ مسلمانوں کو یہ بات اندلس کے نصاریٰ کی محبت سے حاصل ہوئی کہ اندلس کے اصل باشندے

آج تک متعصب مشہور ہیں اور علمی کتابوں اور علماء کی دشمنی کرتے آئے ہیں۔ مقری کا بیان ہے کہ "اندلسی فلسفہ طبیعی اور ہیئت کے سوا تمام علوم نہایت تن دہی اور کامیابی سے حاصل کرتے تھے لیکن عوام الناس کے اندیشہ سے عام طور پر چرچا نہیں تھا۔

یہ ایک غور طلب بات ہے کہ ابن رشد جیسا شخص جس کے شاگردوں کی فہرست میں چار سو برس تک یہودی اور عیسائی ہر دو مذاہب کے پیرو اس قدر کثرت سے شامل رہے اور جس کا نام ذہن انسانی کی عظیم معرکہ آرائی میں اس حد تک بار بار سامنے آتا ہے آخر ایسے شخص نے خود اپنا کوئی فلسفہ کیوں یادگار نہیں چھوڑا؛ کیا وجہ ہے کہ وہ شخص جسے لاطینی اقوام اہل عرب میں سب سے زیادہ عظیم الشان سمجھتی تھیں اپنے ہم مذہبوں کی نظروں میں بالکل نہیں سمایا؟ جن چیزوں کو وسطی زمانے میں یورپ نے عموماً مسلمانوں سے عاریتاً لیا تھا ان پر قیاس کر کے کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ اہل عرب اپنے علوم و فنون میں سے کن چیزوں کو زیادہ اہم خیال کرتے تھے اور کن چیزوں کو کم سمجھتے تھے۔ عرب کے علماء میں سے اہل فلسفہ ہی ایسے

لوگ ہیں جن سے یورپ کی لاطینی اقوام بہ حیثیت مصنّفین کے واقف تھیں مگر ان کا ذکر عربی تصنیفات میں خال خال نظر آتا ہے۔ ابن باجہ، ابوبکر اور ابن رشد کی مسلمانوں میں کوئی شہرت نہیں ہوئی۔ اس تمام ذہنی اور دماغی ہنگامہ آرائی میں صرف ایک ہی نام ایسا نظر آتا ہے جسے واقعی قبولیت عام حاصل ہوئی یعنی ابو علی سینا اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ اندلس کا نہیں تھا اور جو تعصبی خصوصیت اہل اندلس میں تھی وہ اس کے ہم وطنوں میں نہیں تھی۔

حاجی خلیفہ کی کتاب "الفہرست" میں صحیح معقول میں فلسفہ کی بہت کم تصنیفات کا ذکر ہے خود ابن رشد کا نام حاجی خلیفہ نے محض ضمنی طور سے امام غزالیؒ کی تصنیف کے سلسلہ میں جس کی اس نے تردید کی تھی اور ابن سینا کی ارجوزہ کے ذکر میں جس کی اس نے شرح کی تھی بیان کیا ہے۔ ابن خلکان نے اور صفدی نے اپنی کتاب مشاہیر الاسلام میں ایک لفظ بھی اس کی بابت درج نہیں کیا۔ جمال الدین القفطی (۱۱۷۲ء لغایت ۱۲۴۸ء) جو اس سے ایک پشت بعد گزرا اپنی کتاب تاریخ فلسفہ میں اس کا نام بھی درج نہیں کرتا۔ یافعی اپنی کتاب مراۃ الجنان میں اور دیگر

مؤرخ اپنی کتابوں میں اس کی تاریخ وفات ۵۹۵ھ درج کر گئے صرف اس قدر اور لکھتے ہیں کہ اس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن رشد کے نام سے بھی وہ شاید آگاہ نہ تھے اس کے اہل ملک اور اہل زمانہ بمشکل اس کی کتابوں کے وجود سے آگاہ تھے۔ ابن الابار کہتا ہے کہ ابن رشد کی تمام تصنیفات یا تو علوم فقہ میں ہیں یا طب یا صرف ونحو میں۔ کتب ممنوعہ کی فہرست میں اس کی ایک فقہ کی کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس میں سے چند فقرے درج کئے گئے ہیں جو خطرناک سمجھے جاتے تھے۔ محمد بن علی شاطبی کہتا ہے کہ اس نے صرف ایک ہی کتاب لکھی ہے اور وہ بھی فقہ پر ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ابن رشد کا اہل زمانہ میں کوئی بڑا نام نہ تھا۔ ابن الابار نے اس کی مدح میں بہت کچھ لکھا ہے اور بعض کہانیوں کے سلسلہ میں جو اس کے تبحر علمی کی وجہ سے لوگوں میں مشہور ہو گئی تھیں یہ کہتا ہے کہ ان افسانوں سے اصلیت بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ ابن سعید اسے اپنے زمانے کے فلاسفہ کا امام بیان کرتا ہے چنانچہ وزیر الحافظ ابو محمد بن حزم

نے مفاخر اندلس میں جو کچھ لکھا ہے ابن سعید نے اس کے تتمہ کے طور پر کچھ ایزاد کیا ہے اور مقری نے اس کی نقل کی ہے۔ اس تتمہ میں ابن رشد کے متعلق یہ فاضل مصنف لکھتا ہے کہ

"کتب فلسفہ میں اس زمانے میں ابو الولید ابن رشد القرطبی ہمارے امام ہیں۔ باوجودیکہ بنی عبدالمومن کا تاجدار منصور ان سے اور ان کے علم سے سخت ناراض تھا یہاں تک کہ ابن رشد اسی جرم پر قید کر دیئے گئے تھے مگر پھر بھی اس فن میں ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔"

ابن ابی اصیبعہ نے تذکرہ ابن باجہ میں اس استاد اعظم (ابن باجہ) کے ساتھ صف اوّل میں صرف اسی (ابن رشد) کا نام درج کیا ہے۔ قاضی ابن مروان الباجی اپنے سوانح نگاروں کے قول کے مطابق اس کی طرف ان قابلیتوں کو منسوب کرتا ہے جو شاذ و نادر کسی کو نصیب ہوا کرتی ہیں۔ انصاری نے بہت سے ایسے لوگوں کے نام لکھے ہیں جن کے خیال میں ابن رشد کا شمار ان لوگوں میں تھا جن کے نام اسلامی ممالک میں چاروں طرف مشہور ہو

گئے تھے۔ مؤرخ یافعی بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے
کہ ابن رشد ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہا کرتا تھا اور
علوم فقہ و مذہب، طب و فلسفہ، ریاضی و منطق اور ما
بعد الطبیعات وغیرہ میں سے ہر ایک علم میں اسے
کامل دستگاہ حاصل تھی، افریقہ اور اندلس والوں کی
باہمی فضیلت کی ایک بحث کے دوران میں مقری نے
ابن رشد کا نام ان بڑے لوگوں میں لکھا ہے جنہیں اندلس
کی حمایت کرنے والا اس ملک کی برتری ثابت کرنے
کے لئے پیش کرتا ہے۔

ابن رشد کے علم و کمال کی شہرت مغرب سے نکل
کر مشرق تک پہنچ گئی تھی حتیٰ کہ موسیٰ میمونی ۱۱۹۰ء میں
اس کی کتابیں مصر میں پڑھا کرتا تھا۔ ابن حمویہ جب
مغرب میں آیا تو اس کی غرض صرف یہ تھی کہ ابن رشد
کے حالات معلوم کرے۔ چنانچہ تاج الدین ابن حمویہ کا
بیان ہے کہ میں جب اندلس گیا تو ابن رشد سے ملنا چاہا
معلوم ہوا کہ وہ معتوب سلطانی ہے اور کوئی شخص اس
سے مل نہیں سکتا۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ابن
رشد کی شہرت مشرق کے کونے کونے تک پہنچی ہوئی
تھی لیکن گردش روزگار سے جب زوال کا دور شروع

ہوتا ہے تو شہرت اور اثر دونوں بالکل مختلف چیزیں ہو جایا کرتی ہیں۔ ابن رشد کے جن شاگردوں کے نام کتب تواریخ میں ملتے ہیں یعنی ابو محمد بن حوط اللہ، ابوالحسن سہیل بن مالک، ابوالربیع بن سالم، ابوبکر بن جہور، ابوالقاسم بن عتاب اور بندودیا بن بندود ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں گزرا جسے کچھ شہرت حاصل ہوئی ہو۔ ابن رشد کے نظریات کی کسی نے شرح نہیں کی اور اس کی وفات کے بعد اس کی تصنیفات کو تھوڑے ہی لوگوں نے پڑھا۔ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ضعیف الاعتقاد ابن سبعین جو ہمہ اوست کے مسئلہ کا ماننے والا کہا جاتا ہے اور جس کی ولادت ۱۲۱۷ء میں ہوئی اس نے براہ راست کوئی چیز ابن رشد سے اخذ نہیں کی گو وہ بالکل انہی مسائل سے بحث کرتا ہے مگر اس کا قول کہیں بھی نقل نہیں کرتا۔

ابن رشد کا طریقہ درس

ابن رشد کے طریقۂ درس کے متعلق بہت ہی کم تفصیلی حالات دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کی اکثر تصانیف کی ظاہری شکل و صورت بتاتی ہے کہ اس نے تشریح و تلخیص کے لئے زبانی تقریر کا انداز اختیار کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ ابن الابار صاف طور پر کہتا ہے کہ اصلاحی رواج کے مطابق

ابن رشد لیکچر یا رواں تقریر کی صورت میں مطالب حل کیا کرتا تھا یہ تقریریں یقیناً اسی کے انتخاب وپسند سے کسی مسجد میں کی جاتی ہونگی۔ اس کا دادا آخر وقت تک ایک بڑا مستند استاد سمجھا جاتا تھا۔ لاؤن افریقی کہتا ہے کہ مشہور معروف عالم فخرالدین ابن الخطیب رازی نے ابن رشد کا نام قاہرہ میں سن کر اسکندریہ سے ایک جہاز کرایہ پر لیا تھا تاکہ اندلس میں جا کر اس سے ملاقات کرے لیکن پھر اس کی تکفیر و اخراج کا حال سن کر ارادہ ترک کر دیا۔ اپنے فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے خود اس پر بغداد میں بھی یہی مصائب ٹوٹے تھے) لیکن لاؤن کی کتاب میں ابن الخطیب کے جو حالات زندگی درج ہیں وہ اس قدر متضاد ہیں کہ اس بیان کی بھی وقعت باقی نہیں رہتی جو اوپر درج کیا گیا ہے اس بیان سے چند سطریں آگے چل کر لاؤن لکھتا ہے کہ اس کا (فخرالدین رازی کا) انتقال ابن رشد سے چوہتر سال بعد ہوا ہے بہرحال یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ فخرالدین بھی اسی محققانہ فلسفہ کا پیرو تھا جس کی بعد میں فلسفۂ ابن رشد کے نام سے لاطینی اقوام میں شہرت ہوئی۔ اس نے ارسطو اور ابن سینا پر شرحیں لکھی ہیں۔ اس کے انتقال کے بعد لوگوں

نے اس کے مکان میں ایسے اشعار پائے جن میں تقدیم عالم اور انسانی روح کے حدوث وغیرہ کے مضامین نظم کئے گئے تھے۔ جب یہ بات عوام الناس کو معلوم ہوئی تو انہوں نے اس کی قبر کھود کر خاک اڑا دی۔ لاؤن افریقی کا یہ بیان بھی حقیقت پر مبنی نظر نہیں آتا بلکہ انہی غلط بیانیوں میں سے ایک ہے جو اس نے جوشِ تعصب میں بکثرت کی ہیں۔

ابن رشد کے فلسفہ کو مسلمانوں میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے اس لئے کہ ایک طرف تو ابن رشد ان کی نگاہ میں کوئی نئی بات پیدا کرنے کی استعداد ہی نہیں رکھتا تھا جیسا کہ مدرسین سمجھتے ہیں۔ مدرسین سے مراد وسطی زمانہ کے حکمائے الٰہیات ہیں۔ یورپ میں فلسفہ الٰہیات کے مختلف مدارس اور اسکول قائم ہو گئے تھے جو مختلف مذاہب سمجھے جاتے تھے اس لئے ان کے فلسفہ کو فلسفۂ مدرسین کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مدرسین نے ابن رشد کے مذہبی عقائد سے قطع نظر کر کے اس قسم کے فلسفہ کا مطالعہ کیا اور اسی بناء پر انہوں نے اس کی استعداد کے متعلق اس قسم کا نظریہ قائم کیا۔ دوسری طرف اس کی وفات کے بعد مسلمانوں میں تحصیل علوم فلسفہ و حکمت کا چرچا ہی باقی نہیں رہا تھا۔

لوگ اس قسم کے مطالعہ کو برا سمجھنے لگے تھے ابن رشد کا حقیقی ورثہ اور فلسفۂ عرب کا سلسلہ اس کے بعد کے زمانے میں یہودیوں کے ہاتھ میں نظر آتا ہے جو موسیٰ میمونی کا متبع کہلاتے ہیں اہل اسلام میمونی کے اصول و عقائد پر بڑی سختی کے ساتھ نکتہ چینی کرتے رہے۔ مقریزی جو ایک خالص مذہبی آدمی تھا لکھتا ہے کہ موسیٰ میمونی نے اپنے ہم مذہبوں کو پکا دہریہ بنا دیا تھا اور اس سے زیادہ کوئی مذہب انبیاء اور رسولوں کے خدائی مذہب سے بعید تر نہ ہوگا۔

خود ساختہ افسانے

جس قدر کسی کا نام مشہور ہوتا ہے اسی قدر اس کی تاریخی شخصیت کے طرح طرح کے قصے اور افسانے لوگوں میں پھیل جایا کرتے ہیں جس شخص کا نام صحیح طور پر یا غلطی سے کسی خاص مذہب یا مسلک کے ساتھ منسوب ہو جاتا ہے وہ خود تو باقی نہیں رہتا مگر اس کے سوانح حیات سے اس کی شخصیت کی بجائے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں میں لوگوں نے اس کے نظریات کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ ابن رشد کو بھی اپنی شہرت کا خمیازہ ایسا ہی بھگتنا پڑا۔ ایسی سوانح عمریاں بہت کم ہونگی جن کا حجم قصوں اور افسانوں سے اس قدر ضخیم

ہو گیا ہو۔ اس قسم کے افسانوں کی تین قسمیں مقرر کی جا سکتی ہیں ایک قسم وہ ہے جس کے وضع کرنے والے عرب سوانح نگار ہیں۔ دوسری وہ ہے جس کی ایجاد کا سہرا عیسائی مؤرخین کے سر بندھتا ہے۔ جنہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ وسطی زمانے میں ابن رشد کے ساتھ الحاد و دہریت کی جو نسبت قائم کی گئی تھی اس کا تعلق باقی رکھا جائے اور ٹوٹنے نہ پائے۔ بعض افسانے ایسے بھی ہیں جو بظاہر اس شہرت کی وجہ سے ابن رشد کی طرف منسوب ہوئے جو علوم کے احیاء اور بیداری کے زمانے میں شمالی اٹلی میں ابن رشد کو حاصل ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو لوگ فلسفہ کے مختلف مذاہب یا طریقوں کے بانی ہوا کرتے ہیں ان کے ساتھ انسان کی جدت پسند طبیعت ایسی ہی شگوفہ کاریاں کیا کرتی ہے۔ ابن ابی اصیبعہ، انصاری اور لاؤن افریقی نے جن مصائب و آلام کا ذکر کیا ہے ان سے اکثر و بیشتر یہ مقصود ہے کہ ابن رشد کے ذاتی اوصاف کو ان کے ذکر سے اور جلا دی جائے اور ایسے واقعات نمایاں کر کے دکھائے جائیں جن سے اس کا صبر و ثبات، خطاؤں سے اس کا آسانی سے درگزر کرنا اور اس کی فیاضی جو علوم سے دلچسپی

رکھنے والے ہر شخص کے ساتھ بھی ظاہر ہوتی ہو۔ ان خود ساختہ کہانیوں میں جو وسطی زمانہ کے عیسائی افسانوں کے بالکل مانند نظر آتی ہیں یہ کوئی خاص بات نہیں ہے انہیں پڑھ کر بمشکل گمان ہو سکتا ہے کہ جس ذی عزت قاضی کی تصویر ان افسانوں میں کھینچی گئی ہے اور جسے انسان کامل کا نمونہ بیان کیا جا رہا ہے اس کی نسبت یہ بھی کہا جا سکے گا کہ وہ دجال کا مقدمۃ الجیش اور طریقۂ کفر و الحاد کا پیشرو تھا جس نے تینوں مذاہب کو جن سے دنیا واقف تھی ایک ہی نگاہِ حقارت سے دیکھا۔

جس قدر کہانیاں ابن رشد کی فلسفیانہ اور حکیمانہ شہرت کی وجہ سے گھڑی گئیں ان میں وہ کہانیاں سب سے زیادہ لغو اور بے سر و پا ہیں جن کا مقصد اسے ابن سینا کی تردید اور مخالفت کرنے والا ظاہر کرنا ہے حالانکہ اس سے زیادہ غلط اور غیر صحیح کوئی شے نہیں ہو سکتی اس نے شرح ارسطو میں بو علی سینا کی بعض جگہ مخالفت کی ہے خاص طور پر تہافتہ التہافتہ میں اس مخالفت کا اثر نمایاں دکھائی دیتا ہے لیکن فن طب میں اس کی مخالفت کا ذرہ برابر شائبہ بھی نہیں پایا جاتا تھی کہ ابن سینا کی ایک علمی و طبی نظم کی شرح میں ابن رشد کی ایک کتاب

موجود ہے جو اس کی مشہور طبی تصنیف سمجھی جاتی ہے
اس میں وہ ابن سینا کی بہت مدح سرائی کرتا ہے مگر
انسانی تخیل جب ایک خوبصورت اور دلفریب لبادہ
پہن کر گام زن ہوتا ہے تو کسی جگہ بھی قیام کرنا ضروری نہیں
سمجھتا چنانچہ لوگوں نے یہاں تک مشہور کر دیا کہ بو علی ابن
سینا ابن رشد کے زمانے میں قرطبہ آیا تھا اور ابن رشد
نے اپنا بغض نکالنے کے لئے اسے حد سے زیادہ
تکلیف دہ عقوبتوں اور عذابوں میں مبتلا کیا اور چرخ سے
باندھ دیا جس میں اس کا دم نکل گیا حالانکہ ان دونوں کے
مابین ڈیڑھ صدی کے زمانے کا تاریخی شہادت موجود
ہے مگر اڑانے والوں نے ایسی بے پر کی اڑائی ہے
کہ اس جرأت پر تعجب ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے اس
خوفناک نفرت کا بین طور سے پتہ چلتا ہے جو دور بیداری
اور احیائے علوم کے علماء اکابر میں پائی جاتی تھی۔ اس
زمانے میں ایک طریقہ کے دو پیشواؤں کا تصور ہی اس خیال
کے بغیر ناممکن تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہونگے
لوگوں نے افلاطون اور ارسطو کے باہمی بغض و عناد کی
ہزاروں کہانیاں گھڑ دی ہیں چنانچہ عوام نے خوشی سے
اس بات کو باور کر لیا کہ ابن رشد نے اپنے حلیف کے

ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا ہوگا جیسا وہ خود اپنے حریفوں سے کیا کرتے ہوں گے۔ دور بیداری کے اطباء میں یہ امر مسلمہ سمجھا جاتا تھا کہ ابن رشد نے اعمال طب سے کبھی واسطہ نہیں رکھا مگر اس کے باوجود وہ بیان کرتے ہیں کہ میمو روئن بادشاہ کا وہ طبیب خاص رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ لوگوں نے اس مشہور ایجاد کا سہرا بھی اس کے سر باندھ دیا کہ فصد بچوں کو بھی بے خوف و خطر کیا جا سکتا ہے۔ یورپ کے بعض علما نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اس رائے کی ابتدا ابن رشد کے ایک فقرہ کو غلط سمجھنے سے ہوئی ہے جس میں وہ اس قسم کے بھی تجربہ کو ابن زہر کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اسی طرح اس کی کلیات کے ایک فقرہ کو لوگوں نے غلط معنی پہنا دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عجیب رائے کو ابن رشد کی طرف منسوب ہی نہیں کیا گیا بلکہ بارہا اس کا اعادہ بھی ہوتا رہا کہ وہ اپنے مریضوں کے لیئے کوئی دوا تجویز نہیں کرتا تھا لیکن سب سے زیادہ مضحکہ خیز غلط فہمی جس کا ابن رشد شکار ہوا وہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ابن رشد سوئے اتفاق سے سڑک پر گاڑی کے ایک پہیہ سے کچل کر مر گیا لیکن ایک جگہ یہ بات درج ہے کہ

ابن رشد ایک چرخی کے صدمہ سے مر گیا جو اس کے پیٹ پر رکھی گئی تھی۔ یہ قصہ یا تو ایک دوسرے قصہ سے جس میں ابن سینا پر عذاب کرنے کا واقعہ اس کی طرف منسوب ہے الجھ کر اس طرح مشہور ہو گیا اور یا اس تلمیح کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہودی اپنے لباس کے ساتھ ایک زرد چیز کی چرخی بھی رکھا کرتے تھے اور ابن رشد کے متعلق بعض اوقات یہ بھی کہا گیا کہ وہ یہودی تھا ابن رشد کے فلسفہ کے پیرو یہودی فضلا کی ایک بڑی جماعت ایسی گزری ہے جنہوں نے فرطِ محبت سے یہ مشہور کر دیا تھا کہ ابن رشد بھی یہودی یا کم از کم یہودی النسل تھا۔ چنانچہ ایک یہودی مؤرخ کو اپنی نادان دوستوں کے من گھڑت قصہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ انسان جس شخص کے ساتھ محبت رکھتا ہے اسے اپنا ہم خیال و ہم مذہب ظاہر کرنا پسند کرتا ہے اور اس سے خوش ہوتا ہے۔ اسی قسم کا میلان عیسائی یا دہریہ علمائے یورپ میں اکثر نظر آتا ہے اور اس مرض سے بڑے بڑے دانشور بھی پاک نہیں۔

ابن رشد کا علم و کمال

جہاں تک ابن رشد کے ذاتی حالات کا تعلق ہے وہ مختصر اور اجمالی صورت میں بھی صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکتے کیونکہ لوگوں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی حقیقت کہانیوں اور افسانوں سے بڑھ کر کچھ نہیں اور جو کچھ وہ تھا وہ ان کہانیوں سے بہت ہی کم ظاہر ہوتا ہے البتہ ان سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے متعلق لوگوں کے خیالات کیا تھے۔ اگر ابن الابار یہ بیان نہ کرتا کہ اس شارح اعظم نے اپنی کتابوں کی تصنیف میں دس ہزار اوراق (بیس ہزار صفحے) کاغذ سے کم نہیں صرف کئے اور اگر اسی مؤرخ کے اس بیان کو مبالغہ آمیزی کا حامل سمجھا جائے کہ ابن رشد نے عنفوان شباب سے لے کر زندگی کے اختتام تک صرف دو راتیں یعنی ایک شب زفاف اور دوسری اپنے والد کے انتقال کی رات مطالعہ کے بغیر کاٹی تھیں تو بھی اس کی تصانیف کی کثرت سے یہ صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس میں کام کرنے کی عظیم الشان قابلیت موجود تھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابن رشد علوم کی تحصیل اور کتابوں کے مطالعہ میں معمولی علمائے اسلام سے زیادہ امتیاز رکھتا تھا۔ جو

کچھ دوسرے لوگ جانتے تھے ان کو یہ بھی جاننا تھا
یعنی فن طب میں جالینوس اور فلسفہ میں ارسطو اور ہیئت
میں المجسطی سے سب ہی واقفیت رکھتے تھے اور یہ
بھی ان کا ماہر تھا لیکن تحصیل کتب کے علاوہ جو چیز
اسے حاصل تھی (وہ ایک طرح کی قوت تنقید تھی۔ اس
کے خیالات اور مشاہدات میں ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو
اس کے زمانہ کے علمی افق کو منور کرنے کا باعث تھیں
علوم ممنوعہ کے علاوہ دیگر تمام نیک مسلمانوں کی طرح فقہ
میں بھی اُسے مہارت تامہ حاصل تھی حتیٰ کہ پوری موطا
اُسے حفظ تھی اور عام اہل عرب کی طرح شاعری میں
بھی کافی دسترس رکھتا تھا۔ اس زمانہ کے عربوں میں نظم
صرف طرح طرح کی قافیہ بندیوں کا نام رہ گئی تھی لیکن
اگر ابن سینا اور ابن رشد جیسی طبیعت کے لوگ بھی جنہیں
شاعری کی طرف کم میلان تھا شعر و سخن میں کچھ وقت
صرف کر لیا کرتے تھے تو اس میں کوئی تعجب کی بات
نہیں ہے۔ لاؤن افریقی کہتا ہے کہ ابن رشد نے بعض
نظمیں اخلاقی اور عشقیہ مضامین پر بھی لکھی تھیں جن کو اس
نے بڑھاپے میں جلا ڈالا تھا۔ لاؤن نے ایسی نظموں
کے بعض حصے درج بھی کئے ہیں جنہیں دیکھ کر معلوم

ہوتا ہے کہ بعض باتوں کے لحاظ سے ابن رشد میں عمر کے ساتھ ساتھ فہم و شعور بھی بڑھتا گیا تھا۔ ابن الابار کہتا ہے کہ اسے متنبی اور حبیب کے دیوان زبانی یاد تھے اور اپنی تقریروں میں بکثرت ان کے اشعار پڑھا کرتا تھا۔ ارسطو کے رسالہ "شاعری" کی اس نے جو تشریح کی ہے اس سے واقعی معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا عربی علم ادب اور خصوصاً قبل از اسلام کی شاعری سے کس قدر واقف ہوگا۔ عنترہ، امراء القیس، الاعشیٰ، ابو تمام نابغہ، متنبی اور کتاب الاغانی کے اشعار اس کے ہر صفحہ پر نظر آتے ہیں۔ اس شرح کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن رشد یونانی علم ادب سے بالکل ہی ناواقف تھا جیسا کہ توقع کی جاتی تھی۔ اہل عرب یونان کے صرف حکماء اور علمی مصنفین سے واقف تھے اور کسی ایسے مصنف کو جو یونانی ادب میں اعلیٰ ذکاوت و ذہانت کا خاص نمونہ ہو وہ بالکل نہیں جانتے تھے۔ علاوہ ازیں شاید وہ اس کے کلام کا حسن محسوس بھی نہ کر سکتے تھے۔ ان کی طبیعتوں سے جو کسی اور چیز کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھیں یہ احساس پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔

ہیئت ، ریاضی ، منطق اور ایک حد تک طب ایسے علوم ہیں جو ہر ملک کے لئے یکساں ہیں ۔ ارسطو کے قانون الطب کو دنیا کی مختلف قوموں نے رہنمائی اور ہدایت تسلیم کیا ہے مگر اس کے بر خلاف یورپ کے اکابر شعرا کی شاعری سامی اقوام کو کچھ ایسی ہی بے مزہ سی معلوم ہوتی ہے جیسے چینیوں کی نظر میں انجیل حد درجہ کی خلاف اخلاق کتاب نظر آتی ہے ۔ یورپ کا مشہور مؤرخ ہربلاٹ کہتا ہے کہ ابن رشد وہ پہلا شخص ہے جس نے یہودیوں سے بھی پہلے ارسطو کا ترجمہ یونانی سے عربی میں کیا اور ہمارے پاس ایک عرصۂ دراز تک ارسطو کی کوئی کتاب اس لاطینی ترجمہ کے سوا موجود نہ تھی جو اس حکیم الاعظم (ابن رشد) کے عربی ترجمہ سے کیا گیا تھا ۔ ابن رشد نے بعد میں اپنی شروح کا اضافہ کیا جو رسائل ارسطو کے اصل متن اور اس کی شرحوں کے ساتھ ہم تک پہنچنے سے پہلے سینٹ طامس اور یورپ کے دیگر فلاسفۂ الہیات کے استعمال میں رہی تھیں ۔ ابن رشد کی تحریروں میں عام طور پر ایسے مباحث کثرت سے پائے جاتے ہیں جن سے مضامین میں ایک قسم کی شادابی پیدا ہو جاتی ہے اور

یہ مباحث بہت دلچسپ بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات شوق علوم کے جذبہ اور حب فلسفہ کے جوش میں اس اخلاقی نقطۂ کمال تک پہنچ جاتا ہے جہاں مضمون خود بخود بولتا نظر آتا ہے۔ اس کے شروح طول طویل بے شک ہیں اور جہاں کہیں وہ اپنی طرف سے مناسب مقام پر اضافہ کرتا ہے یا اپنے خیالات موقع بموقع ظاہر کرتا ہے وہاں مصنف کی شخصیت صاف نظر کے سامنے دکھائی دیتی ہے۔

دو قسم کی شہرت

لاطینی اقوام میں ابن رشد کو دو طرح کی شہرت حاصل ہوئی ایک طبیب کی حیثیت سے اور دوسرے شارح ارسطو کے طور پر لیکن شارح ہونے کی شہرت فن طب کی شہرت سے بہت بڑھ گئی تھی فن طب میں اس کی کلیات کو جو کچھ بھی شہرت حاصل ہوئی ہو لیکن قانون بو علی سینا کی مانند استنادی حیثیت کبھی حاصل نہیں ہوئی ابن رشد نے رسائل جالینوس کی بہت سی شرحیں لکھی ہیں مگر ان میں سے ایک بھی عبرانی یا لاطینی میں ترجمہ نہ ہوئی۔ علاوہ ازیں جس طرح فلسفہ میں ابن رشد ارسطو کا شاگرد تھا اسی طرح طب میں بھی اس کا شاگرد تھا۔

چنانچہ اس نے ایک کتاب لکھی جس میں خاص طور پر یہ کوشش کی ہے کہ ارسطو کے خیالات کو جالینوس سے مطابقت دی جائے اور جہاں یہ مطابقت ناممکن نظر آئے وہاں ہر جگہ جالینوس کی غلطی ثابت کی جائے۔ ارسطو کے اصول کے مطابق ہی ابن رشد قلب کو عضو رئیس اور حیات حیوانی کا منبع قرار دیتا ہے۔

ابن رشد نے ارسطو کی کتابوں پر تین قسم کی شرحیں لکھی ہیں:

۱۔ شروح بسیط (۲) شروح متوسط (۳) ملخصات

شروح بسیط میں جو طرز اختیار کی گئی ہے وہ ابن رشد کا خالص اسلوب ہے۔ اس کے پہلے جس قدر حکماء گزرے یعنی ابن سینا اور ابو نصر فارابی، انہوں نے توضیح مطالب کی اور کوئی شرح نہیں لکھی۔ لوگ ارسطو کے متن کو مضامین کی تشریح و توضیح کے ساتھ مخلوط کر دیا کرتے تھے جس سے شرح و متن میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی تھی مگر ابن رشد شرح بسیط میں جو انداز اختیار کرتا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ارسطو کے متن کے فقرے یکے بعد دیگرے تفصیل کے ساتھ نقل کرتا چلا جاتا ہے اور ہر ایک فقرے کی

تشریح کرتا ہے اور اصل متن کو لفظ "قال" سے نمایاں کرتا جاتا ہے۔ اصولی بحثیں اس طرح کرتا ہے جس طرح کوئی متن پر اضافہ کر رہا ہو۔ ہر ایک رسالہ ابواب و فصول اور متون پر منقسم ہے۔ ابن رشد کا طریقہ مفسرین کے طریقہ سے مشابہ ہے جس میں مصنف کا کلام شارح کے کلام سے بالکل علیحدہ اور ممیز نظر آتا ہے۔ شروح متوسط میں متن کے پورے فقرے نقل کرنے کی بجائے صرف اس کا پہلا لفظ اشارے کے طور پر لکھ دیتا ہے اور پھر سارے فقرے کے مطالب کی توضیح کرتا ہے جس میں یہ تمیز نہیں ہو سکتی کہ ابن رشد کا کلام کس قدر ہے اور ارسطو کا کس قدر ہے۔

ملخصات میں ابن رشد اپنے نام سے لکھتا ہے اور متن سے بالکل تعرض نہیں کرتا۔ وہ ارسطو کے مسائل بیان کرتا ہے پھر اس میں گھٹاتا ہے اور اس پر اضافہ کرتا ہے اور اپنے خیالات کے متعلق مکمل معلومات حاصل کرنے کے لئے دوسرے رسالوں کا حوالہ دیتا ہے۔ ان ملخصات میں اس نے مضامین کی جو ترتیب اور بحث کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ اس کا اپنا ہے در اصل یہ ملخصات اپنی جگہ پر مکمل رسالے ہیں جن کے نام وہی ہیں جو ارسطو

کے رسائل کے نام ہیں۔ ان ناموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ارسطو نے ان کے ذریعہ سے انسانی طبائع پر حکومت کی ہے اور انہی ناموں کے بموجب دو ہزار سال تک دنیا میں علوم کی تقسیم کی جاتی رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ابن رشد نے شروح بسیط طبیعات کے جو ۱۱۸۶ء میں ختم ہوئی عبرانی ترجموں کے اخیر میں یہ عبارت درج ہے:۔

"میں نے یونانی میں ایک اور ترجمہ کیا جو اس سے مختصر تھا"

شروح متوسط میں وہ بار بار وعدہ کرتا ہے کہ میں ان سے زیادہ بسیط شرحیں اور لکھوں گا۔ بعض رسائل ابن رشد میں ایسی دستخطی تحریریں موجود ہیں جنہیں عبرانی مترجموں نے محفوظ رکھا ہے اور جن کی مدد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتب کا سلسلہ حسب ذیل ہے:۔

۱۱۷۱ء۔ شروح بسیط بر رسالہ "فلک و ارض" (اشبیلیہ میں لکھی گئی)

۱۱۷۴ء۔ ملخص بر رسالہ معانی و بیان و "رسالہ شاعری" شروح متوسط بر رسالہ "ما بعد الطبیعات" (قرطبہ میں لکھی گئی)

۱۱۷۶ء:۔ شرح متوسط بر رسالہ " اخلاق لقوماجس"
۱۱۷۸ء:۔ بعض حصص رسالہ " جوہر الکون" (مراکش میں لکھی گئی)
۱۱۷۹ء:۔ کشف مناہج الادلہ (اشبیلیہ میں لکھی گئی)
۱۱۸۶ء:۔ شرح بسیط بر رسالہ " طبیعات"
۱۱۹۳ء:۔ تلخیص کتاب الحمیات الجالینوس
۱۱۹۵ء:۔ مسائل فی المنطق (زمانۂ اخراج میں لکھی گئی۔

ارسطو کے جن رسائل پر ابن رشد کی شرحیں دکھائی نہیں دیتی اور کی ہی نہیں گئیں وہ " کتاب الحیوان" کے دس مقالے اور رسالہ " ریاست" (پالٹیکس) ہے۔ " کتاب الحیوان" پر ضرور اس کی کوئی شرح موجود ہو گی۔ ابن ابی اصیبعہ، عبدالواحد اور عربی فہرست تصانیف ابن رشد جو اسکوریل لائبریری میں ہے سب صاف لفظوں میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ رسالہ " سیاست" (پالٹیکس) کے متعلق ابن رشد خود بھی شرح متوسط " کتاب الاخلاق" کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ ارسطاطالیس کے اس رسالہ کا ترجمہ اندلس میں کہیں نظر نہیں آتا۔ افلاطون کے رسالہ " جمہوریت" کی شرح کرتے وقت شروع ہی میں اس نے لکھا ہے کہ ارسطو کا کوئی رسالہ اس مضمون پر میری نظر سے نہیں گزرا

اس لئے افلاطون کی کتاب کی شرح کرنی پڑی۔
ابن رشد کے لاطینی ترجموں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ رسالہ "ما بعد الطبیعات" کے بعض مقالے یعنی گیارہواں، تیرہواں اور چودھواں یہ تینوں اس کی نظر سے نہیں گزرے ہوں گے کیونکہ مذکورہ تراجم میں ان مقالات کی کوئی شرح نہیں ملتی لیکن عبرانی میں ان تینوں کی ایک متوسط شرح موجود ہے۔ بعض مؤرخین کی تحقیق یہ ہے کہ ابن رشد کے مطالعہ میں ارسطو کے ما بعد الطبیعات کا پورا متن آچکا تھا۔ جس کے بعض مقالوں کی طرف اس کے زمانے تک کوئی توجہ نہیں کی جاتی تھی۔

ابن رشد کی تصانیف

شروح بسیط کے علاوہ ابن رشد نے اور بھی کثیر التعداد کتابیں تصنیف کی ہیں اور چونکہ وہ مختلف علوم و فنون میں کمال رکھتا تھا اس لئے تمام علوم و فنون میں اس کی تصنیفات موجود ہیں لیکن ان کی پوری تعداد کا شمار کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ عرب سوانح نگاروں نے جو فہرستیں لکھی ہیں وہ سب ایک دوسری سے اختلاف رکھتی ہیں۔ اسکوریل لائبریری کے ایک عربی نسخے میں جہاں ابن سینا اور الفارابی اور ابن رشد

کی تصنیفات کی فہرست دی ہے وہاں ابن رشد کے نام کے نیچے فلسفہ، طب، فقہ اور کلام پر اٹھتر کتابیں لکھی ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ اپنی جگہ کم ہے کم پچاس کتابیں شمار کرتا ہے اور ابن الابار صرف چار ہی کا ذکر کرتا ہے بہر حال ان تمام مختلف حوالوں کی چھان بین کے بعد ابن رشد کی تصنیفات کی جو فہرست تیار ہوتی ہے وہ درج ذیل ہے :۔

فلسفہ ابن رشد نے فلسفہ پر نہایت شاندار کتابیں لکھی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :۔

۱۔ تہافتہ التہافتہ۔ امام غزالیؒ کی کتاب تہافتہ الفلاسفہ کی تردید ہے۔ ابن رشد کی اس تصنیف کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے بھی کیا ہے اور اسکوریل لائبریری کی فہرست میں بھی اس کا نام موجود ہے۔ عبرانی اور لاطینی میں بھی اس کے تراجم موجود ہیں لیکن لاطینی ترجمہ بہت غیر صحیح ہے اور غالباً اس میں تحریف بھی ہوئی ہے کیونکہ جس مسئلہ کا اس میں ذکر کیا جاتا ہے وہ بہت سے امور میں ابن رشد کے اصل مسئلہ سے کافی مختلف ہے۔

۲۔ جوہر الکون۔ موسیو رینان نے اس کتاب کا لاطینی

زبان ہی کا نام (DE SUBSTANTIA ORBES)
لکھا ہے جس کا ترجمہ نواب عماد الملک نے المقالہ جرم
السماوی" کیا ہے لیکن یونان کے مترجم نے اس کا نام
"جوہر الکون" قرار دیا ہے اور یہی علامہ شبلیؒ نے لکھا
ہے۔ اسکوریل کے کتب خانے کی فہرست میں نیز اس
فہرست میں جو ابن ابی اصیبعہ نے درج کی ہے۔ اس
نام کے کئی علیحدہ رسالے اور موجود ہیں اصل میں اس
رسالے میں ایسے مضامین درج ہیں جو مختلف زبانوں
میں لکھے گئے ہیں۔ یہ ان تصانیف میں سے ہے جو
عبرانی اور لاطینی میں بہت زیادہ مشہور ہیں۔ اس کتاب
کے ضمیمہ کی طرح "اسباب" پر ایک رسالہ عموماً نظر آتا
ہے جو اس تصنیف کے ساتھ ارسطاطالیس کی تصانیف
کے مجموعہ میں داخل کر لیا گیا ہے۔

۴۳۔ اتصال العقل بالانسان۔ اس مضمون پر دو رسالے
ہیں جن کا ذکر ابن ابی اصیبعہ کرتا ہے۔ ان میں سے ایک
رسالے کا نام لاطینی زبان میں (DE ANIMAE BEATI
TUTUDINE) ڈی اینی مابی ایٹی ٹیوڈائین ہے جس
کا نام نشاط روح ہے اور دوسرے کا نام ہے مکتوبات
بر تعلق عقل کہ مختلف است در افراد انسانی۔ یہ رسالے

عبرانی بھی موجود ہیں۔

۵۔ ایک تصنیف ہے جسے ابن ابی اصیبعہ اس طرح بیان کرتا ہے :-

هل یمکن العقل الذی فینا وهو سمی بالهیولانی
ان یعقل الصور المفارقه بآخره اولا یمکن
ذالک وهو مطلوب الذی کان ارسطاطالیس
وعدنا بالفحص عنه فی کتاب النفس وعیوت
الانبیاء

یعنی عقل ہیولانی اس قابل ہے یا نہیں کہ مختلف صورتوں کا تعقل کر سکے یہ ایک مسئلہ ہے جسے ارسطو نے اپنے رسالہ الروح میں حل کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

ابن ابی اصیبعہ کہتا ہے کہ ایک ہی رسالہ اس مسئلہ پر آیا ہے اور یہ رسالہ عبرانی میں بھی موجود ہے جس کا نام ہے "رسالہ بر عقل ہیولانی و امکان اتصال" اس کے علاوہ اس مضمون پر ایک اور لاطینی رسالہ ہے جس کے دو نسخے میری نظر سے گزرے ہیں۔ دونوں چودھویں صدی عیسوی کے ہیں اور اطالوی الاصل ہے۔ ایک تو وینس کے کتب خانہ سینٹ مارک میں ہے اور نام یہ ہے "رسالہ ابن رشد بر صفت عقل ہیولانی و عقل مجرد" دوسرا رسالہ پیرس

کے شاہی کتب خانہ (عمارت کتب قدیمہ ۱۵۱) میں ہے جس کا نام "مکتوبات بر عقل ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابن رشد نے اس اصولی مسئلہ پر چار رسالے لکھے تھے اس تعداد میں شرح بسیط کی وہ بحثیں داخل نہیں ہیں جو "کتاب الروح" کے مقالۂ سوم کی شرح میں اسی مسئلہ پر لکھے گئے ہیں۔

۶۔ شرح بر مکتوب ابن باجہ بر اتصال عقل بہ انسان۔ اس کتاب کا ذکر اسکوریل لائبریری کی فہرست میں موجود ہے۔

۷۔ مسائل بر حصص مختلفہ قانون ارسطو۔ ان مسائل کو لوگوں نے عام طور پر شروح کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ ان کے دو نسخے عبرانی زبان میں موجود ہیں۔

۸۔ رسالہ بر قیاس شرطی۔ اس کا نام بھی اسکوریل کے کتب خانہ کی فہرست میں موجود ہے۔

۹۔ مکتوبات بر محمولات اولیہ جو لاطینی نسخوں میں معقولات ثانیہ کے بعد آتے ہیں۔ ادراکی اور ذہنی قوتوں سے جو چیزیں باہر ہیں ان کو موجودات خارجی کہتے ہیں جیسے زید بکر، عمر وغیرہ۔ ان کی موجودات خارجی سے انسانی ذہن کچھ ایسے صفات تراشتا ہے جو حواس میں محسوس نہیں ہو سکتے مثلاً زید و بکر و عمر سے انسانیت کے مفہوم کا پیدا کرنا

اسی مفہوم کو معقولات اولیہ کہتے ہیں یعنی عقل کا پہلا عمل ہے کہ اس نے خارجی چیزوں سے اس کو تراش کر بنایا ہے پھر اسی ذہنی مفہوم سے ذہن ایک اور مفہوم پیدا کرتا ہے۔ مثلاً انسانیت کے کلی ہونے کی صفت پیدا کرنا اس کو معقولات ثانیہ کہتے ہیں کیونکہ یہ ذہنی تحلیل کے دوسرے درجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ لاطینی میں معقولات ثانیہ کے لئے جو لفظ ہے اس کا لفظی ترجمہ تحلیلات ثانیہ ہے۔

۱۰۔ مختصر المنطق۔ یہ رسالہ عبرانی زبان میں طبع ہوا تھا۔ بلا شبہ یہ وہی رسالہ معلوم ہوتا ہے جس کا نام ابن ابی اصیبعہ اور کتب خانۂ اسکوریل کی فہرست میں کتاب "الضروری فی المنطق"، و "مقدمہ المنطق" مذکور ہے اور عبرانی نسخوں میں بہ تعداد کثیر ملتا ہے۔

۱۱۔ "کتاب المقدمات فی الفلسفہ"۔ یہ رسالہ عربی زبان میں اسکوریل لائبریری میں موجود ہے جو حسب ذیل بارہ مقالات کا مجموعہ ہے

۱۔ المقال فی الموضوع والمحمول

۲۔ المقال فی التعریف

۳۔ المقال فی المعقولات الاولیہ وثانیہ

۴۔ المقال فی القضایا

۵۔ المقال فی القضیۃ الصادقہ و الکاذبہ

۶۔ المقال فی القضیہ الضروریہ والقضیۃ الاحتمالیہ

۷۔ المقال فی استدلال

۸۔ المقال فی النتیجۃ الصحیحہ

۹۔ المقال علی آراء الفارابی علی القیاس

۱۰۔ المقال علی القوی النفسیہ

۱۱۔ المقال علی حس السامعہ

۱۲۔ المقال علی صفات الاربعہ

۱۳۔ شرح بر "جمہوریت افلاطون"۔ اس کا ذکر اسکوریل کے کتب خانہ کی فہرست میں موجود ہے اور اس کے عبرانی اور لاطینی تراجم موجود ہیں۔

۱۴۔ ابو نصر فارابی نے اپنے رسالہ منطق میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں نیز اس مضمون پر جو ارسطو کے خیالات ہیں ان دونوں کی ابن رشد نے توضیح کی ہے اور محاکمہ بھی کیا ہے اس رسالہ کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے اور غالباً اسکوریل کے کتب خانہ کی فہرست میں بھی اس کا ذکر ہے)

۱۵۔ الفارابی کی کتابوں پر مختلف شروح نیز فارابی نے جو قانون ارسطو کی توضیحات کی ہیں ان کی بھی شرح۔ اسکوریل کے کتب خانہ کی فہرست میں ان کا پتہ ملتا ہے۔

۱۶۔ الفارابی نے ارسطو کی کتاب البرہان (معقولات ثانیہ) کی جہاں تک کہ رتبہ، قوانین، قیاس اور تعریفات کا تعلق ہے جو تنقید کی ہے اس پر بھی ابن رشد کا ایک رسالہ ہے اور ابن ابی اصیبعہ کی دی ہوئی کتابوں کی تفصیل میں اس کا ذکر ہے۔

۱۷۔ ابن سینا نے موجودات کی جو تقسیم کی ہے یعنی جو علی الاطلاق ممکن ہیں اور وہ جو بذاتہ ممکن ہیں اور وہ جو واجب بالغیر ہیں اور جو واجب بذاتہ ہیں اس کی تردید میں ابن رشد نے ایک رسالہ لکھا ہے جو عبرانی زبان میں پیرس کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ابن اصیبعہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۔ ما بعد الطبیعات نقولاس کی ایک متوسط شرح ہے جس کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے اور اسکوریل لائبریری کی فہرست میں بھی اس کا نام ہے اس میں نقولاس دمشقی کے اولیات (فلسفۂ اولیہ) پر بلاشبہ بحث کی گئی ہے۔ نقولاس کے کلام کو فلاسفہ عرب خاص طور پر ابن رشد اکثر نقل کیا کرتا ہے اور ارسطو کے رسالہ ہائے ما بعد الطبیعات میں جو ترتیب تھی اسے اُلٹ دینے کی وجہ سے اکثر اعتراض کرتا ہے۔

۱۹۔ اس مسئلہ پر کہ آیا خدا کو جزئیات کا علم ہے یا نہیں ایک رسالہ موجود ہے۔ جس کا نام کتب خانہ اسکوریل کی فہرست میں موجود ہے۔

۲۰۔ ایک رسالہ قدوم و حدوث پر ہے جس کا ذکر فہرست مذکور میں موجود ہے۔

۲۱۔ ما بعد الطبیعات کے وہ مختلف مسائل جن پر بو علی سینا نے اپنی کتاب شفا میں بحث کی ہے ان کے متعلق اس کی جو تحقیقات ہے وہ ایک رسالہ کی صورت میں ہے اور ابن ابی اصیبعہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔

۲۲۔ ارسطو کے براہین متعلقہ وجود مادۂ اولی پر شک کرنے کی نادانی کو ایک رسالہ میں ظاہر کیا ہے اور اس بات کا بین ثبوت دیا ہے کہ ارسطو کے براہین اس مضمون پر حقائق نفس الامری ہیں۔ اس رسالہ کا ابن ابی اصیبعہ نے ذکر کیا ہے۔

۲۳۔ مسائل فی الفلسفہ

۲۴۔ مقالہ فی العقل والمعقول۔ عربی زبان میں یہ مقالہ اسکوریل لائبریری میں موجود ہے۔ یہ رسالہ شاید وہی ہے جس کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے اور جسے غلط فہمی سے ابن رشد کے رسالہ نشاط روح کا حصہ ثانی ہی سمجھا گیا

ہے۔

۲۵۔ اسکندر افریدوسی کے رسالہ عقل کی شرح ۔ اس کا نام فہرست کتب خانہ اسکوریل میں ہے۔ یہ رسالہ عبرانی زبان میں موجود ہے۔

۲۶۔ کتاب النفس بصورت سوال و جواب

۲۷۔ رسالہ مذکورہ الصدر کے علاوہ دو رسالے حکمت نفس پر اور ہیں۔

۲۸۔ مسائل علی الفلک والارض۔

کتب سیر و نسخہ جات کتب سے جن کتابوں کے نام معلوم ہوئے ہیں ان میں غلطی واقع ہوئی ہے اور ایک ایک کتاب کو دو دو دفعہ شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ وجود باری تعالی خلق عالم پر جو مضامین ہیں وہ امام غزالی کے ہیں۔ اور مختلف کتب خانوں میں بزبان عبرانی موجود ہیں۔ تولید حیوانی پر ایک رسالہ ہے جس میں تولد و توالد سے کمتر بحث کی گئی ہے اور قبول فساد کے طریقہ پر زیادہ بحث ہے یہ رسالہ جو شاہی کتب خانہ کی فہرست میں موجود ہے در اصل "ما بعد الطبیعات" کے مقالہ دوازدہم کی شرح میں کا ایک انتخاب ہے۔ رسالہ بر تغیرات طبعی حسب فلاسفہ قدیم مع توضیحات ابن رشد، رسائل جو مدار ستارہ

رویت و ستارہ یلنی۔ غذا اور طوفان کی بابت مختلف مضامین پر ہیں: شروح رسالہ حی ابن یقظان ابن طفیل، شرح رسالہ حیات المتنزل لابن باجہ کو بھی بعض مؤرخین نے ابن رشد کی طرف منسوب کیا ہے مگر اس کی بنیاد صرف موہوم و غیر مستند حوالہ جات پر ہے۔ ہربلاٹ نے بھی غلطی سے ایک سیاسی رسالہ موسولہ بہ سراج السلاطین کو ابن رشد کی طرف منسوب کیا ہے لیکن اس کا مصنف در اصل ابوبکر محمد طرطوسی ہے اور ابن رشد کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے

علم کلام و مذہب

علم کلام و مذہب کے متعلق ابن رشد کی تصانیف یہ ہیں

۱۔ فصل المقال فی ما بین الحکمۃ والشریعۃ من الاتصال۔ اس کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے بھی کیا ہے۔ اس کا عربی نسخہ کتب خانۂ اسکوریل کے قلمی نسخہ سے نقل کر کے ایم۔ جی مولر نے میونخ کے مقام سے طبع کرایا ہے اور ایک نسخہ عبرانی زبان میں قلمی پیرس اور لندن میں موجود ہے۔

۲۔ مذکورہ بالا رسالہ کا ماحصل یعنی اس کا ایک ضمیمہ اسی نسخہ میں موجود ہے اور اسکوریل کے کتب خانہ میں

ہے اس کے علاوہ ایم۔جی۔مولر نے بھی طبع کرایا ہے۔

۳۔ ایک مقالہ جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ وجود عالم پر متکلمین اور مشائین (ارسطو کے متبعین) کے اعتقادات درحقیقت ایک دوسرے سے بالکل ملتے جلتے ہیں اس کا ذکر بھی ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے اور اسکوریل کے کتب خانہ کی فہرست میں بھی اس کا نام ہے۔

۴۔ مناہج کشف الدولہ۔ اس کتاب کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے اور اسکوریل کی فہرست میں مذکور ہے اسکوریل میں اس کا ایک عربی نسخہ ہے اور کتب خانہ شاہی پیرس میں نیز لندن میں اس کا عبرانی نسخہ بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایم۔جی مولر نے اس کتاب کو بھی طبع کرایا ہے

۵۔ شرح عقیدۂ امام مہدی۔ اس کا ذکر اسکوریل کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کتاب میں ابو عبداللہ محمد بن تومرت بانی سلسلہ موحدین یا مہدی الموحدین کے عقائد مذہب کا حال ہے

فقہ و اصول فقہ

ابن رشد چونکہ بہت بڑا فقیہ تھا اور مدتوں قاضی القضاۃ کے

منصب پر فائز رہا اس لئے اس نے فقہ میں ایسی عظیم الشان کتابیں لکھیں جو سب کی سب مقبول و متداول اور فقہ مالکی کے ضروری ارکان میں شمار ہوتی ہیں ان کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں :-

۱۔ بدایۃ المجتہد و نہایت المقتصد۔ ابن الابار ، محمد بن علی شاطبی اور ابن ابی اصیبعہ نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے اور اسکوریل کی فہرست میں بھی اس کا نام درج ہے علامہ شبلی کے بیان کے مطابق اس کتاب میں ابن رشد نے ہر مسئلہ کے دلائل اور وجوہ قلمبند کئے ہیں ابو جعفر ذہبی کا قول ہے کہ فقہ میں اس سے بہتر کتاب ہم نے نہیں دیکھی۔ نفح الطیب میں ابن سعید کا قول اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ "کتابٌ جلیلٌ معظمٌ عند المالکیۃ" یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر کتاب المعتقد کے نام سے کیا گیا ہے۔

۲۔ خلاصۃ المستصفٰی یعنی امام غزالیؒ کی کتاب المستصفٰی جو فقہ پر ہے اس کا اختصار۔ ابن الابار نے اس کا ذکر کیا ہے اور اسکوریل کے کتب خانہ کی فہرست میں بھی اس کا نام موجود ہے۔ مقری لکھتا ہے کہ مؤرخ ابن سعید نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۳- النظر فی اغلاط الکتب الفقہیہ - یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور اس کا ایک عربی نسخہ اسکوریل کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کا ذکر لاؤن افریقی نے بھی کیا ہے۔

۴- اسباب الاختلاف - یہ کتاب بھی تین جلدوں میں ہے اور اس کا بھی ایک عربی نسخہ اسکوریل کے کتب خانہ میں ہے۔

۵- اصول فقہ کا نصاب کامل - یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اسکوریل کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ایک مستقل کتاب منہاج الدولہ بھی ہے۔

۶- رسالہ اضحیہ - یہ رسالہ عید اضحیٰ اور قربانی کے مسائل پر لکھی گئی ہے اور ان مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

۷- رسالہ عشر - عشر کے مسائل سے متعلق ہے

۸- ایک رسالہ بادشاہوں، حاکموں اور سود خواروں کے ناجائز منافع پر ہے جس کا نام فرائض السلاطین والخلفاء ہے۔ ابن ابی اصیبعہ کے بیان کے مطابق یہ کتاب ابن رشد ہی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ ابن ابی اصیبعہ فقہ کی ایک اور کتاب کا بھی ذکر کرتا ہے جس کا نام

"کتاب التحصیل" ہے۔ اس میں صحابہ کرام، تابعین محترم اور تبع تابعین مکرم کے فقہی اختلافات اور ان کے دلائل لکھے گئے ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ ایک اور کتاب کا نام لیتا ہے۔ جس کا نام مقدمۃ الفقہ ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ "ہم نے یہ کتاب سید محمود مرحوم کے لئے کتب خانۂ خدیویہ سے نقل کرا کر منگائی تھی۔ خیال تھا کہ ایک فلسفی فقہ کے فن کو لکھے گا تو کیونکر لکھے گا لیکن کتاب کو پڑھ کر ہم کو کچھ استعجاب نہیں ہوا بے شبہ فقہ کی اور کتابوں کی بہ نسبت وہ زیادہ صاف مرتب اور قریب الفہم ہے لیکن فلسفیانہ تدقیقات کا پتہ نہیں۔ ابو زید دبوسی کی کتاب الاسرار ہم نے دیکھی ہے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے"۔

یہ دونوں کتابیں ابن ابی اصیبعہ نے ابن رشد کی تصنیفات لکھی ہیں مگر موسیو رینان کہتا ہے کہ یہ کتابیں ابن رشد کے دادا ابو الولید اکبر کی تصنیف ہیں لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا البتہ ابن رشد کے نام کے چونکہ تین فقیہہ گزرے ہیں خاص طور سے وہ جو سنہ ... ھ میں تھا اور جس کی تصنیفات اسکوریل کے کتب خانہ

یں موجود ہیں۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان کے ناموں اور تصنیفات میں غلط ملط ہو گیا ہو۔

علم ہیئت

علم ہیئت میں ابن رشد کی تصانیف یہ ہیں جو بہت بڑی شہرت رکھتی ہیں:۔

۱۔ مختصر المجسطی۔ اسکوریل کے کتب خانہ کی فہرستوں میں کتابوں کے ساتھ مصنفین کے نام اور مختصر حالات بھی درج ہیں ان میں اس کا نام بھی ہے۔ اکثر کتب خانوں میں یہ عبرانی زبان میں موجود ہے اس کا ترجمہ لاطینی میں کبھی نہیں ہوا۔

۲۔ اسکوریل کی فہرست میں جو نوٹ درج ہیں ان میں ایک اور تصنیف کا ذکر ہے جس کا نام "الضروری من کتاب اقلیدس من المجسطی" مصنف کا نام مشتبہ ہے۔ میرے خیال میں یہ لفظ کلاڈیس ہے جو کہ اہل عرب بطلیموس کے ساتھ اضافہ کیا کرتے تھے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو کیا یہ کتاب اور مذکورہ بالا کتاب دونوں ایک ہی نہیں ہیں؟

۳۔ مقالہ فی حرکتہ الاکبر فلکیہ۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسکوریل کی فہرست میں بھی اس کا نام

ہے۔

۴۔ مقالہ فی تدویر ہیئۃ الافلاک والثوابت یعنی افلاک و نجوم کی گردی شکل پر ایک رسالہ ہے جس کا نام اسکوریل کی فہرست میں ہے۔ شروح بسیط کے حصۂ ثانی میں جو مقالہ "الفلک" کی شرح میں ہے اس میں ابن رشد لکھتا ہے کہ میں علم ہیئت پر انشاء اللہ تعالیٰ ایک کتاب لکھوں گا جو ارسطو کے زمانہ میں تھا تاکہ تمام مبتدع اصولوں کا قلع قمع ہو جائے اور طبیعات ارسطو کے ساتھ ہیئت کا تعلق واضح ہو جائے۔

صرف و نحو صرف و نحو پر ابن رشد نے صرف دو کتابیں لکھیں جو نہایت جامع، مفصل اور مبسوط ہیں۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ کتاب الضروری من الصرف والنحو۔ اس کا ذکر ابن الابار نے کیا ہے اور اسکوریل کی فہرست میں بھی اس کا نام ہے۔

۲۔ المقال فی الفعل والاسماء المشتقات۔ اسکوریل کے کتب خانہ میں اس کا ذکر ہے۔

علم طب علم طب میں ابن رشد کی تصنیفات بڑی کثرت سے ہیں اور اس قدر میں اس نے

بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ اس کی طبی تصانیف دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو اس نے بطور خود لکھی ہیں اور دوسری وہ ہیں جن میں اس نے یونانی تصانیف کا خلاصہ یا شرحیں کی ہیں اس کی اپنی لکھی ہوئی کتابیں یہ ہیں :۔

۱۔ "الکلیات" ابن رشد کی طبی تصانیف میں یہ کتاب نہایت جامع اور محققانہ ہے اور اس فن میں اس کی سب سے بڑی تصنیف ہے جس میں فن طب کے کل نصاب کو سات جلدوں میں ختم کیا گیا ہے۔ ان جلدوں میں سے دوسری، چھٹی اور ساتویں تینوں جلدوں کو ملا کر اس کا نام مجموعہ طب نام رکھا ہے۔ رسالہ حفظان صحت جو عربی زبان میں ہے کتب خانہ اسکوریل میں موجود ہے یہ بھی کلیات کا ایک حصہ ہے اس تصنیف کا ذکر ابن الابار اور ابن ابی اصیبعہ نے بھی کیا ہے۔

۲۔ مقالہ فی المزاج۔ یہ ایک مکمل رسالہ ہے۔

۳۔ مقالہ فی النوائب الحمی۔ یہ بھی نہایت جامع رسالہ ہے

۴۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔

یونانی تصنیفات کے خلاصوں اور شرحوں پر مشتمل کتابوں کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

۱۔ ابن سینا کی ایک طبی نظم موسومہ بہ "ارجوزہ" کی ایک

شرح ہے جو ابن رشد کی مشہور ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور اسکوریل کے کتب خانہ کے علاوہ آکسفورڈ، لیڈن اور خاص کر پیرس میں بھی موجود ہے۔

۲۔ مقالۃ فی التریاق۔ ابن رشد خود اس کتاب کا حوالہ اپنی کلیات میں دیتا ہے۔ اس کا عربی نسخہ اسکوریل کتب خانے میں اور عبرانی و لاطینی کے نسخے اکثر کتب خانوں میں ہیں۔

۳۔ اجوبہ یا نسخہ جات زحیر (پیچش) عبرانی زبان میں اس کا نسخہ لنڈن میں موجود ہے۔

۴۔ تلخیص کتاب الحمیات لجالینوس
۵۔ تلخیص کتاب القوی الطبیعہ لجالینوس
۶۔ تلخیص کتاب العلل والاعراض لجالینوس
۷۔ جالینوس کی ایک اور کتاب کی تلخیص
۸۔ تلخیص کتاب الاسطقسات لجالینوس (عناصر)
۹۔ تلخیص کتاب المزاج لجالینوس
۱۰۔ تلخیص کتاب الادویہ المفردہ لجالینوس
۱۱۔ جالینوس کے بعض دیگر رسائل کی تلخیص

ابن ابی اصیبعہ نے اس فہرست کے علاوہ جالینوس کے رسائل کی جن تلخیصات کے نام درج کیے ہیں، وہ

یہ ہیں :-

۱۲- تلخیص کتاب التعرف لجالینوس

۱۳- تلخیص اول الکتاب الادویہ المفردہ لجالینوس

۱۴- تلخیص نصف الثانی من کتاب حیلۃ البرء لجالینوس

ابن ابی اصیبعہ نے رسائل جالینوس کی ان تمام تلخیصات کا ذکر کیا ہے اور کتب خانہ اسکوریل کی فہرست میں بھی ان کے نام درج ہیں۔

۱۵- المقال فی الامزجۃ المختلفہ۔ عربی زبان کی یہ کتاب اسکوریل کے کتب خانہ میں ہے اور بلا شبہ وہی رسالہ ہے جس کا نام اوپر کی فہرست میں "المزاج" لکھا گیا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جالینوس کی اسی نام کی ایک کتاب کی شرح موجود ہے جو ایک اور تصنیف ہے۔

۱۶- کتاب الامزجہ۔ اس کا نام بھی اسکوریل کی فہرست میں ہے۔

۱۷- مقالۃ المفردات۔ یہ کتاب عبرانی زبان میں ہے اور "تلخیص کتاب الادویہ المفردہ لجالینوس (رسالہ ۱۳) سے مختلف ہے نیز اس رسالۃ المفردات سے بھی مختلف ہے جو لاطینی زبان میں طبع ہوا ہے اور جو کلیات کی

جلد پنجم سے ماخوذ ہے۔

۱۸۔ المقالۃ فی المنطقۃ الحیوانیہ۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ لاطینی زبان میں کلیات کے حصۂ نہم مطبوعہ ۱۵۶۰ء کے ساتھ طبع ہوئی تھی اور اسکوریل کی فہرست میں اس کا ذکر ہے۔

۱۹۔ قوانین الادویہ المجلیہ۔

۲۰۔ مسئلہ فی نوائب الحمیٰ۔ اس کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے۔

۲۱۔ مقالہ فی الحمیات العفنہ۔

۲۲۔ المراجعات و المباحث بین ابی بکر ابن طفیل و بین ابن رشد فی رسمہ الدواء فی کتابہ الموسوم بالکلیات

دیگر قلمی نسخہ جات اور ان طبی کتابوں سے جو احیائے علوم کے زمانے میں جمع کی گئیں۔ نیز علمی کتابوں کی فہرست دینے والوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایسے لاطینی ترجمۂ متن موجود ہیں یا بعض ایسے رسائل کا پتہ ملتا ہے جن پر ابن رشد کا نام درج ہے لیکن ان کی نسبت یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انہی کی تصنیفات سے ہیں یا نہیں مثلاً الربط بین ارسطو و جالینوس فی تولید الدم اور اسرار بقراط بحث بہ آغاز صحت بعد از بخار۔

قلمی نسخے اور عربی متون

ابن رشد کو مسلمانوں میں بہت کم شہرت
حاصل تھی اور اس کی وفات کے بعد ہی سے فلسفہ
کی تعلیم میں بہت تیزی کے ساتھ انحطاط شروع ہوا
یہی وجہ ہے کہ اس کی تصنیفات کے عربی نسخے بہت
کم شائع ہوئے اور مشکل ہی سے اندلس کے باہر
کہیں گئے۔ عربی کی علمی کتابوں کی ہولناک بربادی جو
کارڈنل زمی نیز کے حکم سے عمل میں آئی تھی اس
سے تمام علمی ذخائر تباہ ہو گئے۔ کارڈنل زمی نیز اندلس
کا کارڈنل تھا (CARDINAL XEMENES) یہ وہ شخص
تھا جس نے اہل عرب کی شکست کے بعد فرڈی
ننینڈ بادشاہ کی مدد سے مسلمانان اندلس پر بہت مصیبتیں
توڑی تھیں۔ تواریخ میں مذکور ہے کہ غرناطہ کے شارع
عام پر جو کتابیں جلا دی گئیں ان کی تعداد شمار میں اسی
ہزار تھی۔ اس تباہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شارح اعظم کی
تصنیفات کے اصلی متون بالکل نادر الوجود ہو گئے۔ جو
قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں وہ سب مراکی حروف
میں ہیں۔ فلارنس کے نسخے میں قانون کی شرح متوسط
اور "معانی و بلاغت" و "شاعری" کی تلخیص موجود ہے یعنی

ارسطو کی منطقی تصانیف کی شروح کا ایک مجموعہ ہے
اس خوبصورت نسخہ میں لاطینی ترجمہ کے مقابلہ میں کچھ زیادہ
فرق نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ یہ فرق تلخیص رسالہ "معانی
و بلاغت" خاص کر رسالہ "شاعری" میں زیادہ بین ہو۔ یہ
ظاہر ہے کہ اس نسخے کے طبع ہونے سے علوم مشرقی
کے شائقین کو کتنی قدر ہوگی۔ جو دو ترجمے پیش نظر ہیں
ان میں ہرمان ڈی اڈمنڈ (HERMANN D'ADEMAND
کا ترجمہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا اور ابراہام ڈی بالمیز
(EBRAHAM DE BALMES) کا ترجمہ متن سے بہت مختلف
ہے۔ یعنی عبرانی مترجم نے وہ عربی مقولے یا مثالیں
جو خود ابن رشد نے اصل یونانی متن میں یونانی مثالوں
کی بجائے داخل کر دی تھیں انہیں یا تو بالکل حذف کر
دیا یا ان کی بجائے وہ شواہد درج کر دیئے ہیں جو یہودیوں
میں معروف ہیں۔ میڈرڈ کا کتب خانہ اسکوریل اور فلارنس
کا کتب خانہ لارنشین صرف یہی دو مقام ہیں جہاں یورپ
میں ابن رشد کی کتب فلسفہ کے عربی متون کا کچھ حصہ
موجود ہے۔ چند مختصر رسالے ایسے بھی موجود ہیں جن
کے نام مقدمات الفلسفہ ہے۔ اسی میں وہ اہم رسائل
بھی ہیں جو فلسفہ اور مذہب کے باہمی ربط پر اس نے

لکھے ہیں۔ ایک رسالہ "الروح" پر شرح ہے اور ایک کا نام "مقالۃ فی العقل والمعقول" ہے اور ابن رشد کی تصنیفات کی ایک مکمل فہرست بھی ہے۔ حاجی خلیفہ یا امام غزالیؒ کی تہافۃ الفلاسفہ کی وجہ سے ابن رشد کی تہافتہ التہافتہ عربی میں باقی رہ گئی۔ ان کے علاوہ عربی حروف میں ابن رشد بعض عربی کتابوں کے نسخے یہودیوں کے پڑھنے کے لئے لکھے جو اب بھی باقی ہیں۔ پیرس کے شاہی کتب خانے میں انہی حروف میں رسالہ "القانون" کا ایک اختصار موجود ہے اور مقالۃ التولید الکون والفساد، شہاب ثاقب اور کتاب النفس پر شرح متوسط ہیں اور اجسام صغیرہ طبیعہ پر ایک ملخص موجود ہے۔ آکسفورڈ کی باڈلین لائبریری میں بھی انہی حروف میں مقالہ فی "الافلاک" و فی "شہاب الثاقب" موجود ہے۔

ابن رشد کی طبی تصانیف فلسفہ کی کتابوں کے مقابلہ میں اس قدر نادر الوجود نہیں۔ اسکوریل لائبریری میں شرح ارجوزہ ابن سینا کے کئی ایک قلمی نسخے موجود ہیں اور جالینوس کے رسائل کی شرحیں، رسالہ تریاق اور شاید کلیات کے بھی نسخے ہیں۔ باڈلین لائبریری، لیڈن کے کتب خانے

اور پیرس کے کتب خانے میں بھی شرح ارجوزہ ابن سینا کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ جس قدر ابن رشد کی تصانیف کے عربی نسخے ہمارے یورپی کتب خانوں میں نادر الوجود ہیں اسی قدر ان کے عبرانی ترجمے بکثرت موجود ہیں۔ صرف شاہی کتب خانۂ پیرس کی قدیم عمارت میں قریباً پچاس نسخے ہیں۔ وائنا کے کتب خانہ میں کم سے کم چالیس نسخے ہیں۔ ایچ۔ ڈی روزہی کی جمع کردہ کتابیں اٹھائیس سے زیادہ ہیں۔ عبرانی کے قلمی نسخہ جات میں انجیل کے بعد کسی کتاب کی اتنی کثرت نہیں جس قدر ان کی ہے۔ ابن رشد کے لاطینی ترجمے بھی بکثرت ہیں۔

مطبوعہ نسخے ابن رشد کے عربی متون کا کوئی جزو ۱۸۵۹ء تک طبع نہیں ہوا۔ اسی سال میں موسیو جے۔ مولر نے اکاڈمی آف سائنسز کی سرپرستی میں میونخ کے مقام پر الربط بین المذہب و الفلسفہ کے تین مقالے طبع کرائے جو اسکوریل لائبریری کے قلمی نسخوں میں شامل تھے۔ فاضل ایڈیٹر نے ایک مقدمہ اور دیگر تشریحات لکھنے کا وعدہ فرمایا تھا جس کے ایفا کی نوبت نہ آئی۔ ابن رشد کی دو کتابیں یعنی

مختصر المنطق اور مختصر الطبیعات ۱۵۶۰ء میں ریوا کے مقام پر عبرانی زبان میں طبع ہوئیں۔ موسیو گولڈن تھال نے ۱۸۴۲ء میں لپزگ کے مقام پر "شرح معانی و بلاغت" کا عبرانی ترجمہ طبع کرایا تھا۔

ابن رشد کے کامل یا ناقص لاطینی ترجمے جو ۱۴۸۰ء اور ۱۵۸۰ء کے مابین شائع ہوئے وہ بے شمار ہیں۔ کوئی سال ایسا نہیں جاتا تھا جب ایک نیا ایڈیشن شائع نہ ہوتا ہو۔ صرف ایک وینس میں پچاس تک کتابیں شمار میں آتی ہیں جن میں سے چودہ یا پندرہ کم و بیش مکمل تھیں۔ پیڈوا (اٹلی) کو یہ عزت حاصل ہے کہ اس نے دنیا میں سب سے پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ ۱۴۷۲ء، ۱۴۷۳ء اور ۱۴۷۴ء میں اس شہر میں ارسطو کے مختلف رسائل مع شروح ابن رشد شائع ہوئے۔ ۱۴۸۱ء میں وینس کے مقام پر مقالہ "شاعری" پر ملخص رسالہ "بلاغت و معانی" الفارابی کی تشریحات کے ساتھ شائع ہوا ۱۴۸۲ء میں "الکلیات" اور رسالہ "جوہر الکون" شائع ہوئے۔ ۱۴۸۳ء و ۱۴۸۴ء میں ارسطو کی تمام تصنیفات ابن رشد کی شرحوں کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کی گئیں جو اب بالکل نادر ہیں۔ ۱۴۸۹ء میں ایک دوسرا

ایڈیشن دو یا تین جلدوں میں شائع ہوا۔ پھر ایک کے بعد دوسری مطبوعات مسلسل شائع ہونے لگیں۔ ۱۴۹۵ء، ۱۴۹۶ء، ۱۴۹۷ء اور ۱۵۰۰ء کے سنوں میں کم و بیش مکمل ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ کلیات ارسطو وینس میں اپنے شارح کے بغیر گویا کبھی طبع نہ کی جائے گی لیکن مجلس اندلس (جن جنٹرا نے جو اندلس میں اعلیٰ ملکی مجلس کے طور پر مسیحیوں کے زمانے میں قائم ہوئی تھی بڑی سرعت کے ساتھ تمام سولہویں صدی عیسوی میں یکے بعد دیگرے ابن رشد کی مطبوعات شائع کیں جو سب سے زیادہ اچھی اور دور دور پھیلی ہوئی تھیں وہ اسی مجلس کی تھیں جو ۱۵۵۳ء میں شائع کیا گیا۔

اگرچہ وینس نے بقول شخصے ابن رشد کی تصانیف شائع کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا لیکن بعض دوسرے شہر بھی ایسے ہیں جہاں اس کی طبی تصانیف اور رسائل فلسفہ کی جلدیں الگ الگ شائع ہوتی رہیں، مثلاً بولون میں ۱۵۰۱ء، ۱۵۲۳ء اور ۱۵۸۰ء میں ان کتابوں کی اشاعت ہوئی۔ ریمنۃ الکبری میں ۱۵۲۱ء اور ۱۵۳۹ء میں، پادیا میں ۱۵۰۷ء اور ۱۵۲۰ء میں، اسٹراسبرگ میں ۱۵۰۳ء

اور ۱۵۳۱ء میں اینیلز میں ۱۵۷۰ء اور ۱۵۷۴ء میں جینوا میں ۱۶۰۸ء میں شائع ہوئیں۔ لیانن میں بھی ایک مکمل ایڈیشن ۱۵۲۴ء میں شائع کیا گیا۔ علاوہ ازیں دیگر غیر مکمل ایڈیشن کثرت سے ۱۵۱۷ء، ۱۵۳۱ء، ۱۵۳۷ء اور ۱۵۴۲ء میں اشاعت پذیر ہوئے سولھویں صدی عیسوی کے اختتام پر یہ ایڈیشن رفتہ رفتہ کم یاب ہوتے گئے اور صرف چند طبی رسالے باقی رہ گئے جو بعد میں طبع ہوتے رہے مگر سترھویں صدی میں یہ تمام لا تعداد جلدیں گرد فراموشی میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئیں۔

ابن رشد کی تصنیفات کی کثرت، تنوع، جدت مضامین تحقیق و تنقید جس قدر حیرت انگیز ہے اس سے زیادہ یہ بات تعجب خیز ہے کہ اس کی تمام تصنیفات نہایت پریشانی اور کثیر الاشتغالی کے عالم کی ہیں وہ قاضی القضاۃ اور صیغۂ عدالت کا افسر تھا اور اس تعلق کی وجہ سے وہ مراکو اور اندلس کے تمام بڑے بڑے اضلاع کا دورہ کرتا رہتا تھا۔ کتاب الحیوان کی شرح میں خود اس نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ماہ صفر ۵۶۵ھ میں بمقام اشبیلیہ تمام ہوئی۔ پھر عذر خواہی کی ہے کہ اگر اس کتاب میں سہو خطا ہو گئی ہو تو معافی کی امید ہے۔ کیونکہ اولاً تو کار

منصبی سے فرصت نہیں ملتی۔ دوسرے کتب خانہ وطن
میں ہے اور ضروری کتابیں تک ساتھ نہیں۔ اسی قسم
کی عذر خواہی کتاب الطبیعہ کی شرح میں بھی کی ہے
اور لکھا ہے کہ یہ کتاب رجب ۵۶۵ھ میں بمقام
اشبیلیہ تمام ہوئی۔ مجسطی کا جو اختصار کیا ہے اس
میں لکھا ہے کہ میں نے صرف اہم اور مقدم مطالب
لے لئے ہیں۔ میری حالت بالکل اس شخص کی سی
ہے جس کے مکان میں آگ لگ گئی ہو اور وہ گھبراہٹ
اور اضطراب میں صرف مکان کا ضروری اور قیمتی
اسباب نکال نکال کر پھینک رہا ہو۔ کتاب الہیات
اور کتاب البیان ۵۷۰ھ کے آغاز میں ساتھ ساتھ لکھنی
شروع کی تھی۔ اسی اثنا میں بیمار ہو گیا اور زیست کی امید
نہیں رہی۔ اس خیال سے کتاب البیان کو چھوڑ کر الہیات
کی تکمیل میں مصروف ہو گیا کہ کتاب البیان کے ساتھ
کہیں یہ بھی رہ نہ جائے۔ جوہر الکون پر جو رسالہ لکھا ہے
وہ مراکو میں ۵۷۴ھ میں تمام ہوا لیکن ۵۷۸ھ میں پھر
اشبیلیہ جانا پڑا۔ یہاں اس نے فقہ پر ایک کتاب لکھی
اسی سن میں ابن طفیل کی وجہ سے منصور نے اس کو
مراکو میں بلا لیا اور اپنا خاص طبیب مقرر کیا۔

یہ اباب و ذہاب، کثرت اشغال، پریشانی اور پراگندہ دلی کوئی چیز اس کو اپنے اشغال سے نہ روک سکی اور یہ ابن رشد کی خصوصیت نہیں بزرگان اسلام میں عموماً یہ ادا پائی جاتی ہے کہ انقلابات زمانہ کی باد صرصر ان کے اوراق حواس کو پریشان نہیں کر سکتی تھی۔ امام رازی، بو علی سینا امام غزالی، شہاب مقتول وغیرہ کے جو کارنامے ہیں وہ بھی اسی قسم کی بے سروسامانی اور پریشانی کے زمانہ کی یادگار ہیں۔

یورپ میں ابن رشد کی تصنیفات کی جس طرح اشاعت ہوئی اور اس کا جو اثر یورپ پر پڑا وہ ایک دلچسپ داستان ہے لیکن اس کے بیان کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ یورپ میں عام فلسفۂ عرب کی اشاعت کی ابتداء کی مختصر کیفیت بیان کی جائے۔

یورپ جس زمانے میں مسلمانوں سے صلیبی لڑائیاں لڑ رہا تھا اس وقت مسلمانوں کی نسبت یورپ کے عجیب عجیب خیالات تھے لیکن جب اسلامی ممالک میں اہل یورپ کا گزر ہوا اور ان کو ہر طرف مسلمانوں کے علمی اور ملکی ترقیوں کے عجیب و غریب منظر نظر آئے تو سب سے پہلا اثر جو یورپ کے دل پر پڑا وہ مسلمانوں کی علمی فضیلت کا اعتراف تھا۔ یورپ

کی یہ فیاضی رشک کے قابل ہے کہ ایک طرف تو مذہبی
اختلافات کی بناء پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا لیکن دوسری
طرف اس نے بے تکلف مسلمانوں کے خوانِ کرم سے زلہ
ربائی شروع کر دی۔

سب سے پہلے طلیطلہ (ٹالیڈو) کے لارڈ بشپ نے
جس کا نام ڈریمونڈ تھا سنہ ۱۱۳۰ء میں ایک محکمہ اس غرض
سے قائم کیا کہ اسلامی فلسفیانہ تصنیفات عربی سے لاطینی
زبان میں ترجمہ کی جائیں۔ اس محکمہ کے ارکان دو یہودی علماء
تھے جو عربی زبان اور عربی فلسفہ کے ماہر تھے۔ ان میں
سب سے ممتاز یوحنا تھا جو اشبیلیہ کا رہنے والا تھا۔ اس
محکمہ کا افسر گوند لسالفی مقرر ہوا۔ اس محکمہ نے ابن سینا
کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں۔ چند روز کے بعد دی کریمون اور
الفرڈو بی مولاجی نے فارابی اور کندی کی بعض بعض تصنیفیں
بھی ترجمہ کیں۔

اسی زمانے میں جزیرہ سسلی اور نیپولی میں بھی عربی کتابوں
کا ترجمہ شروع ہوا۔ یہ ابتدائی حالت تھی لیکن فلسفۂ عرب
کی اشاعت کا اصلی زمانہ درحقیقت فریڈرک دوم سے شروع
ہوتا ہے جو جرمنی کا مشہور فرمانروا گزرا ہے۔ یہ علم پرور
بادشاہ درحقیقت یورپ کا مامون الرشید تھا۔ اس کی

طبیعت فطرتاً فلسفیانہ واقع ہوئی تھی اور جس قدر مذہبی گروہ اس کے خیالات کی مخالفت کرتا تھا اس کا میلان فلسفہ کی جانب اور بڑھتا جاتا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں عموماً علم و فن کے سرچشمہ اہل عرب تسلیم کئے جاتے تھے اس نے ایک سسلی کے باشندہ سے عربی زبان سیکھی اور عرب کے رسم و رواج کا اس قدر شیفتہ ہوا کہ مشرقی بادشاہوں کی طرح اس نے حرم اور خواجہ سرا مقرر کئے۔ دور دور سے عربی دان فضلاء جمع کئے یہاں تک کہ بغداد کے علماء و فضلاء بھی اس کے دربار میں پہنچے جو بڑی چوڑی آستینوں والی عبائیں زیب بدن کرتے تھے۔

فریڈرک علانیہ عرب کے علوم و فنون و مراسم کی مداحی کرتا تھا حالانکہ یہ امر اس کے تمام دربار کو سخت ناگوار تھا بایں ہمہ صلیبی لڑائیوں کے سلسلہ میں یورپ نے جب بیت المقدس پر چھٹا حملہ کیا تو یہ بادشاہ بھی ایک فوج کثیر کے ساتھ اس حملہ میں شریک ہوا لیکن یہاں بھی وہ علمی مشاغل سے خالی نہ رہا۔ مسلمان علماء کو اپنی مجلس میں بلاتا تھا اور ریاضی کے مشکل مسائل ان سے حل کراتا تھا۔ ان مسائل کو وہ اسلامی فوج کے سپہ سالار کے پاس بھی حل کی غرض سے بھیجا کرتا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کے

ساتھ وہ سخت لڑائیاں لڑتا تھا لیکن مذہب کی حالت یہ تھی کہ ہیکل مقدس میں جاکر حضرت عیسیٰؑ زیارت گاہ کی بے حد ہنسی اڑاتا اور دوسروں کو بھی ہنسی اڑانے کی ترغیب دیتا تھا یہاں تک کہ ایک دن لارڈ بشپ کے سامنے بھی اس نے اسی قسم کی تمسخر آمیز باتیں کیں جن کو بشپ نے قلم بند کر لیا۔ عیسائی اس کو برا سمجھتے تھے اور خاص طور پر پادریوں نے اس کی ہجو میں نظمیں لکھیں۔ پوپ نہم گریگوریس نے اپنی تحریر میں اس کی نسبت فتویٰ دیا کہ یہ بادشاہ فساد کا بادشاہ ہے" کیونکہ وہ اس بات کا قائل ہے کہ جب تک کوئی چیز عقل اور نظام طبعی سے نہ ثابت ہو اس کو تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ عام عیسائی جماعت نے اس کو دجال کا خطاب دے رکھا تھا لیکن اس نے ان تمام باتوں کی مطلق پرواہ کی اور نہایت آزاد خیالی سے عربی کتابیں ترجمہ کرائیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ابن رشد کے یہودی تلامذہ اسپین سے نکل کر مختلف ممالک میں پھیل گئے تھے۔ ان میں سے ایک خاندان جو طبیون کہلاتا تھا اسپین سے ہجرت کر کے فرانس میں چلا آیا تھا۔ ان میں سے موسیٰ بن طبیون اور سموئل بن طبیون نے ابن رشد کی بعض کتابیں عبرانی میں ترجمہ کیں۔ ابن رشد

کی تصنیفات کا یہ پہلا ترجمہ تھا۔ شہنشاہ فریڈرک نے جب اسلامی کتابوں کا ترجمہ کرانا چاہا تو ان یہودی علماء کو اس نے دربار میں بلایا اور یہ خدمت ان کے سپرد کی۔ یہود ابن سلیمان جو ٹالیڈو کا رہنے والا تھا اور فریڈرک کے خاص مقربین میں تھا اس نے ۱۲۴۷ء میں ایک کتاب لکھی جس کا نام طلب الحکمۃ رکھا۔ یہ کتاب تمام تر ابن رشد کی تصنیفات سے ماخوذ تھی۔ ایک اور یہودی عالم جس کا نام یعقوب ابن مریم تھا۔ اور جو نیپولی میں مقیم تھا اور خاندان طبون کا داماد تھا اس نے ۱۲۳۲ء میں شہنشاہ فریڈرک کی فرمائش سے ابن رشد کی متعدد تصنیفات ترجمہ کیں۔ اس کے بعد کالونیم نے جو ارل کا باشندہ تھا اور ۱۲۸۷ء میں اس کی ولادت ہوئی تھی ابن رشد کی کتابوں کا عبرانی زبان میں ترجمہ شروع کیا۔ وہ لاطینی زبان بھی جانتا تھا چنانچہ تہافتہ التہافتہ کا ترجمہ اس نے لاطینی ہی زبان میں کیا جو ۱۳۲۸ء میں انجام کو پہنچا۔

غرض چودھویں صدی عیسوی کے آغاز تک ابن رشد کا فلسفہ تمام یہود میں پھیل گیا۔ اسی زمانے میں ایک یہودی فاضل نے جس کا نام لاوی بن جرشون تھا اور جس کو اہل یورپ لاؤن افریقی کے نام سے خطاب کرتے تھے۔ ابن رشد کے فلسفہ کی اسی طرح شرح اور خلاصے لکھے جس طرح ابن رشد

نے ارسطو کے فلسفہ کی شرح اور تلخیص کی تھی ۔ یہ فاضل
بالکل آزاد خیال تھا ۔ وہ مادہ کے قدیم ہونے کا قائل تھا ۔
نبوت کی نسبت اس کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ انسانی قوتوں میں سے
ایک قوت کا نام ہے ۔ اس نے یہودی مذہب کو فلسفہ سے
ملانا چاہا اور فلسفہ اور مذہب میں تطبیق کی ۔ ان یہودی حکماء
میں سب سے آخر شخص الیاس مدیجو تھا جو پیڈوا کی یونیورسٹی
کا پروفیسر تھا ۔

سولہویں صدی عیسوی میں یہود کے مذہبی علماء نے
یہ دیکھ کر کہ فلسفہ مذہب کو برباد کئے دیتا ہے بڑے زور
شور سے فلسفہ کی مخالفت شروع کی ۔ چنانچہ مشینو نے
جو مذہبی حیثیت سے ربی کا لقب رکھتا تھا امام غزالیؒ
کی کتاب تہافتہ الفلاسفہ ۱۵۳۸ء میں شائع کی جس سے ابن
رشد کی مخالفت کا اظہار مقصود تھا ۔ اس وقت تک ابن رشد
کے فلسفہ کی جو کچھ اشاعت اور ترویج ہوئی تھی زیادہ تر
یہودیوں میں ہوئی تھی اور وہی فلسفۂ ابن رشد کے حامی
اور پیرو خیال کئے جاتے تھے ۔ اب وہ زمانہ آیا کہ تمام
یورپ میں ابن رشد کے فلسفہ نے رواج پایا

سب سے پہلا شخص جس نے یہ خدمت ۱۲۳۰ء میں
انجام دی ۔ میکائل اسکاٹ تھا ۔ یہ فاضل ٹالیڈو (طلیطلہ) میں

قیام رکھتا تھا اور شاہ فریڈرک کے جس کا ذکر اُوپر گزر
چکا ہے ، دربار یوں میں تھا۔ اسکاٹ کے بعد ہارمن نے
جو خاص جرمنی کا رہنے والا تھا ابن رشد کے فلسفہ کی اشاعت
کی۔ یہ فاضل بھی فریڈرک کے دربار میں ایک معزز حیثیت
رکھتا تھا۔ اس کے بعد اس طرف عام توجہ شروع ہوئی
یہاں تک کہ تیرہویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے
ابن رشد کی تمام فلسفیانہ تصنیفات لاطینی زبان میں ترجمہ
ہو چکی تھیں۔

ابن رشد کے مخالفین

جونہی ابن رشد کے خیالات
یورپ میں پھیلنا شروع ہوئے
عیسائیوں کی مذہبی جماعت میں ایک آگ سی لگ گئی اور
۱۲۰۹ء میں ایک بڑا مذہبی جلسہ منعقد ہوا جس میں پیروان
ابن رشد کی گمراہی کا فتویٰ دے دیا۔ پھر ۱۲۱۵ء میں عیسائیوں
کے مذہبی محکمہ نے یہ فتویٰ دیا کہ ارسطو کے فلسفہ اور
بو علی سینا کی تصنیفات کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے۔ ۱۲۳۱ء
میں پوپ نہم نے جس کا نام گیگوریوس تھا حکم دیا کہ عرب
کے فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا قطعاً بند کر دیا جائے۔ گولیم ڈفرن
نے جو ایک مشہور فاضل تھا نہایت سختی کے ساتھ ابن
سینا کے فلسفہ کا رد لکھا۔ ڈفرن کے بعد پیئر نے جو بہت

بڑا متکلم تسلیم کیا جاتا تھا فلسفۂ عرب کے رد میں بہت
سی کتابیں لکھیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ بو علی سینا کا
بہت مداح تھا اور ابن رشد کو محض اس وجہ سے برا سمجھتا
تھا کہ اس نے ابن سینا کی مخالفت کی تھی۔

ابن رشد کے مخالفین میں سب سے زیادہ شہرت
سینٹ ٹامس نے حاصل کی۔ یہ شخص مغربی کلیسا کا سب
سے بڑا متکلم اور عالم خیال کیا جاتا تھا اس نے ابن رشد
کے فلسفہ کو نہ صرف مذہبی بلکہ عقلی دلائل سے بھی رد کیا۔
اور چونکہ ابن رشد فلسفۂ ارسطو کا سب سے بڑا شارح خیال
کیا جاتا تھا۔ ابن رشد کے مقابلہ میں وہ دلائل استعمال کئے
جو ارسطو کے دلائل سے ماخوذ تھے۔ پادریوں نے اس
کے صلہ میں اس کی اس قدر عزت کی کہ اس کو ایک
مقدس مذہبی امام قرار دیا۔ چودھویں صدی عیسوی کے ایک
مشہور مصور نے سنہ ۱۳۴۰ء میں ایک عمدہ مرقع بنایا جو مقدس
کاترین کے گرجا میں بمقام پیزہ (اٹلی) نصب کیا گیا۔ اس
مرقع کی یہ صورت تھی کہ سب سے اوپر ذات مقدس
جلوہ گر ہے۔ جس کے چاروں طرف ملائکہ صف بستہ ہیں
ذات مقدس سے نور کی شعاعیں منتشر ہوتی ہیں۔ نیچے
بادل کی سطح پر حضرت موسیٰؑ اپولوس اور اناجیل اربعہ ہیں۔

اور نور کی شعاعیں ان پر آکر پڑتی ہیں۔ بادل کے نیچے مقدس ٹامس کھڑا ہے جس پر نور کی شعاعیں حضرت موسیٰؑ وغیرہ سے گزر کر پڑتی ہیں۔ ان شعاعوں کے علاوہ دور کی تین شعاعیں براہ راست ذات مقدس سے ٹامس پر پڑتی ہیں۔ ذرا نیچے دونوں جانب ارسطو اور افلاطون کھڑے ہیں۔ ان دونوں کے ہاتھ میں دو کتابیں ہیں جن سے نور کا ایک سلسلہ بلند ہو کر ٹامس کے سر تک پہنچتا ہے اور ذات الٰہی کے نور میں مخلوط ہو جاتا ہے۔ ٹامس کرسی پر جانشین ہے اس کے ہاتھ میں کتاب مقدس ہے جو کھلی ہوئی ہے اور جس کے سر صفحہ پر یہ عبارت ہے "میرا منہ سچ بولتا ہے اور میرے ہونٹ گمراہی سے منکر ہیں" ٹامس کی کرسی کے چاروں طرف ہر درجے کے مقدس پادریوں کی قطار ہے جن پر ٹامس کی تصنیفات کی شعاعیں پڑ رہی ہیں۔ انہی شعاعوں میں سے ایک شعاع ابن رشد پر پڑ رہی ہے جو ٹامس کے سامنے زمین پر پچھڑا ہوا پڑا ہے۔

ابن رشد کے جن مسائل کا رد لکھا گیا وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- مادہ ازلی ہے اور اس کی حقیقت نہیں معلوم

ہو سکتی۔

۲۔ سلسلۂ کائنات کا اتصال علت اولی سے جس طرح ابن رشد نے بیان کیا تھا۔

۳۔ علت اولی اور معلومات میں عقل کا توسط۔

۴۔ کوئی شے عدم محض سے وجود میں نہیں آسکتی۔

ٹامس نے ان مسائل کو باطل ثابت کیا اور یہ دعوی کیا کہ اصل میں ارسطو نے غلطی کی تھی اور علمائے اسلام نے غلطی پر غلطی کی۔

ٹامس کی وفات کے بعد ریمون مارتینی نے فلسفۂ عرب کی مخالفت میں کتابیں لکھیں لیکن ان تصنیفات میں اس نے زیادہ تر امام غزالیؒ سے مدد لی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ فلسفہ کا رد فلسفی (امام غزالیؒ) کی زبان سے زیادہ موزوں ہے۔ ریمون کے بعد بہت سے مصنفین نے ٹامس کی حمایت اور فلسفۂ عرب کی مخالفت میں کتابیں لکھیں۔ ان میں یہ مذاق اس قدر بڑھا کہ اٹلی کے مشہور شاعر ڈینٹے نے بھی ابن رشد کی ہجو لکھی۔ اس کے بعد جیل دی روم نے بڑے زور شور سے فلسفۂ عرب خصوصاً ابن رشد کے فلسفہ پر حملہ کیا اور اس میں اس قدر ناموری حاصل کی کہ مقدس ٹامس کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہوئی

تھی۔ لیکن اس میدان میں جو شخص سب کا پیش رو تھا وہ ریمون لول تھا۔ یہ شخص دو برس یعنی ۱۳۱۰ء سے ۱۳۱۲ء تک پیرس سے لے کر جینوا، نیپولی، بزہ وغیرہ کا صرف اس غرض سے دورہ کرتا رہا کہ لوگوں کو فلسفۂ عرب کی مخالفت پر آمادہ کرے یہاں تک کہ جب ۱۳۱۱ء میں ویانا میں ایک مجلس منعقد ہوئی تو اس نے پوپ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی جس میں تین باتوں کی درخواست کی گئی تھی۔ ایک یہ کہ ایک بڑا لشکر مسلمانوں کے برباد کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ عربی زبان کی تعلیم کے لئے یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔ تیسرے یہ کہ ابن رشد کی تصنیفات کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا جائے۔

ابن رشد کے حامی

اگرچہ فلسفۂ عرب کی نسبت مذہبی جماعت میں اس قدر شور غل برپا تھی لیکن فلسفہ کا جادو ایسا نہ تھا کہ کوئی جماعت اس سے بے اثر رہ سکتی۔ مذہبی گروہ ہی میں ایک فرقہ پیدا ہو گیا جس نے نہایت استقلال اور دلیری سے فلسفۂ عرب کی حمایت کی۔ یہ فرقہ فرانسیسکن کہلاتا تھا۔ ان لوگوں نے بڑی آزاد خیالی اور جرأت سے روما کی حکومت کے جلال و سطوت کا مقابلہ کیا اور ٹامس کے رد میں کتابیں لکھیں

چونکہ یہ لوگ طامس کے عقائد کا جھٹلا اپنا فرض عین سمجھتے تھے اس لئے ان کو بخواہ مخواہ فلسفۂ عرب سے اعانت حاصل کرنا پڑی۔

اس فرقہ کے مشہور لیڈر جان دی لاروشل نے بالکل علانیہ ابن سینا کی پیروی کا اظہار کیا اور علم نفس و اخلاق کی نسبت اس نے جو کچھ لکھا تمام تر ابن سینا کی تصنیفات ہی سے لکھا۔ اب فرانس کی مذہبی تعلیم گاہ دو فرقوں میں منقسم ہو گئی۔ سوربون کے مدرسہ میں طامس کے معتقدات کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن پیرس کی یونیورسٹی میں ابن رشد کا فلسفہ پڑھایا جاتا تھا۔ ڈاتی کین فرقۂ سوربون کی تعلیم کا حامی تھا چنانچہ ان دونوں نے متفق ہو کر پوپ چہارم سے جس کا نام الیگزینڈر تھا چھ سات برس کے عرصہ میں چالیس فرمان اس مضمون کے صادر کرائے کہ عرب کے فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے۔ ۱۲۶۹ء میں پیرس کی مذہبی مقدس مجلس نے یہ فرمان صادر کیا۔

یہ جلسہ ان لوگوں کے فاسد العقیدہ ہونے کا فتویٰ دیتا ہے۔ جو مندرجہ ذیل اعتقادات کے قائل ہیں:۔

۱۔ عالم ازلی ہے۔

۲۔ تمام انسانوں میں ایک ہی عقل پائی جاتی ہے۔

۳۔ انسان کا سلسلہ کسی ایک معین آدم تک منتہی نہیں ہوتا۔

۴۔ نفس جسم کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے۔

۵۔ خدا جزئیات کا عالم نہیں ہے۔

۶۔ خدا قابل فنا چیزوں کو ابدی نہیں کر سکتا۔

ان سب ہنگاموں کے ساتھ ابن رشد کا فلسفہ یورپ میں برابر پھیلتا گیا یہاں تک کہ چودھویں صدی عیسوی میں یورپ کا بڑا حصہ ابن رشد کا پیرو بن گیا چنانچہ فرانس کے مشہور بادشاہ لوئیس یازدہم نے ۱۴۷۳ء میں جب صیغۂ تعلیم کی اصلاح کرنا چاہی تو پروفیسروں کو حکم دیا کہ ارسطو کی تصنیفات پر ابن رشد کی جو شرحیں ہیں وہ نصاب میں داخل کی جائیں۔ اب یہ نوبت پہنچی کہ تمام یورپ میں ابن رشد کا فلسفہ علانیہ طور پر پڑھا جاتا تھا اور کوئی مخالفت کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔

ابن رشد کے فلسفہ نے اگرچہ تمام یورپ میں رواج پایا لیکن اس فلسفہ کا سب سے بڑا اور اعلیٰ صدر مقام پیڈوا کی یونیورسٹی تھی جو اٹلی میں واقع تھی۔ اس یونیورسٹی میں سب سے پہلے ابن رشد کے فلسفہ کو داخل نصاب کرنے والا جو شخص تھا اس کا نام پیری ڈاباتو تھا۔ ان کے

بعد یورپ کے تمام علمی طبقوں میں ابن رشد کی اس قدر عزت کی جاتی تھی کہ لوگ اس کے نام پر فخر کرتے تھے۔ فن طب کی تحصیل نے سب سے زیادہ عربوں کا تسلط پیڈوا پر قائم کیا۔ اس لحاظ سے پیری ڈاپانو اس بات کا مستحق ہے کہ اسے پیڈوا میں رشدیت کا بانی مبانی کہا جائے۔ اس کی کتاب رفع اختلافات فلسفہ وطب زبارہ۔ (ZIM ARA) اور ٹومی ٹینس (TOMITANUS) کے مضامین کا گویا مقدمہ ہے جنہوں نے ارسطو اور ابن رشد میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ پیری ڈاپانو بجائے خود نہ "الکلیات" سے واقف تھا اور نہ ابن رشد کی کتب طب اس نے دیکھیں تھیں۔ جس قدر عبارتیں وہ نقل کرتا ہے وہ سب ابن رشد کی فلسفہ کی کتابوں سے لی گئی ہیں لیکن ایک اور ہی صفت ہے یعنی مشتبہ شہرت اور مذہبی خیالات کا تزلزل جس کی وجہ سے پیری ڈاپانو نہ صرف ابن رشد کا پیرو بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ کہلائے جانے کا استحقاق حاصل کرتا ہے۔ مذہب کے زائچہ کا ایک ملحدانہ خیال سب سے پہلے اسی مصنف کی تصنیفات میں حیرت انگیز گستاخانہ لہجہ میں نظر آتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے کہ "زحل

اور مشتری کے قران سے جب وہ برج حمل کے آغاز میں واقعہ ہوا ہو جو نوسو باٹھ سال کے اختتام کے قریب واقعہ ہوتا ہے تمام عالم سفلی بدل جاتا ہے حتیٰ کہ سلطنتیں ہی نہیں بلکہ نئی شریعتیں اور پیغمبر پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ بخت نصر، حضرت موسیٰؑ، سکندر اعظم حضرت مسیحؑ اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آمد کے وقت ہوا تھا۔ یہ کتاب ۱۳۰۳ء میں لکھی گئی تھی۔ مذہبی عدالت نے اس پر مقدمہ قائم کیا مگر یہ دوران مقدمہ ہی میں مر گیا۔ مذہبی عدالت (اِن کوئی زیشن) نے اس کی ہڈیوں کو آگ میں جلا کر اپنا بدلہ لیا اور عوام الناس میں اس کے نام کے ساتھ یہ شہرت باقی رہی کہ وہ طرح طرح کے ناپاک اور شیطانی عقائد کا بانی تھا اور بہت سی ڈراؤنی باتیں اس کے ساتھ منسوب تھیں۔ پیڈوا کا تمام شعبۂ طب اس کے بعد سے ابن رشد کے طریقہ کا پابند ہو گیا۔ اس زمانے میں شمالی اطالیہ میں طبیبوں کا طبقہ ایک دولت مند اور آزاد طبقہ کہا جاتا تھا جن کی طرف سے پادریوں کے خیالات اچھے نہ تھے اور مذہب کے متعلق اس طبقہ کے خیالات بہت آزاد نظر آتے تھے۔ فن طب، فلسفۂ اہل عرب، فلسفۂ ابن رشد،

علم جونش اور الحاد یہ سب الفاظ قریب ہم معنی و
مترادف سمجھے جاتے تھے چنانچہ سیکوڈی اسکولی
پر عدالت مذہبی دان کوئی زیشن اسنے ۱۳۲۴ء میں کفر
کا فتویٰ دیا اور حکم دیا کہ علم نجوم پر جس قدر کتابیں اس
کے پاس ہیں سب کو اپنے پاس سے الگ کر دے
اور ہر اتوار کو گرجے میں وعظ سننے آیا کرے کیونکہ اس
کی زبان سے مذہب کے خلاف الفاظ نکلے تھے مگر انجام
یہ ہوا کہ اسے زندہ جلا دیا گیا اور مصور ارکاگنا نے اس
کو اپنے جہنموں میں سے ایک ویرانے میں جگہ دی۔
فلسفۂ مادیت کی طرف جو شمالی اٹلی میں ہر جگہ چھایا
ہوا تھا لوگوں کی قبولیت پسند طبیعت کا میلان علانیہ
ظاہر ہونے لگا۔ سخت طبیعت اور سخت مزاج لوگوں
کی تعداد بڑھنی شروع ہو گئی۔ یہاں اور ہر جگہ ایسے
لوگوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ابن
رشد کے نام کی آڑ میں چھپائے رکھیں اور اس کے نام
سے اپنا کام کرتے رہیں لیکن مدرسۂ عرب کی دقت پسندیوں
نے ابن رشد کے ان پیروؤں میں ایک ایسی شان تبحر
پیدا کر دی جس کی سارے یورپ میں نظیر نہیں ملتی تھی۔

شرح بسیط کی عالمگیر مقبولیت

مدرسین کے تمام تر فلسفہ میں

ابن رشد کی دو گونہ شخصیت نظر آتی ہے۔ ایک طرف تو
ابن رشد وہ شخص ہے جس نے شرح بسیط لکھی ہے اور
جو حکیم ارسطا طالیس کا اعلیٰ درجہ کا ترجمان سمجھا جاتا ہے حتیٰ
کہ اس کے مخالف بھی اس کی عزت کرتے ہیں اور دوسری
طرف یہی وہ شخص ہے جو کامپوسانٹو کے کلیسا میں تمام
مذاہب کو برا کہنے والا اور متشککین کا بانی کار قرار دیا گیا ہے
پہلے پہل یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوگی کہ پابندیٔ مذہب
کے زمانے میں بھی یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسری سے
جدا نظر نہیں آتیں اور ایک ہی شخص کیتھولک مذہب
کے مدرسوں میں علوم قدیمہ کا اُستاد سمجھا جاتا ہے اور
ساتھ ہی ساتھ اُسے منکرین کا بھی سرغنہ کہا جاتا ہے۔
لیکن وسطی زمانے یہ بات کوئی خلاف فطرت نہیں سمجھی
جاتی تھی کہ جن لوگوں کے مذہبی عقائد قابل ملامت ہوں
ان سے فلسفہ کے درس حاصل کرنے میں مضائقہ نہ کیا جائے
وہ عظیم تفرقہ جو فلسفہ اور الہامی علوم میں سمجھا جاتا تھا اس
عقیدہ کا مانع نہیں تھا کہ کفار و بت پرست طبیعی اور
عقلی علوم میں مسیحیوں سے بازی لے سکتے ہیں اس لئے
کسی مؤرخ کو یہ دیکھ کر کہ اسقف بلکہ خود پوپ طلیطلہ کے

مدرسہ سے باہر آتا ہے اس سے زیادہ حیرت نہیں ہونی چاہیئے جتنی کہ ایک آثار قدیمہ کے ماہر کو وسطی زمانے کے خزانوں میں مذہبی زینت کے ساز و سامان کو دیکھ کر ہو سکتی ہے۔

چودھویں صدی عیسوی میں شرح بسیط ہر جگہ مسلمہ سمجھی جانے لگی اور ہر شخص بلا ردو قدح اسے سند کے طور پر پیش کرنے لگا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں عوام کی نگاہوں میں ابن رشد کا مرتبہ بو علی سینا کے پیچھے تھا ۱۲۹۱ء میں ایک مؤرخ ہمبرٹے ڈی پردلی جب ان شروح کا ذکر کرتا ہے جو اس نے ارسطو کے مابعد الطبیعات کی شرح لکھنے میں استعمال کی تھیں تو اس وقت ابن رشد کو چوتھے درجہ پر جگہ دیتا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں جب چودھویں اور پندرھویں صدیاں آئیں تو ان میں ابن رشد کو ارسطو کا سب سے بہتر شارح سمجھا جانے لگا۔ صرف اسی کا اتباع کیا جاتا تھا اور اسی کے اقوال بیان کئے جاتے تھے۔ پٹرارکا جو اٹلی کا مشہور شاعر اور یورپ میں قرون وسطیٰ کا سب سے پہلا جامع علوم و فنون فاضل گذرا ہے ابن رشد کو سب سے پہلا شرح کرنے والا خیال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ شاید تنہا یہی شخص ہے جس نے قدیم مصنفین

کی تمام کتابوں پر شرح کی ہے۔ پیٹرز اسے تمام فلسفۂ مدرسین کا امام سمجھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ صرف یہی ایک شارح ہے جس سے وسطی زمانہ کے لوگ متعارف تھے۔ مدرسین یورپ کے فلسفہ الٰہیات کے ان حکماء کو کہا جاتا ہے جو قرون وسطی میں ہوئے ہیں۔ ۵۲۹ء سے حکیم بوطیوس کی وفات کے بعد فلسفہ کی تعلیم بالکل ترک ہو گئی اور شارلین کے زمانے میں پھر شروع ہو گئی۔ اس وقت ایک مدرسہ محل شاہی کا تھا۔ پھر لیالنس، پارٹرا، لینس اور سینٹ ڈینس میں فلسفہ کے مدرسے تھے۔ تورس فولڈا، کاربی سینٹ گال، فانٹینل اور ریشی ناؤ کی خانقاہوں میں ایسے مدرسے تھے اور ان مقامات کے علاوہ اور بھی بکثرت دار العلوم اور مدرسے تھے جہاں فلسفہ پڑھایا جاتا تھا اور زمانہ بھر کے بڑے بڑے مشاہیر اور فاضل لوگ درس دیا کرتے تھے۔ ان مدرسین کا اپنا ایک الگ فلسفہ بن گیا انہی حکماء کو مدرسین (اسکولاسٹکس) کہتے ہیں اور ان کا فلسفہ انہی کے نام کی مناسبت سے فلسفۂ مدرسین کہا جاتا ہے

جب ۱۲۷۰ء میں لوئی یازدہم نے تمام فلسفی تعلیمات کو باقاعدہ ترتیب دینا شروع کیا تو جس عقیدۂ حکمت کو اس نے پسند کیا اور دوسروں کو اس کی طرف شوق دلایا وہ ارسطو اور اس کے شارح ابن رشد کا فلسفہ تھا جسے

ایک عرصہ دراز تک صحیح اور قابل استناد و امتیاز سمجھا جاتا رہا۔ ایک خط میں جو کرشٹوفر کو لمبس نے اکتوبر ۱۴۹۸ء کو ہیٹی سے لکھا ہے (اس خط کو پیرا ڈیلی نے نقل کیا ہے) یہ مضمون درج ہے۔

"ابن رشد ان مصنفین میں سے ہے جن کی
تصنیفات پڑھ کر ابی نئی دنیا (امریکہ) کے
وجود کا خیال پیدا ہوا۔"

ابن رشد کا فلسفہ تمام سولہویں صدی میں پیڈوا یونیورسٹی کے سرکاری نصاب میں داخل رہا۔ فلسفۂ ابن رشد کے لفظی معنی اب کسی اصول و نظریہ کے نہیں رہے بلکہ اس سے مراد وہ اعتبار تھا جو اس شارح اعظم پر ارسطو کے مطالب، کی تشریح و توضیح کے بارے میں لوگوں کو تھا۔ علمائے مذہب بھی اس قسم کی تعلیمات کی مخالفت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی مذہبی کتابوں کی تائید میں ایک ایسی بڑی سند کا مل جانا ان کے لئے ایک گونہ مسرت ہی کا باعث تھا صرف وہ لوگ جو فلسفہ اور ادب میں بدعت کو روا رکھتے تھے اسے پرانا اور بے معنی الفاظ سے لبریز کہا کرتے تھے۔ جو لوگ اپنے آپ کو کیتھولک مذہب کے بہت پابند سمجھا کرتے تھے وہ بھی مذکورہ بالا معنوں میں

رشدی کہلانا پسند کرتے تھے۔ رومۃ الکبریٰ کے ایک تاریخی کتب خانے میں رشد کی تصنیفات کا ایک نہایت عمدہ نسخہ اب تک یادگار کے طور پر محفوظ ہے کلیسا کی طرف سے فلسفہ ارسطو کے مطالعہ کو بہت تحسین کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا بلکہ بعض عیسائی علماء نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ اگر ارسطو نہ ہوتا تو کلیسا اپنے بہت سے عقائد کو سمجھنے سے محروم رہتا اور ابن رشد کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سے زیادہ ارسطو کی شرح کرنے والا کوئی شخص نہیں ہے۔ ایک مورخ کہتا ہے کہ فیثا غورث کے تلامذہ کے پاس اب کوئی شے ایسی نہیں ہے جو ہمیں حیرت و استعجاب میں ڈالے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ فلسفہ سے شغف رکھتے ہیں ان کی نگاہ میں ابن رشد کے اقوال علوم کی مانند سمجھے جاتے تھے اور اسے بہت ہی عظیم الشان خطابات سے ملقب کیا جاتا مثلاً فلسفہ شایین کا سب سے زیادہ زیرک مترجم، ارسطو کے شارحین میں سب سے زیادہ عظیم الشان"، ابن رشد اعظم اکمل الحکماء ارسطو کا مقدم ترین شارح۔ رشدی سے مراد ایسے شخص سے لی جاتی تھی جو باریک باریک فرق اور چھوٹے چھوٹے امتیازات پر وقت صرف نہ کرتا ہو بلکہ جس نے ابن رشد کے شروح بسیط

کو بہت ہی غور و تامل سے پڑھا ہو اور اسی طرح یہ لفظ فلسفی کا مرادف ہو گیا جس طرح جالینوس طبیب کا مرادف تھا۔ سان پٹرو واقع فک نیپلس کے باشندے مارک آنٹونی زمارہ کے مدرسوں میں اس وجہ سے بہت شہرت ہوئی کہ اس نے ابن رشد کی تصنیفات پر بہت توجہ صرف کی تھی۔ اس کے حل اختلافات ارسطو و ابن رشد فہرست مضامین، فرہنگیں، حاشیہ کی تشریحات، اس کی ترکیبات نحوی، یہ سب رسائل ابن رشد کے ضروری اجزاء بن گئے۔ غرضیکہ مدرسۂ پیڈوا میں ابن رشد کے ساتھ وہی ہوا جو تمام قدیم اساتذہ کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اس کے اصلی متون پر لوگ زمانۂ حال کے خلاصوں کو ترجیح دینے لگے جو آسانی سے ہاتھ میں رہ سکتے تھے اور نسبتاً زیادہ رواج پا گئے تھے۔ ابن رشد کی شارح عام طور پر مباحثوں میں خشکی اور موشگافیاں بہت کیا کرتے تھے مگر زمارہ نے اس کو اس قدر بڑھا دیا کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی رسالۂ حل اختلافات ارسطو و ابن رشد جس کی تالیف بہت حد تک زمارہ کے بعد ہوئی اور مجلس علماء نے جس کو مرتب کیا دلچسپی سے خالی نہیں ہے اس لئے کہ ان کے حل اختلافات میں بڑی کثرت سے ان اساتذہ

کی عبارتیں منقول ہیں جو پیڈوا میں قبولیت عامہ رکھتے تھے اور خاص طور پر قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے

تراجم کی ترتیب

ابن رشد کی تصنیفات کے غیر معمولی رواج نے اس بات کی ضرورت پیدا کر دی کہ ان کے ترجموں پر نظر ثانی کی جائے۔ پہلی مرتبہ جو نسخہ طبع ہوا تھا (پیڈوا ۱۴۷۲ء) اس کے بعد سے لوگ اس پر قانع ہو گئے تھے کہ قدیم ترجموں کو جو تیرہویں صدی عیسوی میں کئے گئے تھے موجودہ قلمی نسخہ جات ہی سے بار بار طبع کرایا جائے۔ ناشیفوس اور زمارہ نے ان کی تصحیح و تشریح کرنے میں پوری کوشش صرف کی تھی لیکن صرف ایک حد تک انہیں کامیابی ہوئی تھی۔ سولہویں صدی کے آغاز سے لوگوں نے عبرانی تراجم سے لاطینی میں نئے ترجمے کرنا شروع کئے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عربی نسخے اس زمانے میں بھی اتنے ہی کم یاب تھے جتنے کہ آج کل ہیں اور عربی جاننے والے بھی کم لوگ ملتے تھے لیکن عبرانی زبان سے ترجمہ کرنے والے بکثرت تھے چنانچہ ابن سینا کی تصانیف کا بھی یہی حشر ہوا۔ پہلے ان کا ترجمہ عربی کریمونی نے کیا اس کے بعد عبرانی سے مختلف علماء نے کیا مگر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا

جو مقصد تھا وہ حاصل نہ ہوا اور عبرانی زبان سے جتنے ترجمے ہوئے وہ تیرہویں صدی کے تراجم سے بھی زیادہ دقیق اور مبہم ہوئے۔

یہ نئے ترجمے عرصہ دراز تک نقل در نقل قلمی نسخوں کی شکل میں شائع ہوتے رہے۔ آخر مجلس علماء (جینٹیز) (Juntes) نے ابن رشد کے کامل ترجموں کی طباعت کے لئے ایک تجویز نکالی جس کے مطابق ورونا کے مشہور فاضل جین بپسٹ بیگولانی کے جو پیڈوا میں ایک حکیم کے نام سے اور وینس میں طبیب کے نام سے شہرت رکھتا تھا یہ کام سپرد کیا گیا۔ اس نئے ترجمے کا بہت بڑا حصہ جدید تراجم سے ماخوذ تھا اور بعض رسالوں کی حد تک صرف پرانے ہی تراجم برقرار رکھے گئے تھے۔ خاص طور پر شروح رسالہ ہائے طبعیات، افلاک ما بعد الطبیعات اور اخلاق نقوما جس کے ترجمے قدیم ہی سے بعض دفعہ کتاب النفس کے بعض حصوں کے لئے یہ التزام کیا گیا کہ قدیم و جدید دونوں ترجمے دو متوازی جدولوں میں درج کر دیئے جائیں اکثر یہ ہوا کہ قدیم و جدید دونوں ترجموں کی اصلاح ایک دوسرے کی مدد سے کی گئی۔ بعض تلخیصات جو اس وقت تک شائع

نہیں ہوئی تھیں ان پر زبارہ کا حاشیہ بھی درج کر دیا گیا۔ ابواب کی تقسیم و ترتیب میں اصلاح کی گئی۔ تلخیصات اور شروح متوسط کو متعدد حصّوں میں بانٹ دیا گیا اور اصل متون کے بعد ان کو درج کیا گیا۔ اس کام کو بعض علماء نے بڑی سرگرمی سے انجام دیا۔

پیرس کے شاہی کتب خانے نے اعفارت کتب قدیم نمبر ۱۵۵۰ میں الطبیعات کی شرح متوسط کا ایک لاطینی نسخہ موجود ہے یہ شرح زکریا ابن اسحاق کے اس ترجمہ سے کی گئی تھی جو اس نے عبرانی میں اصل کتاب سے کیا تھا اور کبھی طبع نہیں ہوئی۔ اس ترجمہ کو ۷ رجون ۱۵۰۰ء میں عالم ادب و فاضل طب لوحی ثاس نے سرانجام تک پہنچایا تھا۔ اس مترجم کا نام بھی بعض دوسروں کی طرح کسی کو معلوم نہیں اور بالکل غیر معروف ہے۔ ڈل میڈیگو کا شمار بھی ان یہودی فاضلوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ابن رشد کی تصانیف کا ایک سلیس اور قابل فہم ترجمہ پیڈوا کے مدرسہ کو پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے جوہر الکون، شرح رسالہ شہاب ثاقب، اسوۂ معقولات الادویہ کا ترجمہ کیا تھا جن کو ۱۴۸۸ء میں وینس کے مقام پر طبع کرایا گیا تھا۔ اسی

شخص نے مابعد الطبیعیات کے ابتدائی سات مقالوں کی شرح متوسط کا بھی ترجمہ کیا تھا جو ۱۵۶۰ء میں پہلی مرتبہ زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔ موت نے جلدی کی اور جس کام کا بیڑا اس نے اٹھایا تھا وہ تمام نہیں ہونے پایا۔ پھر بھی غالب خیال ہے کہ لوگوں نے اس کی بعض شرحوں کو جو اس نے ابن رشد کے رسائل پر خود لکھی تھیں ترجمہ ہی سمجھا ہے۔

زمانے نے جو برتاؤ ابن رشد کی کتب فلسفہ کے ساتھ کیا وہی طب کی کتابوں کے ساتھ کیا۔ سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں لوگوں کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کا دوبارہ ترجمہ کیا جائے اور ان کی تکمیل و تصحیح بھی کی جائے۔ شاہ ہنری دوم کے طبیب ثانی برادرین شاپیر نے الکلیات کے دو رسالے، چھٹے اور ساتویں مقالے کا ترجمہ عبرانی سے خود کیا یا کرایا اور اسے المجموعہ کے نام سے شائع کیا۔ مانٹی نو نے بھی کلیات کے مقالہ پنجم کے بعض ابواب کا اسی طرح ترجمہ کیا۔ الیاگوڈی بیلون نے ارجوزہ ابن سینا کی شرح پر نظر ثانی کی اور مقالۃ الترباق بھی وینس کے قلمی نسخہ سے مطابقت کرنے کے بعد طبع کرایا گیا۔ مجلس علماء نے مطبوعات مابعد کا کام

اس سے زیادہ نہیں کیا کہ ۱۵۵۳ء کی مطبوعات کو دوبارہ طبع کرا دیا۔ ان کے دیباچوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کی بڑی مانگ تھی۔ جس طرح دیگر علوم قدیم کی مقبول عام کتابیں جلدی ختم ہو جایا کرتی تھیں اسی طرح دو تین سال میں یہ ایک دفعہ کی طبع کی ہوئی تمام کتابیں ختم ہو جایا کرتی تھیں۔

یورپ کے فلاسفہ میں راجر بیکن جس عزت کے ساتھ ابن رشد کا نام لیتا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کے فرقہ میں ابن رشد کے متعلق مدرسہ ڈالی نیکی سے بالکل ہی مختلف روایات موجود تھیں چنانچہ وہ صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ:

"ابن سینا نے سب سے پہلے فلسفۂ ارسطو کو ظاہر کیا لیکن انہی متبعین کی بدولت اسے سخت حملے برداشت کرنا پڑے۔ اس کے بعد ابن رشد سب سے بزرگ گزرا ہے جس نے ابن سینا کی بے حد تردید کی۔ فلسفہ ابن رشد کی طرف سے ایک عرصہ دراز تک لوگوں نے غفلت برتی اور بڑے بڑے مشہور علماء بھی اس سے انکار کرتے اور

اسے بڑا کہتے رہے مگر اب تمام علماء
متفق ہو کر اسی کو مانتے ہیں۔ اس کے
مسائل جو عام طور پر قابل قدر تھے گو
ان کے بعض مقامات پر ہم اعتراض
کرتے ہیں پھر بھی رفتہ رفتہ لوگ ان کی
خوبی کو تسلیم کرتے گئے"
ایک مقام پر راجر بیکن کہتا ہے کہ:-
"ابن سینا کے بعد ابن رشد آیا جو نہایت
پختہ مسائل والا شخص تھا جس نے اپنے
تمام پیشروؤں کے مقولوں کی اصلاح
کی اور ان میں بہت سا اضافہ بھی کیا
گو بعض مقامات اس میں بھی ایسے
ہیں جو اصلاح طلب ہیں اور اکثر ایسے
بھی ہیں جو تکمیل طلب بھی ہیں"
بیکن علانیہ طور پر شرح رسالۃ الطبیعات، کتاب النفس
اور رسالہ فلک العالم سے نقل کرتا رہتا ہے وہ اپنے ہمعصر
فلاسفہ کو ملامت کرتا ہے کہ وہ ایسے قدیم مصنفین سے
جن میں کوئی جوہر نہیں اس قدر دل بستگی رکھتے ہیں لیکن
ان نئی نئی شرحوں سے فائدہ اُٹھانے کی طرف توجہ

نہیں کرتے جو فلسفہ کی ہو رہی ہیں۔

فلسفہ ابن رشد بنی اسرائیل میں

قرطبہ کے مشہور محقق موسیٰ میمونی کی قوی تحریک پر ابن رشد کا نام بنی اسرائیل میں بلا تامل فلسفہ میں اعلیٰ ترین سند کے طور پر لیا جانے لگا۔ موسیٰ میمونی کے ایک شاگرد یوسف بن یہودا کا ایک عجیب خط ہے جو اس نے اپنے اُستاد کے نام لکھا ہے۔ اس خط کو دیکھنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ابن رشد کو غالباً اس کی حیات ہی میں بنی اسرائیل کے نزدیک کس قدر عظمت و اہمیت حاصل ہو گئی تھی وہ لکھتا ہے کہ

"کل آپ کی حسین دماہ پارہ لڑکی عقد ثریا مجھ سے دو چار ہوئی اور مجھے اپنا فریفتہ بنا لیا اس نوجوان لڑکی نے مجھے خورسند و مسرور کیا اور میں نے راستی ارادہ کے ساتھ اس شرع کے مطابق جو کوہ سینا پہ عطا ہوئی تھی اس سے عقد کر لیا میں نے تین چیزیں دے کر یہ عقد کیا ہے۔ مہر میں زر دوستی دیا۔ چونکہ مجھے اس سے عشق تھا اس لئے میں نے

ایک محبت نامہ لکھ دیا اور جس طرح
نوجوان دوشیزہ سے ہم آغوش ہوتے
ہیں۔ میں بھی اس سے ہم آغوش ہوا۔
ان تمام ذریعوں سے اس لڑکی کو حاصل
کرکے میں نے محبت کے بسترِ عروسی
پر آنے کی اسے دعوت دی لیکن نہ تو
میں نے کسی ترغیب سے کام لیا اور نہ
ترہیب سے بلکہ وہ خود بخود مجھ سے
محبت کرنے لگی کیونکہ میں بھی اس سے
محبت کرتا تھا اور میری روح اس کی
روح سے واصل ہو گئی تھی۔ یہ کل واقعہ
ابن عبداللہ دمیمونی اور ابن رشد دو
مشہور گواہوں کے سامنے گزرا ہے۔
جو میرے دوست ہیں۔ لیکن ابھی وہ
بستر عروسی ہی پر تھی اور میرے ہی
قابو میں تھی کہ الہانہ سبجہ وفائی کرنے
لگی اور دوسرے عاشقوں کی طرف بھی
نظر کرنے لگی!!

یہ منکوحہ فلسفہ تھی جسے یوسف ابن یہودا نے اپنے

اُستاد سے عقد میں لیا تھا اور جس سے جیسا کہ پایا جاتا ہے کہ اس کی خاطر خواہ تشفی نہیں ہوئی۔

جمال الدین قفطی نے ایک اور دلچسپ قصہ اپنی تاریخ فلاسفہ میں بیان کیا ہے اور جسے ابو الفرج نے نقل کرکے خاتمہ پر یہ اضافہ کیا ہے کہ یوسف ابن یہودا اور ابن رشد کے مسائل میں باہم دگر کیا مماثلت ہے۔ جمال الدین کہتا ہے کہ مجھ سے اور اس سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ میں نے ایک دن کہا کہ،

"اگر یہ صحیح ہے کہ روح جسم کے بغیر بھی زندہ رہتی ہے اور موت کے بعد بھی اسے خارجی اشیاء کا علم باقی رہتا ہے تو مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر تم مجھ سے پہلے مر جاؤ تو میرے پاس آکر اس کی حقیقت بیان کرو گے اگر میں پہلے مر جاؤں تو میں آکر بیان کردوں گا"

ہم دونوں اپنے وعدہ پر قائم رہے۔ اس کا انتقال پہلے ہوا اور مجھے چند سال تک جواب کے لئے انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار ایک دن وہ میرے خواب میں آیا میں نے کہا،

"اے حکیم! کیا میرے اور تمہارے
درمیان یہ معاہدہ نہیں ہوا تھا کہ تم مجھ
سے آکر مابعد موت کے واقعات بیان
کرو گے۔ اس کی سخت ضرورت ہے
کہ تم پر جو کچھ گزرا سب مجھ سے بیان
کرو اور بتاؤ کہ لوگوں پر موت کے بعد
کیا گزرا کرتی ہے؟"
اس نے جواب دیا کہ:۔
"کل، کل سے مل گیا اور جزو، جزو کے
ساتھ شامل ہو گیا۔"
میں فوراً سمجھ گیا کہ اس کے کیا معنیٰ ہیں یعنی روح جو
ایک کلی ہے کل کی طرف چلی گئی اور جسم جو ایک جزوی
چیز ہے اپنے مرکز ارضی کی طرف لوٹ گیا جب میں بیدار
ہوا تو جواب کی نزاکت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔
موسیٰ میمونی کے تمام پیرو فلسفۂ ارسطو کی تعبیر میں ابن
رشد کے ہمراہ رہے چنانچہ یہ واقعہ اس قدر شہرت پکڑ
گیا کہ بعض لوگوں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ جتنے
یہودی عربوں کی حکومت میں تھے ان میں سے ایک
بھی ایسا نہ تھا جو اپنے دین پر قائم رہا ہو یا جس پر عربوں

کی یا ان کے فلاسفہ کی غلطیوں کا اثر نہ پڑا ہو۔ بہر حال یہودیوں کی تمام مذہبی جماعتیں رفتہ رفتہ فلسفۂ ابن رشد کی قائل ہو گئیں۔

ابن رشد کے عبرانی ترجمے

اس طرح جب یہود کا فلسفہ پورے طور پر فلسفۂ عرب کے خط و خال اختیار کر گیا تو اس کے بعد سے ارسطو کی تصنیفات جن کے ساتھ ابن رشد کی شرح بسیط بھی ہوا کرتی تھی فلسفۂ یہود کی تنہا بنیاد قرار دی گئیں۔ جن کو چھوڑ کر کسی اور طرف رجوع نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ صرف بنی اسرائیل کا طفیل ہے کہ ابن رشد کی شہرت ارسطو کے شارح کی حیثیت سے دنیا میں ہوئی۔ انہی لوگوں نے اسے ارسطو کی روح اور عقل کل کا خطاب دیا جس کی توثیق پڈوا کے مدرسہ نے کر دی حقیقت یہ ہے کہ ارسطو کی تصنیفات بلا شرح عبرانی کے قلمی نسخوں میں شاذ و نادر ہی ملیں گی مگر اس کے برخلاف دو رسالے جن کے ساتھ ابن رشد کی شرح یا تلخیصات بھی ہیں اکثر ملتے ہیں اور ارسطو ہی کے نام سے مزین نظر آتے ہیں۔ جب یہودیوں کی تہذیب و شائستگی نے اسلامی اندلس سے خروج کیا اور پراونس اور کوہ پیری

نیز کے قرب و جوار کے حصّوں میں داخل ہوئی تو عربی جو اس وقت تک ان کی معمولی علمی زبان تھی۔ عرف عام سے گر گئی اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ حکمت و فلسفہ کی تمام اہم تصانیف کا ترجمہ عبرانی میں ہو جائے۔ یہ عبرانی ترجمے اصل عربی متون کے ناپید ہونے کے باوجود اکثر خود باقی رہ گئے ہیں اور خاصی تعداد میں کتب خانوں میں مل جاتے ہیں حتیٰ کہ فلسفۂ عرب کی تاریخ لکھنے کے واسطے عربی زبان کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ ربی عبرانی کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ان ترجموں میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ بے حد آسان ہے۔ اصل متن کا در حقیقت ترجمہ کرنے کی بجائے اکثر عربی الفاظ عبری حروف میں لکھ دیئے گئے ہیں اور بہت سے عربی لفظ بالکل اپنی شکل میں محفوظ رکھے گئے ہیں۔ ہر ایک عربی مادہ کی بجائے عبری مادہ رکھ دیا ہے گو اس لفظ کے معنی دونوں زبانوں میں مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ صرف و نحو کی گردانوں میں بھی یہی رعایت مدّ نظر رکھی گئی ہے۔ اور یہ خصوصیت یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ اگر ایک خاص طریقہ سے کوشش کی جائے تو بلا تردد وہ عربی

متون جو یہودی مترجمین کے سامنے تھے پھر اپنی اصلی زبان میں منتقل ہو سکتے ہیں صرف چند خاص خط و خال کے رسالوں میں مثلاً تلخیص رسالۂ بلاغت و معانی تلخیص رسالۂ شاعری، تلخیص رسالۂ جمہوریت افلاطون اور تہافتہ التہافتہ جن میں مترجمین نے کچھ اپنے نام سے بھی بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ہم مذہب یہودیوں کی نظر میں دلچسپ معلوم ہونے کے لئے بعض ایسی جزئیات جو خاص امتیاز رکھتی تھیں اور ترجمہ نہیں ہو سکتی تھیں حذف کر دی گئی ہیں اور ان کی بجائے مترجم نے خود اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے اور کہیں مترجم نے اس کی زیادہ ضرورت سمجھی ہے کہ یہ عظیم الشان ترجمہ کے کام جو تمام تیرہویں صدی اور چودھویں صدی عیسوی کے حصۂ اول میں ہوتے رہے اس کا سہرا خاندان طبان کے سر باندھا جاتا ہے یہ خاندان در اصل اندلس کا تھا لیکن پھر آ کر لیونل میں رہنے لگا۔ اگر پیرس کے شاہی کتب خانہ کے قلمی نسخوں کی فہرست پر اعتبار کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس خاندان میں یہودا ابن طبان سب کا سردار تھا جسے مترجموں کا بادشاہ کہا کرتے ہیں۔ اسی نے ابن رشد کی شرح بسیط طبیعیات ارسطو و کتاب النفس

کتاب المائیات کا ترجمہ کیا تھا لیکن یہ غلطی ہے۔
یہودا بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوا ہے جب
کہ شرح ابن رشد کا عبرانی میں ترجمہ کرنے کا سوال ہی
پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ابن رشد
کی تالیفات طبیعیات کا ترجمہ سموئل ابن طبان نے کیا تھا۔ یہ
تمام ترجمے خاندان طبان کے تیسرے شخص کے ہاتھ کے
ہیں جس کا نام موسیٰ ابن طبان تھا۔ ایک طرح پر سیموئل
(آغاز سنہ ۱۳۰۰ء) ابن رشد کی تصنیفات طبعی و مابعد الطبیعی
کا پہلا عبرانی مترجم کہا جا سکتا ہے۔ اس کی ضخیم الشان
تصنیف "آراء الفلسفہ" ایک طرح کی دائرۃ المعارف
ہے جس میں لفظ بہ لفظ ابن رشد کو نقل کرتا چلا گیا ہے
اور کہتا ہے کہ اس سے زیادہ ارسطو کی تصنیفات کا
صحیح شرح کرنے والا کوئی نہیں گزرا۔ مصنف نے عربی
متون کی مدد سے اپنی کتاب لکھی ہے۔ اس عجیب و
غریب کتاب کا درس صرف اس وقت بند ہوا ہے جب
کہ چند سال بعد خود ابن رشد کے متون تمام و کمال
ہاتھ آ گئے۔ یہی حالت فلسفۂ مشائین کے اس مجموعہ
کی ہے جس کا نام طلب الحکمۃ ہے جسے یہودا ابن
سلومو کوہن ساکن طلیطلہ نے جو فریڈرک ثانی شاہ جرمنی کا

ملازم تھا تصنیف کیا تھا۔ یہودا نے ۱۲۷۴ء میں اپنی اس کتاب کا بہت سا حصہ ابن رشد کے طریق پر لکھا ہے۔ اس مصنف کی اصطلاحیں طلیطلیوں کی اصطلاحوں سے بہت مختلف ہیں جو اسرائیلی مدارس فلسفہ میں اس وقت تک قانونی اصطلاح کی طرح مستقل سمجھی جاتی تھیں شیم طاب ابن یوسف ابن فلا قوره جو ۱۲۲۶ء میں اندلس کے مقام پر پیدا ہوا تھا وہ بھی ابن رشد کے شروح سے بہت کام لیتا ہے اور بعض مقامات پر شارح اعظم کے بڑے بڑے جملے اور عبارت کی عبارت اپنی تصنیفات میں داخل کرتا جاتا ہے۔ یہی طریقہ جرشون ابن سلیمان نے اپنی کتاب الافلاک میں اختیار کیا ہے جو تیرہویں صدی کے نصف آخر میں لکھی گئی تھی۔ یہ پراونس کا باشندہ تھا جو نیپلز میں آکر رہ گیا تھا اور خاندان طبانی سے رشتہ رکھتا تھا جو سموئل کا داماد تھا۔ یہ صحیح معنوں میں ابن رشد کا پہلا مترجم ہے۔ یعقوب ابن ابی مریم جو ربی شمسون انطولی کا لڑکا تھا ان یہودیوں میں سے ہے جنہیں جرمنی کے شہنشاہ فریڈرک دوم کے دربار سے وظیفہ ملا کرتا تھا تاکہ وہ اہل عرب کے علوم و حکمت کی عام اشاعت کی تدبیروں میں بادشاہ کی اعانت کرے

جب اس نے قانون ارسطو کی شرح ابن رشد کا ترجمہ نیپلز میں ۱۲۳۲ء میں ختم کیا تو کتاب کے اختتام پر فریڈرک دوم کی فیاضیوں اور علوم حکمت کے ساتھ اس کے شغف کی بہت تعریف کی اور یہ تمنا ظاہر کی کہ کاش! حضرت مسیحؑ اسی کے زمانے میں تشریف فرما ہوں۔ انطولی نے مختصر المنطق کا ترجمہ عبرانی میں کیا ہے علاوہ ازیں پیرس، ٹیورن اور وائنا کے کتب خانوں میں اسی کے نام سے ابن رشد کی مختصر المجسطی کا ترجمہ بھی موجود ہے جو نیپلز کے مقام پر ۱۲۳۱ء میں ختم ہوا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ انطولی کے ترجمے جو خاص کر لاطینی ترجموں کے خیال سے کئے گئے تھے پراونس میں شائع ہونے کا موقعہ کم حاصل کر سکے ہوں کیونکہ اس کے تیس برس بعد تقریباً ۱۲۶۰ء میں موسیٰ ابن طبان اپنے اہل مذہب کے سامنے شروح ابن رشد اور اس کی بعض طبی تصنیفات مثلاً شرح ارجوزہ علی ابن سینا کا ایک مکمل ترجمہ پیش کر رہا ہے۔ اسی زمانے یعنی ۱۲۵۹ء میں سلیمان ابن یوسف ابن ایوب نے جو غرناطی الاصل تھا مگر بعد میں بیزرس میں جاکر مقیم ہو گیا تھا۔ ابن رشد کے شروح بسیط رسالۃ الفلک والعالم کا ترجمہ کیا ہے۔ ۱۲۸۴ء میں زکریا

ابن اسحاق برشلونی نے شروح بسیط رسائل طبیعات الفلک والعالم اور ما بعد الطبیعات کا ترجمہ کیا ہے۔ یعقوب بن مشیر نے ۱۲۹۸ء میں مختصر المنطق کا ترجمہ کیا اور ۱۳۰۲ء میں کتاب الحیوانات کے گیارہویں اور انیسویں مقالات کے شروح کا ترجمہ کیا۔

ان کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی کے بعد سے ان ہی شروحوں کے کم از کم تین مختلف ترجمے رائج تھے اور چودہویں صدی کے نصف اول میں نئے ترجموں کی جماعتیں مصروف کار نظر آتی ہیں۔ اس تحصیل حاصل کی کوشش پر حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ وسطی زمانے میں موجودہ ترجموں کو تلاش کرنے اور دستیاب کرنے سے زیادہ آسان یہ تھا کہ نیا ترجمہ کر لیا جائے۔ یہ اکثر ترجمے بعض بڑے بڑے لوگوں کے اشارہ اور توجہ سے ہوئے ہیں اور جن صوبوں میں ہوئے وہاں سے باہر نہیں گئے۔

ان مترجموں میں سب سے زیادہ کام کرنے والا اور سب سے زیادہ مخفی کلانیم بن کلونیم بن میئر تھا جو ۱۲۸۷ء میں آرلس کے مقام پر پیدا ہوا تھا۔ اس نے ۱۳۱۴ء میں کتاب الدلائل (طرق و براہین) براہین باطلہ اور معقولات ثانیہ کا ترجمہ کیا۔ ۱۳۱۷ء میں شروح رسائل ما بعد الطبیعات

طبیعات، الفلک والعالم، کون و فساد و شہاب ثاقب، ما ثیات کا ترجمہ کیا۔ اسی کے نام سے شرح کتاب النفس و شرح مکتوب اتصال عقل متفارقہ انسانی کا ترجمہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کلانیم لاطینی زبان سے واقف تھا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۳۲۸ء میں اس نے تہافتہ التہافتہ کا ترجمہ عربی سے عبرانی میں کیا ہے۔ اسی کے ہم نام کالو کلونیم یا کلانیم ابن داؤد نیپلز کا ایک طبیب تھا جو سولہویں صدی عیسوی میں وینس میں رہا کرتا تھا اور جس نے تہافتہ اور مکتوب بر اتصال عقل متفارقہ انسانی کا ترجمہ عبرانی سے لاطینی میں کیا ہے۔ ان دونوں کے ناموں سے مغالطہ بہت پیدا ہوتا ہے اور ان تینوں اشخاص کے ناموں کے ایک ہونے کی وجہ سے بہت سے مغالطے اور پریشان خیالی کے مشابہے رو نما ہو گئے ہیں۔ ربی سموئل بن یہودا مارسیلی نے ۱۳۲۱ء میں شرح اخلاق لنقوماخس اور جمہوریت افلاطون کے ملخص کا ترجمہ کیا۔ تدردس تدروسی (تھیوڈور پسر تھیوڈور) ساکن اربلیس نے ۱۳۳۷ء میں کتاب الدلائل (طرق و براہین) براہین باطلہ، رسالۂ بلاغت و معانی رسالہ شاعری اور رسالۂ اخلاق کی شرح بسیط کا ترجمہ کیا۔

ترجمہ کرنے والوں کی ایک کثیر تعداد اور بھی ہے جن کے نام کچھ مشہور و معروف نہیں ہیں اور ان کی صحیح تاریخیں بھی

معلوم نہیں ہوتیں مثلاً شم طاب بن اسحاق طرطوسی (مترجم شرح
رسالۂ طبیعات و کتاب النفس)، یعقوب بن شم طاب (مترجم
معقولات اولیہ)، یہودا بن تاشین میمون (مترجم الطبیعات
رسالۂ افلاک و مقال فی التولید) موسیٰ بن طبورو بن تکمول بن
شداثی (مترجم رسالہ افلاک)، موسیٰ بن سلیمان سیلونی (مترجم
رسالہ ما بعد الطبیعات) یہودا بن یعقوب (مترجم مقالہ ہائے
یازدہم تا نوزدہم کتاب الحیوان) سلیمان ابن موسیٰ الغوری (مترجم
رسالہ نوم و الیقظہ) وغیرہ نے اس کام کی انجام دہی میں بڑی
محنتیں کی ہیں۔ رسالہ جوہر الکون جو مختلف مضامین اور بحثوں
پر مشتمل ہے اور جس کا ترجمہ عربی سے لاطینی میں ہو چکا تھا
اس کا ترجمہ یہودا ابن موسیٰ بن دانیال رومی نے لاطینی سے
عبرانی میں کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اور بھی الٰہیات کے
رسائل مصنفہ البرٹ سینٹ طامس و گائیلس رومی ترجمہ کئے
یہود پر لاطینی علمائے الٰہیات کے اثر کی مثال صرف تنہا
نہیں ہے۔ پختہ مذہب عیسائیوں نے فلسفۂ ابن رشد کے
خلاف جو جنگ آزمائیاں کی ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم
ہوتا ہے کہ عبرانی مصنفین کی تصنیفات میں اس قسم کا اثر
کئی جگہ موجود ہے۔

وسطی زمانہ کی ادبی تاریخ میں یہ ایک عجیب بات نظر

آئی ہے کہ کتب علم و حکمت کی خرید و فروخت میں بہت ہما ہمی پیدا ہو جاتی ہے اور یورپ کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک کتابیں بڑی سرعت کے ساتھ پہنچ جائیں اور شائع ہونے لگی تھیں۔ ابی لارڈ کا فلسفہ اس کی زندگی ہی میں اندرون اٹلی تک پہنچ گیا تھا۔ مراکش اور قاہرہ میں جو کتاب لکھی جاتی تھی وہ اس سے کم مدت میں جتنی کہ آج کل ایک اہم کتاب کے کسی جگہ سے صرف چند میل کے فاصلہ تک پہنچنے میں لگتی ہے پیرس یا کولون میں مشہور ہو جاتی تھی۔

کتابوں کے اس طرح ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے میں یہودیوں نے بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔ جس کی افسوس ہے کہ تاریخ تمدن نے کافی داد نہیں دی۔ ان کی تجارتی سرگرمی اور غیر زبانوں کے آسانی سے سیکھ لینے کی خدا داد لیاقت نے اس قوم کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان قدرتی واسطہ بنا دیا تھا۔ اس بات کے سمجھنے کے لئے کہ بحر قلزم کے ساحل پر برشلونہ سے نیلطیہ تک یہودیوں کو کیا اہمیت حاصل تھی۔ ابن یامین ٹیوڈیلا دی کا روزنامچہ پڑھنا چاہئے۔ جو اُمراء و اکابر اور والیان ریاست ان کے روپیہ اور طبی مشورہ کے محتاج تھے وہ سب ان پر بہت

نوازشیں کیا کرتے تھے۔ صرف عوام الناس تھے جن کو ان سے بغض تھا۔ رہے علم دوست اشخاص تو وہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے کہ تحصیل فلسفہ کے لئے غیر مذہب کے استادوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کریں۔ حکمت کسی خاص مذہب و ملت سے مخصوص نہیں وہ سب کے لئے عام تھی۔ مسلمانوں اور اہل یورپ میں ایک جانب تو اندلس کے واسطہ سے اور دوسری طرف صقلیہ اور تیسری طرف سلطنت نیپلز کے ذریعہ سے تعلقات قائم ہوئے اور دونوں مقامات پر ترجمہ کا کام یکساں جوش و خروش کے ساتھ اور ایک ہی قسم کے اسباب و ذرائع کی مدد سے جاری رہا۔ تقریباً ہمیشہ ایک نہ ایک یہودی اور اکثر کوئی نومسلم ترجمہ کے اس کام کو سر انجام دیا کرتا تھا۔ ایک منشی جو اس تمام کام کی نگرانی کرتا تھا وہ اس ترجمہ کے لاطینی الفاظ کی صحت کا ذمہ دار ہوتا تھا اور خود اپنے ہی نام سے کتاب شائع کر دیتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہودی جو منشی مذکور کا معتمد ہوتا تھا اس کا نام احیاناً مدرج ہو جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ ایک ہی ترجمہ متعدد لوگوں کی طرف منسوب نظر آتا ہے بارھویں اور تیرھویں صدی میں ترجمے ہمیشہ عربی سے براہ راست کئے جاتے

تھے لیکن ایک مدت کے بعد یہ نوبت پہنچی کہ لوگوں نے حکمائے عرب کی کتابوں کا عبرانی ترجموں سے ترجمہ کرنا شروع کیا۔

جو خصوصیت ان ترجموں میں نظر آتی ہے وہی وسطی زمانہ کے تمام ترجموں میں پائی جاتی ہے یعنی لاطینی لفظ عربی لفظ کو اس طرح چھپائے رہتا ہے جس طرح کہ شطرنج کے مہرے بساط کے خانوں کو چھپائے رہتے ہیں۔ جملہ کی ترکیب لاطینی کی بجائے عربی ہوتی ہے۔ اکثر علمی اصطلاحات اور الفاظ جو مترجم کی سمجھ میں نہیں آئے وہ اسی طرح نہایت بھدے طریقہ پر دوبارہ لکھ دیئے گئے ہیں۔ فلسفہ کے ابتدائی زمانے میں اسی طرح لفظی ترجمہ کرنے کا طریقہ ہر جگہ عام نظر آتا ہے۔ وسطی زمانے میں لوگ ترجمہ کو صرف یہی سمجھتے تھے کہ یہ ایک بالکل سطحی مشین کی طرح کام کرنے کا طریقہ ہے جس میں مترجم اصلی متون کے مشکل اور ادق مقامات کی آڑ میں پناہ لے کر معنیٰ و مفہوم سمجھنے کا کام ناظرین ہی کے سپرد کر دیا کرتا تھا۔ وسطی زمانے کی ادبی تاریخ صرف اس وقت مکمل ہوگی جب قلمی مسودات کے لحاظ سے ان عربی کتابوں کے صحیح اعداد و شمار معلوم کر لیں گے جنہیں تیرھویں اور چودھویں

صدی عیسوی کے علماء پڑھا کرتے تھے۔ یہ ملحوظ خاطر رہنا ضروری ہے کہ اس زمانے کے لکھنے والے جو عربی مصنفین کی عبارتیں نقل کیا کرتے تھے ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کسی ترجمہ سے ماخوذ ہوں گی بلکہ ایک جگہ اگر کسی کتاب میں یہ عبارت نقل ہوئی ہے تو اصل کی بجائے نقل ہی سے وہ خود بھی نقل کر لینے میں مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن باجہ اور ابوبکر (ابن طفیل) کی عبارتیں صرف ابن رشد کی کتابوں سے نقل کی گئی ہیں اور الکندی، الفارابی، ابن جبرئیل، فلسفہ ابن لوقا اور میمونی کی تصانیف تیرہویں صدی کے پہلے شاید ہی کسی نے پڑھی ہوں۔ چودھویں صدی میں ابن سینا اور خاص طور سے ابن رشد تمام دوسرے فلاسفہ کی جگہ لے لیتے ہیں اور پندرہویں صدی میں صرف ابن رشد ہی تنہا رہ جاتا ہے جو فلسفہ عرب کی ترجمانی کرتا ہے۔

پہلا لاطینی مترجم

لاطینی اقوام میں سب سے پہلے جس شخص نے ابن رشد کو متعارف کرایا وہ میکائیل اسکاٹ تھا جو اس دور کے فلاسفہ میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔ راجر بیکن کہتا ہے کہ یہ ایک بہت اہم واقعہ تھا اور ارسطو کے طالع کی ایک مبارک ساعت

تھی کہ ۱۲۳۰ء میں میکائیل اسکاٹ اس کی تصنیفات کے نئے ترجمے اور عالمانہ شرحیں اور تلخیصات لے کر میدان میں آیا۔ یہ کونسی شرحیں تھیں جن سے لاطینی اقوام اس وقت تک ناواقف تھیں؟ قلمی نسخہ جات اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔ میکائیل اسکاٹ کا ذکر ان میں صاف طور پر موجود ہے کہ وہ ابن رشد کی دو کتابوں کا مترجم ہے جن کے نام یہ ہیں،

۱۔ ارسطو کے رسالہ الافلاک والعالم کی شرح
۲۔ کتاب النفس کی شرح

اوّل الذکر ترجمہ ایٹی این ڈی پرادنس کے نام ان الفاظ میں معنون کیا گیا ہے "جناب اسٹیفنس صاحب جو پرادنس کے رہنے والے ہیں آپ کی خدمت میں میکائیل اسکاتوس اس کتاب کو جسے میں نے لاطینی زبان میں مقالہ ہائے ارسطاطالیس سے ترجمہ کیا ہے بطور خاص پیش کرتا ہوں اور اگر ارسطو نے ترکیب عالم کے متعلق کہیں کوئی شے نامکمل چھوڑی ہے تو جناب کو اس کا تکلہ البطرنجی کی کتاب میں ملے گا۔ اس کا ترجمہ بھی میں نے لاطینی میں کر دیا ہے جس زبان میں آپ کو مہارت تامہ ہے۔"

موسیو رینان لکھتا ہے کہ "البطرنجی" نام میری نظروں

سے کہیں نہیں گزرا۔ میرے خیال میں یہ کتابت کی غلطی ہے
اور اصل نام "البطنی" ہے۔ محمد بن جابر البطنی (ولادت ۸۵۰ء
اور وفات ۹۲۹ء) جو موضع بطن (عراق عرب) کا رہنے
والا تھا اور عربوں میں ایک بہت بڑا ہیئت داں گزرا ہے
اس کی تصنیف "الفلک النجوم" بہت مشہور ہے اور
اس کا میلانش تھان نے ۱۵۳۷ء میں نیور ہبرگ کے مقام
پر لاطینی ترجمہ طبع کرایا تھا۔
صرف یہی دو شرحیں ہیں جن پر قلمی نسخوں میں میکائیل
اسکاٹ کا نام درج ہے لیکن قریباً ہمیشہ ان کے بعد ایک
خاص ترتیب کے ساتھ دوسری شرحیں سامنے آتی ہیں۔
یعنی شرح رسالۂ کون و فساد، شرح رسالۂ شہاب ثاقب،
شرح مختصر رسالۂ اشیائے طبیعیہ صغیرہ و جوہر الکون میکائیل
اسکاٹ کی طرف ان ترجموں کو بھی منسوب کیا جائے تو
ناواجب نہ ہوگا۔ کتب خانۂ ساربان اور کتب خانۂ نادیر
میں جو قلمی نسخہ جات ہیں ان دونوں نسخہ جات میں مذکورہ
بالا ترجمہ کے ساتھ ساتھ شرح رسالہ ہائے طبیعات وما
بعد الطبیعات بھی شامل پائی گئی ہیں۔ پھر ان کتابوں کا ترجمہ
بھی میکائیل اسکاٹ نے کیا ہے اور یہ عین ممکن ہے
اس لئے کہ موسیو ھدریو کو میکائیل کے مسودہ کا ایک

ناتمام نسخہ ملا ہے جس میں طبیعیات اور مابعد الطبیعیات
کے مسائل کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔
مگر موسیو جوردین نے جو میکائیل اسکاٹ کے ترجموں
کو شمار کرنے کے لئے فہرست کتب کو سند قرار
دیا ہے یہ صحیح نہیں کیونکہ بظاہر اس فہرست میں مذکورہ
کتابوں کے مصنفین اپنے قول کی بنیاد ایک دوسرے
قول کو بالکل بگاڑ کر ٹھہراتے ہیں جو کتب خانہ سار بان
کے نسخوں سے متعلق ہے اور ان کے پاس بھی میکائیل
اسکاٹ کے نام شرح کون فساد، اشیائے طبعیہ صغیرہ
شہاب ثاقب اور رسالہ جوہر الکون منسوب کرنے کے ان
وجوہ کے سوا جو ہمارے پاس ہیں اور کوئی دوسری وجوہ
نہیں ہیں وہ کسی شہادت کے بناء پر استناد نہیں کرتے
اور دیکھنے والوں کے پاس بھی قیاس ہی قیاس ہے جو قلمی
نسخوں کی ترتیب کو دیکھ کر قائم کیا گیا ہے لیکن یہ ترتیب
چونکہ از منۂ وسطی میں بھی بے وجہ اور من مانی نہیں ہوا کرتی
تھی اس لئے ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نسخے
در حقیقت وہی ہیں جو میکائیل اسکاٹ نے شائع کئے
تھے اور وہی نئے تراجم ہیں جن کو اس نے راجر بیکن
کے بیان کے مطابق ۱۲۳۰ء میں فلسفہ الہیات کے نصاب

میں داخل کیا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ راجر بیکن ایک انگریز حکیم تھا جو ۱۲۱۴ء میں الچسٹر (سومرسیٹ) کے مقام پر پیدا ہوا تھا اور ۱۲۵۷ء میں فرانسیسی راہبوں کی جماعت میں داخل ہو گیا تھا اور ۱۲۹۴ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس نے حکمائے عرب کی کتابوں کا بڑا مطالعہ کیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اس تاریخ سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ میکائیل اسکاٹ کی تصانیف اس انگریز راہب یعنی راجر بیکن کے علم میں کب آئیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ ولیم ڈلاورنی اور اسکندر ڈی ہیلس کو اس سے پہلے ابن رشد کی تصنیفات کا علم تھا۔ میکائیل اسکاٹ کا صرف ایک ترجمہ جو البطروجی کا ہے اس پر ایک تاریخ درج ہے اور یہ تاریخ ۱۲۱۷ء ہے۔ اسی زمانے میں ابن رشد کے ترجمے ہوئے ہوں گے اس لئے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ میکائیل اسکاٹ نے طلیطلہ میں صرف چند سال سے زیادہ قیام کیا ہو۔ ان ترجموں کے ساتھ ہی ساتھ اس نے ایک پیام فلسفہ بھی تصنیف کیا جو فریڈرک ثانی نے اطالیہ کے دار العلوموں کو روانہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک حکم عام بھی بھیجا تھا جس کے الفاظ یہ ہیں۔

"ہمارے فلاسفہ سے بعض وقت ارسطا طالیس
اور دیگر فلاسفۂ یونان و عرب کی تصنیفات
گذری ہیں۔"

میکائیل اسکاٹ نے طلیطلہ میں یہ ترجمہ تمام کیا جس نے اندلس سے مراجعت کے بعد مترجم کی شہرت بہت بڑھا دی اور جو ہنس ثانی (شاہ جرمنی) کے دربار میں اس کی رسائی کا ذریعہ ہوا۔ اس نے اس کام میں ایک یہودی سے جس کا نام اندری (ANDRE) تھا مدد لی تھی۔ راجر بیکن غصے میں آکر اسکاٹ کو سرقہ کا الزام دیتا ہے اور ملامت کرتا ہے کہ جن علوم سے یہ شخص اپنی تصنیفات میں بحث کر رہا ہے ان سے اور ان کی زبان تک سے بالکل ناواقف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جو لاطینی لوگ اس زمانے میں طلیطلہ جایا کرتے تھے وہ اپنے ماتحت کاتبوں یعنی مترجمین کی تصنیفات کو اپنے نام سے منسوب کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھا کرتے تھے اور جیسا کہ اس زمانے میں بھی ہے از منہ وسطیٰ میں مترجم کا نام عام طور پر بالکل فرضی اور برائے نام ہوا کرتا تھا۔

لیکن میکائیل اسکاٹ کے فلسفۂ ابن رشد کے بانی ہونے کے حقوق و وجوہ اور بھی ہیں۔ فرانسیسی مؤرخ موسیو ہوریو

کی نظر سے کتب خانۂ ساربان کے قلمی نسخہ میں بعض ایسے انتخابات گزرے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ میکائیل کی اس اہم ترین تصنیف سے لئے گئے ہیں اور جن مسائل پر ان میں بحث کی گئی ہے وہ بھی صاف صاف ابن رشد سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں مثلاً :۔

تمام عالم مدور ہے اور ہر مدور شے تکمیل ہوا کرتی ہے پس تمام عالم مکمل ہے لیکن ہر مکمل شے کے لئے حرکت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے پورے عالم کو حرکت کی ضرورت ہے لیکن بعض اجزاء جب اس تکمیل کو دیکھتے ہیں جو ان میں نہیں ہے تو ان تکمیلات کی حاجت کو محسوس کر کے اپنے آپ کو حرکت میں ڈالتے ہیں تاکہ وہ تکمیلات جو ان میں نہیں ہیں حاصل ہو جائیں پس ہمارے لئے سکون ہی میں امان ہے مگر عالم کا خاتمہ بھی اس کے اجزاء کی حرکت کے ذریعہ سے ہوگا۔

اور یہی ابن رشد کا قول ہے۔"

میکائیل اسکاٹ نے فریڈرک کے دربار میں جہاں وہ اس

عجیب طریقہ پر فلسفۂ عرب کا علمبردار سمجھا گیا تھا جو جو کام انجام دیئے ان کے لحاظ سے وہ ایک فاسد خیال منکروں کی جماعت کے سلسلہ کا آغاز کرنے والا کہا جاتا ہے لیکن ہاں ہم اس امر کا اس دور کے قریب قریب تمام علمائے یورپ نے اعتراف کیا ہے کہ میکائیل اسکاٹ ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے لاطینی اقوام کو ابن رشد اور اس کے فلسفہ سے روشناس کرایا۔

طبی تصانیف کا مترجم

ابن رشد کا دوسرا ترجمان ہرمان لالیمان تھا جو میکائیل اسکاٹ ہی کی طرح جرمنی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ (ہوہنسٹافن اور فریڈرک دوم اسی خاندان کے رکن تھے) راجر بیکن اپنی کتاب سوم میں اس شخص کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"ہرمانوس ایلمانوس وہ مترجم منفرد جو پہلے شاہ
چارلس کے دربار میں تھا"

عام طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہرمان نے ارسطو کے ان رسائل کی طرف توجہ کی جن کے ساتھ سب سے زیادہ بے توجہی برتی گئی تھی یعنی بلاغت و معانی۔ شاعری اور اخلاق و سیاسیات چونکہ ان رسائل کے عربی خلاصے دور دور پھیلے ہوئے تھے۔

اور ارسطو کے اصلی متون سے زیادہ آسانی کے ساتھ دستیاب ہو سکتے تھے اس لئے ہرمان نے انہی خلاصوں سے کام لینا پسند کیا۔ اس طریقہ پر اس نے ارسطو کے رسالۂ بالفاظ و معانی کی بجائے الفارابی کی شرح کا ترجمہ کیا اور اصل رسالۂ شاعری کی بجائے ابن رشد کے خلاصہ کا ترجمہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

"جب میں نے رسالۂ شاعری کے ترجمہ کی کوشش کی تو عربی اور یونانی بحروں کے تفاوت کی وجہ سے اس قدر دقتیں سامنے آئیں کہ اسے اختتام تک پہنچانے سے مایوس ہو گیا اس لئے میں نے ابن رشد کی کتاب کو ہاتھ میں لیا۔ اس میں مصنف نے اسی قدر درج کیا ہے جو سمجھ میں آ سکتا تھا۔ میں نے بھی جہاں تک اچھا ہو سکتا تھا لاطینی میں ترجمہ کیا۔"

دونوں ترجموں پر تاریخ و مقام طلیطلہ ۷۔ مارچ ۱۲۵۶ء درج ہے لیکن یہ بات صاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ یہ سنہ ہسپانوی سنہ ہے یا معروف عام شروح الفارابی کے دیباچہ میں ہرمان یہ بیان کرتا ہے کہ اس نے الاخلاق کا ترجمہ

عربی خلاصہ سے کیا تھا اور جس عربی خلاصہ کا وہ ذکر کرتا ہے وہ اصل میں ابن رشد کی شرح متوسط تھی۔ کتب خانہ لارنشین میں اس ترجمہ کا نسخہ موجود ہے اور ابن رشد کی تمام مطبوعہ تصانیف بھی اس میں پڑھی جا سکتی ہیں آخر میں ہرمان یہ لکھتا ہے کہ اس کتاب کو میں نے طلیطلہ کے کلیسائے تثلیثِ مقدس میں جون ۱۲۴۰ء کے پنجشنبۂ سوم کے روز ختم کیا۔ اس تاریخ کی صحت میں شبہ کیا جا سکتا ہے اور یہ شبہ بلاوجہ بھی نہ ہوگا کیونکہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ارسطو کے رسالۂ شاعری کا ترجمہ ۱۲۵۶ء میں ہوا تھا یعنی ہرمان کو سولہ برس طلیطلہ میں رہنا پڑا اور اس مدت میں اس نے صرف ایک یا دو ترجمے کئے۔ یہ مشکل سے باور کیا جا سکتا ہے۔ پیرس کے شاہی کتب خانے میں الاخلاق کے چھ مقالوں کا ایک چھوٹا سا اختصار موجود ہے جس کی سرخی یہ ہے یہاں سے المجموعہ شروع ہوتا ہے جو اسکندر فرودسی کے بعض پیرووں کا ترتیب دیا ہوا ہے اور جسے انہوں نے ارسطاطالیس کی کتاب موسومہ لنقوماجیسیہ اور بعض کے قول کے مطابق الاطلاق سے انتخاب کیا ہے اور ہرمانوس الیمانوس نے اسے عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔"

یہ خلاصہ ابن رشد کی شرح متوسط سے بالکل مختلف ہے۔

ممکن ہے کہ یہ بھی ابن رشد کا کیا ہوا ایک ایسا خلاصہ ہو جو موجودہ وقت تک نہیں پہنچا۔ بنڈینی اور موسیو جوردین دونوں سے ہربان کے ان تراجم کی بابت کچھ غلطیاں ہوئی ہیں بنڈینی نے یہ تو دیکھا نہیں کہ نسخۂ فلارنس کا متن اور ابن رشد کی شرح متوسط کا متن دونوں ایک ہی ہیں اور اس تقریظ کو جسے ابن رشد نے اپنی اس شرح کے خاتمہ کے بعد ہی اس کے ساتھ شامل کر دیا تھا ہربان کے نام سے ایک غیر شائع شدہ نسخہ کی طرح شائع کرا دیا۔ موسیو جوردین نے اس غلطی کو بجنسہٖ باقی رکھا اور بنڈینی کی تقریظ کو اسی طرح رہنے دیا اور جب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن نکلا تو اس میں تقریظ مذکور ابن رشد کے نام سے چھپی۔ نئے شائع کنندہ کو یہ بہت عجیب معلوم ہوا ہوگا کہ ابن رشد کی تقریظ کو اس طرح اس کی شرح سے جدا کر کے چھاپا گیا تھا لیکن یہ شاید محسوس نہیں ہوا کہ جس کتاب کے آخر میں یہ تقریظ تھی وہ ابن رشد کی وہی شرح ہے جو ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ مذکورہ تقریظ کے ساتھ چھپ چکی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز یہ بات ہے کہ ایک ایسی تصنیف کی بابت جو عام طور پر مسلمہ اور قابل اعتبار ہے موسیو جوردین نے شاہی کتب خانہ کے نسخہ جات کا حوالہ دے کر غلطیاں کی

ہیں۔ اوّل تو موسیو جوردین نے الاخلاق کے نسخے جو
ساربان کتب خانہ کی فہرست میں مذکور ہیں۔ ان سب کو
ایک ہی تصوّر کیا ہے درآں حالیکہ وہ مختصر خلاصہ جس
کے سوا کسی پر ہرمان کا نام نہیں صرف اسی خلاصہ پر ہرمان
کا نام درج ہے دوسرے مکمل ترجموں سے مماثلت نہیں رکھتا
اس کے علاوہ ان مختلف نسخوں کی ابتدائی سطروں کا اگر
بنڈینی کے مقدمۃ الکتاب سے مقابلہ کیا جائے تو اس
کا حسب ذیل نتیجہ نکلے گا یعنی :-

۱- فلارنس کا نسخہ جس پر ہرمان کا نام درج ہے وہ اور
پیرس کے نسخے ایک نہیں ہیں۔

۲- فلارنس کے جن دو نسخوں کا بنڈینی نے ذکر کیا ہے
وہ بھی یعنی ایک جلد سوم صفحہ ۱۴۰ دوسرا جلد سوم
صفحہ ۲۴۵ دونوں ایک نہیں ہیں۔ صرف پہلے پر ہرمان
کا نام درج ہے اور دوسرا ساربان کے نسخوں کے
مماثل ہے۔

چنانچہ دوسرے نسخہ میں جو تاریخ ۱۲۴۳ء درج ہے وہ
۱۲۴۴ء سے جو پہلے نسخہ پر درج ہے بالکل مختلف ہے
اور ہرمان کے ترجمہ کی تاریخ نہیں ہے۔ اس طرح پر غور
کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترجمہ کے پانچ نسخوں

کی بجائے جیسا کہ موسیو جوردین کا خیال ہے فلارنس کے کتب خانے میں صرف ایک ہی نسخہ ملتا ہے جس کا بنڈینی نے جلد سوم صفحہ ۱۷۸ پر ذکر کیا ہے۔

ہرمان نے شروح الفارابی کے دیباچہ ہی میں یہ اقرار کر لیا ہے کہ ان ترجموں کے کام میں اس کا بہت کم حصہ تھا۔ راجر بیکن جو کتاب بزرگ (OPUS MAJUS) اور کتاب سوم (OPUS TETUS) میں اکثر ہرمان کے ترجموں پر بہت جوش کے ساتھ اعتراض کیا کرتا ہے اپنی کتاب بزرگ کے صفحات ۵۹، ۲۷، ۱۱ پر وہ خود لکھتا ہے کہ:۔

"ہرمانوس نے اقرار کیا ہے کہ وہ بجائے مترجم کے محض ایک معاون کی حیثیت سے رہا ہے کیونکہ اندلس میں اس کے ساتھ اہل عرب تھے جنہوں نے ترجمہ کا بڑا کام انجام دیا ہے۔"

متعدد فہرستوں کے دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کام کے لئے ہرمان نے ایسے مسلمان نوکر رکھے تھے جو علمی زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسمول اور کہیں کہیں فعلوں کے آخر میں نون کا

بے تکلف استعمال نظر آتا ہے مثلاً ابن رشدین، ابو نصرین ابو بکرین، ذو تعدتین، ابی طیبی، شفاء الدعتی، علقمتین اس کے علاوہ طرز عبارت بالکل ناقابل فہم ہے اور اسی کو دیکھ کر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ راجر بیکن نے ہرمان کے ترجموں کو ناقابل فہم اور ناموزوں کیوں قرار دیا ہے۔

الغرض تیرھویں صدی عیسوی کے وسط تک ابن رشد کی قریب قریب تمام تصانیف عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہو گئیں۔ صرف القانون کی شروح اور تہافتہ التہافہ باقی رہ گئیں جو معلوم ہوتا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کے مسیحی فلاسفہ کے علم میں آئی ہی نہیں تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ آخر الذکر کتاب کا ایک قدیم لاطینی ترجمہ جو ۱۳۲۸ء میں کلونیم ابن کلونیم ابن میر یہودی نے کیا تھا موجود تھا لیکن اس ترجمہ کو لوگ بہت ہی کم پڑھتے تھے اس لئے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ سولہویں صدی سے قبل تہافتہ التہافہ کا کہیں ایک جگہ بھی منقول ہونا بیان کیا جا سکتا ہے۔

ابن رشد کی طبی تصانیف کا شہرہ اس کی فلسفیانہ کتابوں کے بعد ہوا۔ تیرہویں صدی کے المبارین سے جن کا ذکر موسیو لٹری (M. LITTRE) نے تاریخ ادبیات فرانس کی جلد بست و یکم میں کیا ہے صرف گلبرٹ

انگلیس (GILBERT ANGLAIS) جو تقریباً ۱۳۵۰ء میں گزرا ہے ایک ایسا شخص ہے جو ابن رشد کے اقوال نقل کرتا ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ آخرالذکر کی کتب فلسفہ کا بھی اسے علم ہو۔ اسپرنگر نے اپنی تاریخ فن طب باب دوم صفحہ ۴۵۲ پر اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ گلبرٹ نے ابن رشد عربی سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ سرچشمۂ حیات قلب ہے لیکن یہ مسئلہ ابن رشد کے نام کے ساتھ اس قدر خصوصیت نہیں رکھتا کہ لامحالہ یہی خیال کیا جائے کہ گلبرٹ نے کلیات ابن رشد کو پڑھا ہوگا۔ جیرار ڈی جیسے فرانسیسی مؤرخ جو دیگر اہل عرب کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ ابن رشد کا کچھ ذکر ہی نہیں کرتے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کلیات کا ترجمہ بھی ہو گیا تھا یا نہیں۔ کتب خانہ آرسینال کے طبقہ علوم و فنون ۴۶ میں جو نسخہ موجود ہے اس پر یہ عبارت درج ہے :

" ترجمہ شدہ از عربی بہ لاطینی "

اس میں عربی الفاظ صاف موجود نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی دوسری خصوصیات ہیں جن کی بناء پر بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ترجمہ عربی ہی سے کیا گیا تھا نہ کہ عبرانی سے۔ اور غالباً اس کی تاریخ تیرہویں

صدی عیسوی کے وسط میں قرار پائے گی۔ گائیلس رومی ۱۵۱۵ء) کے رسالہ ترکیب جسم انسانی میں بہت دبرس حد تک کلیات ابن رشد سے انتخابات کئے گئے ہیں لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ پیری دابانو (PIERRE-DA- BANO) نے اپنی طبی تصنیف امصلح (کنسی لیرڈ) میں جو ۱۳۰۳ء میں لکھی گئی تھی اور جس کے ہر صفحہ میں ابن رشد کے شروح سے منقولات موجود ہیں کلیات سے کچھ بھی نہیں لیا ہے۔

۱۲۸۴ء میں ارمنگاند ابن بلیز (ARMANGAND SON OF BLAISE) نے جو مانٹ پیلیئر (MONTPELLIER) کا طبیب تھا عربی سے ارجوزہ ابن سینا کا ترجمہ کرایا تھا۔ جس کا ذکر تاریخ ادبیات فرانس مؤلفہ موسیو لٹری کے باب ۲۲ میں موجود ہے۔ ریماند مارٹینی REYMOND MARTINIX نے اپنی کتاب حامی المذہب (PRIGIS FIDEI) میں عربی سے اس کتاب کے بعض مقامات نقل کئے ہیں لیکن ریمانڈ کو عربی اور عبرانی تصنیفات کا براہ راست علم تھا۔ رسالہ تریاق کا ایک پرانا ترجمہ کتب خانہ آرسینال (علوم و فنون ۷۱) کے نسخوں میں موجود ہے۔ قوانین ادویہ مجیبہ کا ترجمہ ۱۳۰۶ء میں عربی زبان سے ہوا تھا جیسا کہ

عمارت کتب قدیمہ کے اس نوٹ سے ظاہر ہوتا ہے،

"ان میں وہ عام اصول درج ہیں جو ابولیس اعظم (ABOLYS) یعنی ابن رشد نے ادویہ مجیبہ کے متعلق مدون کئے تھے ان کا ترجمہ عبرانی سے لاطینی میں ماسٹر جان ڈی پلینس دی مانٹ رگالی نے جو البین واقع طلانسہ کے امور مذہبی کے علاقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ ۱۳۰۳ء میں کیا اور ان کی شرح ماسٹر مینو (MASTER MAYNO) نے کی جو پہلے یہودی تھا اور فرانس سے یہودیوں کے خارج البلد ہونے پر عیسائی ہو گیا اور اپنا نام جان رکھا۔"

اب یہ معلوم ہوا کہ ابن رشد کی طبی کتابوں کا ترجمہ زیادہ تر مدرسۂ مانٹ پلیئر نے کیا ہے یہ کام بھی حسب معمول یہودیوں کی مدد سے کیا گیا ہے بہت سے واقعات ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مان پلیئر کے تعلقات اندلسی عربوں کے ساتھ تھے۔ نیز یہودیوں کو وہاں کیا اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور انہوں نے اس مدرسۂ عظیم کی رونق میں کیا حصہ لیا ہے۔

لاطینی لوگ مختصر المجسطی سے لاعلم تھے۔ موسیو لیٹری نے برنارڈ ڈی ورڈون کے رسالہ ہیئت میں جو تقریباً سنہ ۱۳ء میں لکھا گیا ہے ابن رشد کے بہت سے انتخابات دکھائے ہیں خاص طور پر ان مقامات کے جو دائرہ در دائرہ کے مسئلہ سے متعلق ہیں لیکن ان مضامین پر شروح کتب فلسفہ میں بھی اکثر بحث کی گئی ہے۔ خصوصاً ما بعد الطبیعات کے مقالہ ہائے نہم و دوازدہم میں یہ بحث کافی تفصیل سے کی گئی ہے

مخالفین کا انداز فکر

فلسفہ ابن رشد کو جن مخالفین سے سابقہ پڑا ہے ان میں سینٹ طامس سب سے زیادہ سخت ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شارح اعظم ابن رشد کا سب سے پہلا تلمیذ بھی یہی ہے۔

البرٹ ہر چیز میں ابن سینا کا مرہون منت نظر آتا ہے اور سینٹ طامس فلسفی کی حیثیت سے قریب قریب ہر شے میں ابن رشد کا خوشہ چین ہے۔ سب سے اہم شئے جو اس نے ابن رشد سے حاصل کی وہ فلسفیانہ تحریروں کا انداز بیان ہے اور یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ابن رشد بلا شک و شبہ اس طرز و انداز کا اوّلین

موجود ہے جیسا کہ شروح بسیط سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان شرحوں میں وہ متن کے ہر فقرے کو الگ نقل کر کے اس کی تشریح کرتا ہے اور پھر تمام مالہٗ و ما علیہ کو بیان کرتا ہے۔ ابن سینا اور اس کے متبع البرٹ نے ارسطو کے رسائل کے نام پر نام رکھ کر انہی مضامین پر اپنے رسالے ترتیب دیئے ہیں لیکن اپنی شرح کو اس حکیم کے متون کے حوالوں سے نمایاں نہیں کیا۔ بخلاف اس کے ابن رشد اور سینٹ طامس دونوں ارسطو کے متن کو فقرہ وار درج کرتے جاتے ہیں اور ہر ایک جملہ کی نہایت تحمل کے ساتھ شرح کرتے جاتے ہیں۔ البرٹ کی صرف ایک کتاب ہے یعنی شرح سیاست ارسطو جو اس نے ابن رشد اور سینٹ طامس کے انداز پر لکھی ہے لیکن ایسے نہایت مسلمہ وجوہ ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ کتاب اس کی نہیں ہے اور کم سے کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ شرح البرٹ کی تصنیف کردہ ہے تو اس نے دیگر شروح کے بعد اسے لکھا ہوگا یعنی اس وقت جب کہ سینٹ طامس کی شرحیں اس کی نظر سے گذر چکی ہونگی۔

البرٹ تو متن سے کسی قسم کا تعرض کئے بغیر صرف تلخیص کرتا جاتا ہے لیکن اس کے برعکس سینٹ طامس

اصل کتاب کی فقرہ وار شرح کرتا ہے ۔ ٹالومی دی لیکوس (TOLOME DE LUCOUES) نے جب یہ بیان کیا تھا کہ پوپ اربن چہارم کی مذہبی حکومت کے زمانے میں سینٹ طامس نے رومتہ الکبریٰ میں بیٹھ کر فلسفۂ ارسطو کی شرحیں لکھیں تو اس کا مطلب یہی تھا ٹالومی کے الفاظ یہ ہیں :۔

"اس نے (سینٹ طامس نے) ان کے لکھنے میں ایک بالکل جدید اور انوکھا طریقہ اختیار کیا ہے"

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شرح کرنے کا یہ نیا طریقہ جس سے پہلے وہ ناواقف تھا اس نے بھلا کس سے سیکھا ہوگا ؟ اس کے جواب میں بلا تردد کہا جا سکتا ہے کہ ابن رشد شارح ارسطو سے ۔ اس طرح پر حکمائے مدرسین کی جو دوہری خدمت ابن رشد نے کی ہے وہ سینٹ طامس کی خصوصیات میں صاف نظر آتی ہے ۔ یعنی ایک طرف تو وہ (ابن رشد) ارسطو کا سب سے بڑا شارح کہلاتا ہے ۔ لوگ اس کی عزت کرتے اور اس سے سند لیتے ہیں لیکن دوسری طرف غلط عقائد کا خیال لوگوں میں اس کے برخلاف جذبہ پیدا کرتا ہے ۔

سینٹ طامس اپنے دلائل خاص طور سے مسئلہ اتصال عقل کی تردید میں زیادہ صرف کرتا ہے اپنی تصنیفات مجموعہ عقائد مذہبی، کتاب المجموعۃ علی رد اہل الشرک والزندقہ اور اپنی شرح کتاب النفس و مسائل نزاعی بر نفس میں بار بار اس مسئلہ کی تردید کرتا ہے مگر پھر بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی اور آخر کار اس مضمون پر ایک خاص رسالہ تصنیف کرتا ہے جو مقالہ فی اتصال العقل علی خلاف ابن الرشد، اس رسالہ کی تصنیف کے وقت اگرچہ مخالفین میں بہت سے لوگ سینٹ طامس کی نظر میں تھے لیکن جو اسلوب بحث وہ اختیار کرتا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مطمح نظر ایک خاص مدرسہ تھا۔ جس کا دعویٰ یہ تھا کہ لاطینی علماء کے مقابلہ میں جو متکلمین کے زمرہ میں تھے یہ مدرسہ فلسفۂ ارسطو کے نکات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے اور خود ابن رشد کو اپنے لئے سب سے اعلیٰ ترین سند تصور کرتا ہے یعنی علمائے مذہبی کی سند سے بھی بلند تر مرتبہ اس کی سند کو دیتا ہے۔ سینٹ طامس یہ دیکھ کر سخت غصہ میں آتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے پیرو ایک ایسے شخص کے شاگرد بنتے جاتے ہیں جس کے اپنے عقائد بھی صحیح نہ تھے اور دیگر تمام

علماء سے بڑھ کر اس شخص کے اقوال کو مستند سمجھتے ہیں جو ارسطو کا پیرو ہونے کی بجائے اصل میں اس کے فلسفہ کو بگاڑنے والا تھا۔ انہی خیالات کی بناء پر سینٹ طامس ابن رشد کی تردید کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے لیکن لاطینی علماء کے اقوال کی سند نہیں لیتا اور کہتا ہے کہ ہر شخص کے لئے وہ سند قابل قبول نہیں ہو سکتی اور اس کی بجائے ان دلائل و براہین سے کام لیتا ہے جو یونانیوں اور عربوں سے عاریتاً لینی پڑتی ہیں وہ کہتا ہے کہ نہ تو ارسطو کا خیال یہ تھا اور نہ اسکندر افرودسی کا اور نہ ابن سینا کا۔

ابن رشد پر جو حملے کئے گئے ہیں وہ سینٹ طامس اور مدرسہ ڈامنی نیکی دونوں نے متفقہ طور پر کئے ہیں۔ اور ان کا مقصود یہ ہے کہ شارحین ابن رشد اور خصوصاً عربوں کو بھینٹ چڑھا کر فلسفۂ مشائین کو کسی قدر موافق مذہب ظاہر کیا جا سکے۔ اس وقت سے برابر یہ کوشش ہوتی رہی ہے کہ ارسطو روح کو قابل فنا تسلیم کرتا تھا اور فطری مذہب کے دیگر عقائد پر بھی ایمان رکھتا تھا۔ ان چند سخت الفاظ کے علاوہ جو سینٹ طامس نے اپنے رسالۂ اتحاد عقل میں استعمال کئے ہیں وہ کسی

جگہ ابن رشد کو مذہب کا منکر نہیں کہتا اور کہیں ایسا غصہ و غضب ظاہر نہیں کرتا جو ریمانڈ للی (RAYMOND LULLE) اور پیٹرارکا (PETRARCA) نے ظاہر کیا ہے۔
سینٹ طامس کے نزدیک ابن رشد ایک غلط عقائد رکھنے والا حکیم تھا جس پر ترس کھانا چاہیئے نہ کہ منکر مذہب جس کو اہانت کے قابل سمجھا جائے۔ وہ ابن رشد کے فیضان کا اس قدر زیادہ مرہون منت ہے کہ اسے برا نہیں کہنا چاہتا۔ بہرحال ابن رشد کے مخالفین میں وہ نمایاں مقام رکھتا ہے۔

سینٹ طامس کے علاوہ ابن رشد کے فلسفہ کی مخالفت میں جن لوگوں نے سرگرمی کا اظہار کیا اور اس موضوع پر مستقل تصانیف کیں اس میں ولیم ڈاورنی (WILLIAM D, AUVERGNE) البرٹ اعظم (ALBERT THE GREAT) مدرسہ ڈامی نیکی، گائیلس ڈی روم، ریمانڈ للی، سینٹ فرانسس اور اس کے شاگرد علماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن اس مخالف کے وسیع سلسلہ کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابن رشد اور اس کے فلسفہ نے یورپ کے اکثر و بیشتر ممالک پر وہ گہرا اثر ڈالا جو اور کسی فیلسوف

کے نظریات پیدا نہ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یورپ کا گوشہ گوشہ ابن رشد کی عظمت کے اعترافات سے گونج اٹھا اور ممالک مغرب کے بڑے بڑے فاضلوں اور فیلسوفوں کے لئے ابن رشد کے فلسفیانہ رموز و نکات کی پیروی کے سوا عقلی و ذہنی ترقی کی کوئی راہ بھی قابل التفات نہ رہی اگرچہ مخالفین کے گروہ نے جو اس زمانے کے بڑے بلند پایہ فلاسفروں پر مشتمل تھا یورپ سے ابن رشد کے فلسفہ کا اثر زائل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی، اس کے نظریات کی تردید میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے، اس کے عقائد پر طرح طرح کے ناگوار حملے کئے اور کوئی ایسی بات باقی نہ چھوڑی جس سے کسی کی شخصیت کو داغ دار کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے لیکن ابن رشد کی علمی عظمت، فلسفیانہ ژرف نگاہی اور محققانہ بصیرت نے اہل یورپ کے باشعور ذہنوں پر جو نقش ثبت کیا تھا وہ کسی کوشش اور کسی سرگرمی سے محو نہ ہو سکا۔ ان امتیازی خصوصیات اور تاریخی اعتبارات کی بنا پر بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابن رشد سرزمین اندلس کا وہ فیلسوف اعظم، وہ عالم بے بدل اور وہ حکیم لاثانی تھا جس کی نظر صدیوں تک زمانہ

پیدا نہ کر سکا اور جس کے علم و کمال کے سامنے اس
دور کے بالخصوص اور ادوار ما بعد کے بالعموم فضلائے
حکمت و فلسفہ فرط ادب سے سرنگوں رہے۔

۲۔ علامہ ابن باجہ

اُندلس کی مردم خیز سرزمین کو جن علمائے کبیر اور فلاسفۂ عظیم کے کمال علم کی بدولت آسمان بننے کی سعادت حاصل ہوئی ان میں علامہ ابن باجہ کو گل سرسبد کی حیثیت سے دنیا میں شہرت کے نصف النہار تک پہنچنے کا موقع ملا اور اپنے علمی کارناموں سے ایک ممتاز و منفرد مقام حاصل کرنے کی عزت نصیب ہوئی۔ ابن باجہ اندلس کا وہ عدیم المثال فیلسوف اور بے نظیر حکیم و فاضل تھا۔ جس کے فیوضِ تربیت نے ابن رشد جیسے نادر روزگار حکماء و فضلا کو جنم دیا۔

شیخ الفلسفہ علامہ ابن باجہ کا نام محمد بن یحییٰ بن باجہ ہے وہ اندلس کے چھوٹے سے شہر سرقسطہ (سرگوسہ) میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا اور اسی جگہ تربیت و تعلیم حاصل کی۔ ابھی ابن باجہ نے عنفوان شباب ہی میں قدم رکھا تھا کہ اس کے فضل و کمال کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا اور اسی شہرت کو مدنظر رکھتے ہوئے سرقسطہ کے رئیس ابوبکر بن ابراہیم صحراوی نے ابن باجہ کو اپنی نیابت یعنی وزارت کے عہدہ پر فائز کر دیا لیکن اسی کے ساتھ فلسفیانہ مذاق میں ابن باجہ کی جس قدر شہرت بڑھتی جاتی تھی اسی قدر عوام میں اس کے بر خلاف بدظنی پھیلتی جاتی تھی۔ اس زمانے میں بنو ہود کے امراء اس خوبی میں خاص طور پر مشہور تھے کہ وہ حکماء اور فلاسفہ کی قدردانی کو عوام کی رضا مندی پر مقدم رکھتے تھے۔ ابوبکر کو امرائے بنو ہود سے ہمسری کا دعویٰ تھا۔ اس لئے اس نے بھی چند روز تک عوام کی پروا نہ کی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوجی جوانوں تک برہم ہو گئے اور ایک کثیر جماعت ملازمت چھوڑ کر چلی گئی جس سے علاقہ بھر میں انتشار و تفرقہ کی فضا رد ہو گئی۔ ابن باجہ نے جب یہ صورت حال دیکھی اور محسوس کیا کہ اس کے تقرر سے

عوام کے افتراق کا شکار ہونے اور بدنظمی پھیلنے کا خطرہ ہے تو اس نے رئیس کے دربار سے علیحدہ ہو جانا ضروری سمجھا چنانچہ اس نے مجبوراً دربار کو چھوڑ دیا اور مراکش میں جا کر علیمین کے دربار میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں اس کی قدر تو بہت ہوئی لیکن موت نے اسے اپنی مقبولیت سے فائدہ اٹھانے کی مہلت نہ دی اور وہ ۵۳۳ھ میں اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ آثار الازھار میں اس کے مصنف نے امیر رکن الدین بیبرس کی کتاب زبدۃ الفکرۃ فی تاریخ الہجرۃ سے نقل کیا ہے کہ لوگوں نے حسد سے اس کو زہر دے دیا تھا۔ یہ روائت صحیح ہو یا نہ ہو مگر اس قدر مسلم ہے کہ عوام اس کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔ اس کا ثبوت علامہ ابن ابی اصیبعہ کے حسب ذیل الفاظ سے بخوبی ملتا ہے جو اس نے ابن باجہ کے حالات میں تحریر کئے ہیں وہ لکھتا ہے:۔

بلی بمحن کثیرۃ وشناعات من العوام
وقصدوا ھلاکہ مرات

ترجمہ اس کو بہت سی مصیبتیں پیش آئیں اور عوام اس کو برا بھلا کہتے تھے اور چند بار لوگوں نے اس کو مار ڈالنے کا قصد کیا۔

علامہ ابن ابی اصیبعہ نے ابن باجہ کے حالات قلمبند کئے ہیں لیکن نہایت اختصار کے ساتھ۔ البتہ آثار الادھار میں تفصیل ہے لیکن اس کا ماخذ مشرقی کتابیں نہیں بلکہ یورپ کی تصنیفات ہیں۔ نفح الطیب میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ وہ فن موسیقی میں ابو نصر فارابی کا ہمسر ہے اور اسپین میں جو راگ مشہور ہیں وہ اسی کی ایجاد ہیں ابن باجہ کو علوم عقلیہ میں جو کمال حاصل تھا اس کے لحاظ سے وہ اندلس کا ارسطو کہا جا سکتا ہے۔ ممالک مشرقیہ میں بھی فارابی اور یعقوب کندی کے سوا کوئی اس کا ہم پایہ نہیں پیدا ہوا۔ علوم و فنون کو اس نے جو ترقی دی اس کو ذیل کے عنوانوں میں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ ارسطو کی تصنیفات کی شرحیں لکھیں۔

۲۔ فلسفہ کی شاخوں پر مستقل کتابیں لکھیں جن میں اپنی ذاتی تحقیقاتیں درج کیں ابن ابی اصیبعہ نے اپنی تصنیف طبقات الاطباء میں ان تصانیف کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

۳۔ امام غزالیؒ کے برخلاف یہ ثابت کیا کہ علوم نظریہ ادراک حقائق کے لئے کافی ہیں علوم کشفیہ کی ضرورت نہیں۔

۴۔ موسیقی پر نہایت محققانہ کتاب لکھی اور بہت سے راگ خود ایجاد کئے ابن باجہ نے جس کام کو شروع کیا ابن رشد نے اس کو انجام تک پہنچا دیا اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ شاگرد نے استاد ہی کی رہنمائی سے اس پرُ خطر وادی میں قدم رکھا اور یہ منزل طے کی۔

اس موقع پر یہ واقعہ افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اسلامی کتب خانے ابن باجہ کی تصنیفات سے بالکل خالی ہیں البتہ یورپ میں کچھ کچھ پتہ چلتا ہے۔ منطق میں اس نے جو رسالے لکھے تھے وہ اسپین کے کتب خانہ اسکوریال میں محفوظ ہیں۔ ایک رسالہ جس کا نام الوداع ہے اس کا ترجمہ جو یہودیوں نے عبرانی زبان میں کیا تھا فرانس کی پبلک لائبریری میں موجود ہے۔ حیلۃ المعتزل اس کی مشہور کتاب بجائے خود ناپید ہے لیکن موسیٰ یہودی نے شرح رسالہ حی بن یقظان میں اس سے اکثر فوائد نقل کئے ہیں۔

بہ حقیقت اس دور کے تمام علماء و فلاسفہ نے تسلیم کی ہے کہ علوم عقلیہ میں ابن باجہ اپنے زمانے کا ارسطو تھا۔ ابوالحسن ابن الامام لکھتا ہے کہ ابو نصر فارابی کے بعد اس کے مرتبہ کا کوئی حکیم نہیں پیدا ہوا اگر ابو علی ابن سینا

اور امام غزالیؒ سے جنہوں نے مشرق میں علوم عقلیہ کو الفارابی کے بعد زندہ کیا ابن باجہ کا مقابلہ کیا جائے تو شائد ابن باجہ کا پلہ جھک جائے گا بہرحال اس میں شک نہیں کہ یہ تینوں حکیم اپنے وقت کے ائمہ فن تھے۔ ابن باجہ کا زمانہ سنہ ۱۱۲۰ء کے اوائل کا ہے مگر تاریخ وفات کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا کوئی کہتا ہے کہ ۵۳۳ھ میں وفات پائی اور کوئی کہتا ہے کہ ۵۲۵ھ میں فوت ہوا تاہم یہ صحیح ہے کہ ابن باجہ نے بہت تھوڑی عمر میں وفات پائی حتیٰ کہ تیئیس ۲۳ برس کی عمر میں اس جہان سے گزر گیا اور مدینہ فاس میں ابوبکر بن العربی کے قریب دفن کیا گیا۔ اس کی تصنیفات کے نام درج ذیل ہیں:۔

۱۔ شرح کتاب السماع الطبعی لارسطاطالیس
۲۔ القول لبعض کتاب الآثار العلویہ لارسطاطالیس
۳۔ القول علی الجزء الآخر من کتاب الحیوان لارسطاطالیس
۴۔ الکلام علی کتاب الکون والفساد لارسطاطالیس
۵۔ کلم علی بعض کتاب النبیات لارسطاطالیس
۶۔ قول فی التشوق الطبیعی والماہیت
۷۔ رسالۃ الوداع
۸۔ ضمیمہ رسالۃ الوداع

۹۔ کتاب فی اتصال العقل بالانسان

۱۰۔ قول علی قوت نزوعیہ

۱۱۔ تدبیر المتوحد

۱۲۔ کتاب النفس تعالیق علی کتاب ابی نصر فی الصناعۃ الذہنیہ

۱۳۔ فصول قلیلۃ فی السیاسۃ المدنیہ و کیفیۃ المدن و حال المتوحد

۱۴۔ کتاب التجربتین علی ادویہ ابن وافد۔ اس کتاب کی تصنیف میں ابو الحسن صفیان اس کے ساتھ شریک تھا۔

۱۵۔ اختصار الحاوی للرازی

۱۶۔ کلم غایۃ الانسانیۃ

۱۷۔ کلم فی الامور التی بہا یمکن الوقوف علی العقل الفعال

۱۸۔ کلم فی الاسم والمسمیٰ

۱۹۔ کلم فی البرہان

۲۰۔ کلم فی الاستقسات

۲۱۔ کلم فی الفحص عن النفس النزوعیہ

۲۲۔ کلم فی المزاج

ان کے علاوہ ابن باجہ کی اور بھی تصانیف ہیں جن کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔

ابن باجہ شعر و شاعری میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ چنانچہ وفیات الاعیان میں اس کا کچھ کلام بھی نقل کیا گیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ جب موت کا وقت قریب آیا اس کی زبان پر ذیل کے دو شعر جاری تھے۔

اقول النفسی حین قابلنا الذری

جب موت کا سامنا ہوا اور جان

فراغت فرارامنہ یسری الی یمنی

اس سے چھپنے لگی تو میں نے کہا

قفی تحملی بعض الذی تکرھینہ

بس ٹھہر اور گوارا کرلے اس امر ناگزیر دوناگوار کو

فقد طال ما اعتدت الفرار الی الاعنی

بہت دنوں تک زندگانی کے مزے اٹھا چکی

ابن باجہ کا مولد باجہ سرزمین اندلس کا ایک شہر ہے جس کا یہی نام ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ابن باجہ کا یہ نام شہر باجہ ہی کے نام کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ وفیات الاعیان میں لکھا ہے کہ لفظ باجہ کا تلفظ بہ تشدید جیم کے ساتھ صحیح ہے اور فرانسیسی زبان کی لغت میں چاندی کو باجہ کہتے ہیں اگر یہ وضاحت صحیح اور درست ہے تو ممکن ہے کہ اہل مغرب نے لفظ فضہ کو بگاڑ کر فرانسیسی

زبان میں اس کی شکل باجہ بنا لی ہو۔

قریب قریب تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ ابن رشد علامہ ابن باجہ کے شاگردوں میں سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی فلسفہ کی کتابوں میں ابن باجہ کا نام بڑی عزت سے لیتا ہے اور اس کے اقوال کی بڑی وقعت ظاہر کرتا ہے۔ ابن طفیل بھی اپنی کتابوں میں ابن باجہ کی بہت مدح و ستائش کرتا ہے اسی طرح لوئیس نے بھی اپنی تاریخ فلسفیات میں ابن باجہ کا ذکر کیا ہے مگر نواب عماد الملک اور علامہ شبلی کے بیان کے مطابق اس نے کوئی ایسی نئی بات نہیں لکھی جس کا حوالہ دیا جائے اندلس کے طول و عرض میں فلسفہ کی تعلیمات اور نامور فلاسفہ کے خلاف جب طرح طرح کی تخریبی کارروائیاں شروع ہوئیں اور بڑے بڑے فلاسفہ وقف زندان کر دیئے گئے تو ان میں علامہ ابن باجہ بھی اس مخالفت کے طوفان میں سلامت نہ رہ سکا اور اسے بے دینی کے الزام میں ماخوذ ہو کر محبس میں جانا پڑا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابن باجہ پر عائد کردہ یہ الزام صحیح تھا یا غلط اور اس کے خیالات واقعی مشکوک تھے یا نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ دوسرے فلاسفہ کے ساتھ اسے بھی

خلیفہ وقت کے زیر عتاب آنا پڑا۔ اس سلسلہ میں لاؤن افریقی کا بیان ہے کہ ابن رشد کا باپ اس زمانے میں قاضی القضاۃ تھا اور اسی کے اثر و رسوخ سے ابن باجہ کو رہائی حاصل ہوئی۔ لاؤن افریقی کے متعلق یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ وہ غلط باتیں بھی کر دیتا ہے اس لئے معلوم نہیں اس کا یہ بیان کیسا ہے؟

علامہ ابن باجہ اندلسؒ کے عربی فلسفہ میں در حقیقت بہت مشہور و معروف، بڑا نامور اور نہایت فاضل حکیم و فلیسوف تھا اور علم و کمال میں اس کی شخصیت یگانہ روزگار تھی حتیٰ کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے یہ کام اپنے ذمے لیا کہ امام غزالی کے مقابلے میں عقل کی حکومت منوا کے چھوڑے۔ امام غزالیؒ نے حکمت کے خلاف دلائل دیئے اور یہ دعویٰ کیا کہ انسان صرف اپنے عقلیہ کے فعل کا ازالہ کرنے سے درجہ کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں امام غزالیؒ نے اپنے دلائل کی بنیاد جن نظریات اور جن اصولوں پر رکھی تھی ان کا ماحصل یہ ہے کہ :-

"خدا ماورائے عقل ہے۔ عقل مخلوق ہے
اور اپنے خالق کے صفات و ذات کی
محیط نہیں ہو سکتی۔ عقل کی مدد سے معرفت

الٰہی حاصل کرنا اہل تصوف کے نزدیک ناممکن ہے۔ قوائے عقلیہ کے افعال کے ازالہ سے جو مراد ہے وہ اس شعر سے ظاہر ہوتی ہے ؎

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
گر نہ بینی سرِ حق بر من بخند

چشم و گوش و لب کو بند کرنے سے ظاہری قوائے حسیہ کے افعال کو روک دینا مقصود ہے کیونکہ یہی توجہ تام اور تزکیہ نفس میں حارج ہوا کرتے ہیں۔ ان قوائے ظاہری کے علاوہ قوائے باطنی بھی ہیں جن کی اہمیت کا اندازہ اہل فلسفہ نے نہیں کیا ہے۔ جب ظاہری قواء کا فعل بند ہوتا ہے تو ان باطنی قواء کا فعل جاری ہو جاتا ہے جن کی ترقی منجر بہ کمال ہوتی ہے۔"

علامہ ابن مسکویہ اپنی مشہور و مستند تصنیف "فوز الاصغر" میں لکھتے ہیں کہ:۔

"حکماء و عقلا نے اس مطلوب شریف

یعنی معرفت الٰہی کے حاصل کرنے کے
واسطے شدید ریاضتیں اور سخت تکلیفیں برداشت
کیں اور ریاضتوں کا خوگر ہو کر بتدریج
ترقی کی تب کہیں جا کر اس قدر مشاہدہ
کر سکے جس قدر کہ مخلوق اپنے خالق کا
کر سکتی ہے اور حقیقت میں سوائے ان
ریاضات اور تدریجی ترقیات کے اور کوئی
طریقہ بھی حق شناسی کا نہیں ہے حقیقت
یہ ہے کہ ہماری عقلیں جو روحانیت اور
الٰہیات کے ادراک سے قاصر ہوتی ہیں
اس کا سبب یہی ہے کہ انسان تمام موجودات
جسمانی کا آخری مرتبہ ہے اور جملہ ترکیبات
عنصری خلقت انسانی پر آکر ختم ہوتی ہیں
اور کثرت حجابات اور تراکیب مادیت
عقل جیسے جوہر منور کے لئے پردہ ہو
جاتی ہیں اور یہ ہیولانی اور مادی حجابات
عقل نورانی کو ادراک معقولات سے باز
رکھتی ہیں اس لئے کہ عناصر بسیط جب
اپنی ابتدائی حالت سے اختلاط کثرت

کی جانب ترقی کرتے ہیں تو ترکیب انسانی
پر پہنچ کر ان کی ترقی منتہی ہو جاتی ہے
کیونکہ وہ امور جو فعلیت میں آتے ہیں ان
کی ترکیب و تحلیل غیر متناہی ہوتی تو
ممکن نہیں اب اگر یہ مرکب انسانی عناصر
بسیط کا ادراک چاہے تو جس ترتیب
سے ترکیب عناصر ہو کر مرتبۂ آخری میں
انسان واقع ہوا ہے اسی طرح انسان
اس ترکیب کو تحلیل کرے اور ترتیب
اول کے خلاف چلے تب کہیں اُسے
آخری مرتبہ میں جا کر عنصر بسیط کا ادراک
حاصل ہو گا

جب ہم اس عالم محسوسات کے ادراک
حقائق سے ترقی کر کے اس عالم روحانیت
کے ادراک کا قصد کرتے ہیں تو ہمیں
سخت مجاہدہ اپنی طبیعت سے کرنا پڑتا
ہے اور ان تمام صورتوں کو جو حواس
ظاہری کے ادراک کردہ ہمارے ذہن میں
بسے ہوئے ہیں اور معقولات صحیحہ کے

ادراک میں مغالطہ و اشتباہ کا باعث ہوتے
ہیں خیرباد کہنا پڑتا ہے اور تمام اوہام
سے جو اس سے حاصل کئے گئے تھے
علیحدگی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

(فوز الاصغر)

علامہ ابن باجہ نے اپنی مشہور کتاب "حیات المعتزل"
میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ صرف حکمت
کی مدد سے اور ان قوائے عقلیہ کو بتدریج ترقی دینے
سے انسان عقل فعال کے ساتھ اتحاد حاصل کر سکتا ہے
اس لئے مسئلہ نفسیات کے ساتھ ایک سیاسی (پولیٹیکل)
مسئلہ کو ضم کر دیا ہے یعنی سوسائٹی کا ایک خیالی اعلیٰ
نمونہ بتاتا ہے جس میں انسان بہت زیادہ جدوجہد کئے
بغیر اس مرتبۂ اتحاد تک پہنچ سکتا ہے اور ہماری اخلاقی
زندگی کی تمام کشاکش کا خاتمہ اس وقت ہوتا ہے جب
کہ فطرت حیوانی پر نفس معقولی غلبہ حاصل کرتا ہے۔ ایک
قابل ادراک فعل کا اظہار ادراک پذیر صورتوں کے ساتھ
ہوا کرتا ہے جن میں عقل ہیولانی یا عقل منفعل تک پہنچ
حاصل ہو جاتی ہے۔ یہاں عقل فعال انہیں صورت اور
واقعیت بخشتی ہے۔ جب انسان فکر یا نظر کی مدد سے اپنے

ضمیر پر پورا قبضہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس وقت عقل کو عقل مکسوبی کہتے ہیں اور ارتقائے انسانی کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے اور آدمی کے لئے صرف موت کا آنا باقی رہتا ہے۔

غرضیکہ اس طرح پر علم فلسفہ جو مشرق ختم ہو چکا تھا اسلامی اندلس میں ابن باجہ اور ابن طفیل کی سرپرستی میں نئی زیب و زینت حاصل کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ تصوف کے رنگ میں مشرق سے زیادہ وضاحت کے ساتھ رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ ابن باجہ نے جو صوفیانہ مسائل اپنی کتاب "حیات المعتزل" میں بیان کئے ہیں ان کی اصل کا پتہ فارابی کے خیالات میں ملتا ہے۔ بعض مؤرخین نے علامہ ابن باجہ کی وفات کا سن ۱۱۳۸ء تحریر کیا ہے لیکن بہت سے مؤرخ اس تاریخ کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے یہ فیصلہ کن طریقے پر کہنا مشکل ہے کہ اندلس کے اس جلیل القدر حکیم و فیلسوف کی جس نے علماء و فلاسفہ کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا کی وفات کس سن میں ہوئی۔ اس کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ وہ مباحث تھے جو اس نے امام غزالیؒ کے بعض نظریات کی مخالفت میں کئے اور اپنے خیالات کو ایسے مضبوط دلائل سے صحیح

ثابت کرنے کی کوشش کی جن کو اکثر و بیشتر علماء و فلاسفہ نے درست تسلیم کیا اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابن باجہ کا علمی مقام امام غزالیؒ کے رتبہ سے کم نہیں تھا اور یہ حقیقت ہے کہ جس شخص کے فیضِ صحبت نے ابن رشد جیسے نادرِ روزگار حکماء پیدا کئے اس کی علمی عظمت کا انکار کون کر سکتا ہے ؟

۳۔ علامہ ابن طفیل

دمشق کے مشہور و معروف حکیم ابن ابی اصیبعہ نے اپنی پایۂ ناز تصنیف "طبقات الاطباء" میں ابن طفیل کا تذکرہ ترک کر دیا ہے لیکن ابن الخطیب نے اس کے کچھ حالات قلمبند کئے ہیں اگرچہ ان حالات میں علامہ ابن طفیل کی زندگی کے بعض ضروری واقعات آگئے ہیں مگر اس کے باوجود اس ذکر میں اجمال و اختصار کی کیفیت نمایاں ہے اور اسے مفصل نہیں کہا سکتا تاہم اس قدر بھی غنیمت ہے خصوصاً اس اعتبار سے کہ بہت سے حکماء و مؤرخین ان حالات کے تفصیلی یا اجمالی تذکرہ سے غالباً جان بوجھ کر پہلو تہی

کر گئے ہیں۔

۱۳

ابو بکر محمد بن عبدالملک بن محمد بن محمد بن طفیل القیسی
وادیٔ آش میں پیدا ہوا۔ وادیٔ آش اندلس کے صوبہ غرناطہ
میں ایک بڑا شہر ہے جس کو وادیٔ الاشات بھی کہتے ہیں
اس بستی کی آب و ہوا کو ادب و شاعری کے مذاق سے
خاص مناسبت تھی اور یہاں کے باغات اور ندیاں بہت
پُر فضا تھیں۔ علامہ ابن طفیل تحصیل علم کے بعد تھوڑی
ہی عمر میں والی غرناطہ کا کاتب یعنی معتمد (سیکرٹری) مقرر
ہوا اور وہاں سے نکل کر خاندان موحدین کے دوسرے
بادشاہ یوسف بن عبدالمومن کے دربار میں طبابت کی
خدمت پر مامور ہوا اور کچھ عرصہ کے بعد اپنی امتیازی
قابلیتوں کی بدولت وزارت کے جلیل القدر منصب
پر سرفراز ہو گیا۔ اس حکیم کا شمار اپنے قرن کے سرآمد
روزگار اطباء میں ہوتا تھا اور اسے ریاضیات اور ہیئت
وغیرہ کے علوم میں بڑا بھاری ملکہ تھا۔

ابن طفیل ۵۸۱ھ ہجری مطابق ۱۱۸۵ء/۱۱۸۶ء میں مراکش کے
مقام پر فوت ہوا۔ لومیس اپنی تاریخ فلسفیات میں لکھتا ہے
کہ امیر یعقوب المنصور باللہ خلف امیر یوسف بن عبدالمومن
اس کے جنازے کے ساتھ گیا اور اس نے ابن طفیل کی

موت کا بڑا غم کیا۔ لوئیس یہ بھی لکھتا ہے کہ ابن طفیل جس قدر ابن باجہ کا ممنون احسان اور ہمیشہ ثنا خوان رہا اسی طرح ابن رشد بھی کو ابن طفیل نے بادشاہ وقت تک پہنچایا تھا تمام عمر ابن طفیل کا احسان مانتا اور اس کی مدح خوانی کرتا رہا۔ ان بزرگوں کے دلوں میں دستور زمانہ کے خلاف ایک دوسرے کے متعلق بغض و حسد کا گزر کبھی نہ ہونے پایا۔ لوئیس کا قول ہے کہ یورپ کے علماء میں یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ ابن طفیل نے نظام بطلیوس کا رد کیا اور اس کے مقابلہ پہ ایک دوسرا نظام ایجاد کیا

ابن رشد اپنے شروح میں اس جدید طریقہ عمل کا ذکر کرتا ہے جو ابن طفیل نے اختیار کیا مگر اس کے قول سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ابن طفیل نے اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ کوئی رسالہ نہیں لکھا۔ حالانکہ وہ ہمیشہ اس قسم کا ایک رسالہ لکھنے کا ارادہ کرتا رہا۔ ابن طفیل کی رائے یہ تھی کہ فلک الافلاک ثوابت کے اوپر اور بالکل خالی ہے اور اس کی ایک ہی حرکت ہے یعنی مشرق سے مغرب کی جانب۔ اسی کی حرکت سے جملہ افلاک کو مشرق سے مغرب کی جانب حرکت ہوتی ہے مگر جو فلک الافلاک سے بعید تر ہے۔ اس کی حرکت بھی زیادہ بطی ہے اور

جس قدر قریب تر ہے اسی قدر حرکت بھی زیادہ سریع ہے کیونکہ قریب کو بعید کی نسبت سے اصل محرک یعنی فلک الافلاک حرکت اثر زیادہ پہنچتا ہے اور اسی طرح سے بعید کو قریب کی بہ نسبت کم اثر پہنچتا ہے۔ یہی حرکت کے تفاوت کی وجہ ہے۔ کسی دوسرے متضاد الجہت حرکت کے فرض کر لینے کی حاجت نہیں ہے۔ ہر فلک کے قطبین فلک مافوق کے قطبین سے ہٹے ہوئے ہیں اور ہر فلک بہ اتباع حرکت فلک مافوق اپنے محور پر بھی حرکت کرتا ہے۔ یہ دونوں حرکتیں مجتمع ہو کر ایک ایسی طرح کی شکل پیدا کرتی ہیں جس کے سبب سے ستارے شمال یا جنوب کی جانب جھکے ہوئے نظر آتے ہیں

ابن طفیل کی تصنیفات میں سے کتاب "حی بن یقظان" نے بڑی مقبولیت پائی ہے۔ ایک مرتبہ اصل عربی کی یہ کتاب مع لاطینی ترجمہ ۱۶۷۱ء میں طبع ہوئی اور پھر دوسری مرتبہ ۱۷۰۰ء میں چھاپی گئی۔ تین مرتبہ انگریزی زبان میں اور دو دفعہ جرمن زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس رسالہ میں ابن طفیل ایک فرضی قصہ لکھتا ہے اور اس کو بعض فلسفیانہ مطالب کے ادا کرنے کا ذریعہ تصور کرتا ہے۔

فیلکس والی (FELIX VALYI) جو فرانس کا مشہور

مستشرق تھا ابن طفیل کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسپائنوزا کا فلسفہ بعینہ ابن طفیل کے خیالات کا پرتو ہے وہ اپنے ایک مضمون "اسلام اور سائنس" میں جو ۷ مارچ ۱۹۲۳ء کو بمبئی (ہندوستان) کے مشہور اخبار "بمبئی کرانیکل" میں شائع ہوا تھا، لکھتا ہے کہ میں نے اسپائنوزا سے اختلاف کیا ہے جو کہ فلسفۂ اسلامی کا روحانی بیٹا ہے۔ اور ابن طفیل کے خیالات سے سرتاپا مملو ہے۔ ابن طفیل کے اکثر و بیشتر مسائل کا سرچشمہ عقلیت کا بلند مرتبہ ہے چنانچہ "حی ابن یقظان" کے نام سے جو افسانہ لکھا ہے وہ نفسیات میں رابنسن (ROBINSON) کی مانند ہے۔ اس افسانے کو پوکاک (POCOCKE) نے اپنے طور پر تعلیم یافتہ فلسفی کے نام سے طبع کرایا ہے۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قوائے انسانی خود اپنی فطرت کے تقاضے سے اس مافوق الانسان مرتبہ تک کس طرح پہنچ جاتے ہیں اور خدا کے ساتھ وصل حاصل کرتے ہیں۔ حی ابن یقظان مکتب اسکندریہ کا ایک صوفی منش متبع ارسطو ہے۔ اس کتاب میں ایسے فقرے بھی ہیں جن کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے جیسے جمبلیکس (JAMBLICUS) سے لے کر لفظی ترجمہ کر دیئے گئے ہیں۔ فلسفہ عرب کی تمام یادگاریں

میں سے شاید صرف یہی ایک افسانہ ایسی یادگار ہے جس
میں تاریخی دلچسپی کے علاوہ یہ مزید دلچسپی بھی حاصل ہوتی ہے
اور یہی اس کی انوکھی صفت اور نرالی خوبی ہے کہ ابن یقظان
کا ترجمہ جیسا کہ اس سے پہلی سطور میں لکھا جا چکا ہے انگریزی
ولندیزی اور جرمن زبانوں میں ہو چکا ہے اور جارج فارکس
کے پیرو اسے حصول تربیت اور اصلاح طبیعت کے لئے
ایک عمدہ کتاب سمجھتے ہیں۔

علامہ ابن طفیل جسے عیسائی علمائے الہیات ابوکر
کے نام سے یاد کرتے ہیں ابن رشد کی زندگی پر بہت گہرا
اثر ڈالنے کا باعث ہوا۔ خاندان موحدین کے پہلے بادشاہ
عبدالمومن کا جانشین یوسف اپنے زمانے کے بہت ہی علم
بادشاہوں میں سے تھا اور اس کے علمی ذوق ہی کی بناء پر
دربار شاہی میں اس دور کے بڑے بڑے علماء و حکماء کو
وقار و عزت کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ اس بادشاہ کے
دربار میں ابن طفیل کو بڑا رسوخ حاصل ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا
کہ دیگر تمام ممالک سے علماء فضلا کھنچ کر اسی دربار میں آ گئے
ابن طفیل ہی کے ذریعہ سے ابن رشد کو دربار میں رسائی حاصل ہوئی
مؤرخ عبدالواحد کا بیان کیا ہوا وہ واقعہ اس سے پہلے بھی
درج کیا جا چکا ہے جو اس نے ابن رشد کے ایک شاگرد

کی زبان سے خود سنا تھا۔ ابن رشد کی عادت تھی کہ وہ اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے اس قسم کے قصے اکثر بیان کیا کرتا تھا جس میں اس نے یہ قصہ بیان کیا اور اسی طرح روائت در روائت عبدالواحد تک پہنچا جسے اس نے قلبند کر دیا۔ وہ ابن رشد کی زبانی کہتا ہے :۔

"جب میں امیرالمومنین کے حضور میں پیش ہوا تو وہاں میں نے تنہا ابن طفیل کو موجود پایا جس نے میری تعریف شروع کی اور میری خاندانی شرافت اور قدیم حسب و نسب کا ذکر کیا نیز از راہ نوازش مختلف قسم کے تعریفی الفاظ کہے جن کا میں اپنے آپ کو بمشکل مستحق پاتا ہوں میرا نام اور میرے باپ کا نام پوچھنے کے بعد امیرالمومنین نے اس طرح گفتگو شروع کی ؛

"افلاک کے متعلق حکماء کی رائے کیا ہے ؟
وہ اسے قدیم سمجھتے ہیں یا حادث ؟"

یہ سن کر مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی، ہاتھ
پاؤں سن ہو گئے اور میں اس سوچ میں
پڑ گیا کہ کونسا عذر کروں۔ مجھے معلوم نہیں
تھا کہ ابن طفیل اور امیرالمومنین دونوں نے
باہمی اتفاق رائے کے ساتھ میرا امتحان لینے
کی کوشش کی ہے اس لئے میں نے سرے
ہی سے انکار کر دیا کہ میں نے فلسفہ پڑھا
ہی نہیں ہے۔ امیرالمومنین پر میرے پس و
پیش کرنے کی وجہ ظاہر ہو گئی اور انہوں نے
ابن طفیل کی طرف رُخ کر کے اس مسئلہ
پر گفتگو شروع کی۔ انہوں نے ایک ایک
کر کے ارسطو، افلاطون اور دیگر فلاسفہ کی
تحقیقاتیں بیان کیں اور ان کے علاوہ فقہائے
اسلام کے ان تمام دلائل کی توضیح کی جو
فلاسفہ کے مقابلہ میں وہ لایا کرتے ہیں میں
نے دیکھا کہ امیرالمومنین کا حافظہ اس قدر
قوی ہے کہ وہ علماء بھی اس کی ہمسری
نہیں کر سکتے جو اپنا تمام وقت انہی
تحقیقاتوں میں صرف کیا کرتے ہیں بہرحال

امیرالمومنین نے سمجھ لیا کہ میرے تردوات
کیونکر رفع ہو سکتے تھے چنانچہ اس نے
خود ہی ایسا سلسلۂ کلام شروع کیا جس
سے مجھے بھی آپ سے گفتگو کرنے
کی جرأت ہوئی تاکہ وہ معلوم کر لے کہ
فلسفہ میں میری استعداد کہاں تک ہے
جب دربار برخواست ہوا اور واپسی کی
اجازت ملی تو مجھے کسی قدر زر نقد، ایک
خلعت فاخرہ اور ایک گھوڑا مرحمت
ہوا۔"

اگر مؤرخ عبدالواحد کے بیان پر اعتبار کیا جائے تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یوسف کی صریح خواہش اور ابن طفیل کے اشارے سے ابن رشد نے ارسطو کی شرحیں لکھنی شروع کی تھیں۔ وہ کہتا ہے:

"ایک روز ابن طفیل نے بلا بھیجا اور کہا
کہ آج امیرالمومنین مجھ سے شکایت کر
رہے تھے کہ ارسطو بالکل زاویہ گمنامی میں
پڑا ہوا ہے اور اس کے ترجمے لوگوں
کی سمجھ میں نہیں آتے۔ خدا کرے کہ مجھے

کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اس کے
رسالوں پر شرحیں لکھ دے اور صاف عبارت
میں اس کے مضامین کی توضیح کر دے
تاکہ عوام بھی اس کی تصنیفات سے فائدہ
اٹھا سکیں۔ اس کام کے لئے جس لیاقت
کی ضرورت ہے وہ تم میں بدرجہ فائق موجود
ہے۔ پس اچھا ہے کہ شروع کر دو۔ تمہاری
اعلیٰ ذہانت اور عام فہم طرز بیان اور اس
انہماک کو جو تمہیں مطالعہ کتب میں ہے۔
میں خوب جانتا ہوں اس لئے امید ہے
کہ اس کام میں تم کامیاب ہو جاؤ گے۔
تم خود دیکھتے ہو کہ مجھے جو شے اس
ذمہ داری کو برداشت کرنے سے روک
رہی ہے وہ میری پیرانہ سالی ہے اس
کے علاوہ امیر کی خدمت سے متعلق جو
کثیر اشغال میرے ذمے ہیں وہ مزید
برآں ہیں۔

ابن رشد کہتا ہے کہ اس واقعے کے بعد
سے میں نے تمام توجہ اس کام کی طرف

بعض کے لئے ابن طفیل نے کہا تھا صرف
کرنی شروع کی۔ یہ وجوہ ہیں جنہوں نے
اُن شرحوں کے لکھنے کے لئے آمادہ کیا جو
میں نے ارسطو پر لکھی ہیں۔"

امام غزالیؒ نے فلسفہ کے مسائل و نظریات کی تردید میں جو
رسائل تلمبند کیئے ابن طفیل نے ان پر بڑی سخت تنقید کی
ہے۔ اور ثبوت دے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ امام غزالیؒ نے
چھپ چھپ کر ایسی کتابیں لکھی ہیں جن میں اُن مسائل
کو تسلیم کیا ہے جو عوام کے سامنے پیش کردہ مسائل سے
بہت مختلف ہیں۔

اس کا مقولہ ہے کہ:
"جو کچھ تم دیکھتے ہو اسی کو تسلیم کرو اور
جو کچھ سنتے ہو اسے جانے دو مثلاً جب
آفتاب برآمد ہوتا ہے تو زحل کا خیال کرنے
کے فرض سے تم بری ہو جاتے ہو۔"

۴۔ ابوبکر ابن زہر اصغر

ابوبکر ابن زہر کا پورا نام ابوبکر محمد بن مروان ابن ابی العلاء ابن زہر ہے۔ اس کے باپ کا نام عبدالملک ابن زہر ہے اور اسے ابن زہر اکبر کہتے ہیں ابوبکر ابن زہر میانہ قد، صاف رنگ بڑا مضبوط و زور آور اور قوی الجثہ آدمی تھا۔ وہ بڑی عمر کو پہنچ کر فوت ہوا اور آخر وقت تک اس کے سارے قویٰ برقرار اور حواس خمسہ صحیح و سالم رہے تھے فقط سماعت میں کسی قدر فرق آگیا تھا۔

اس حکیم نے فقہ و حدیث کے علوم عبدالملک الباجی

سے حاصل کئے اور طب وغیرہ اپنے پدر بزرگوار عبدالملک
بن زہر سے پڑھی اور ان علوم میں اس نے ایسی مہارت
اور اس قدر کمال پیدا کیا کہ اپنی تصنیفات سے اپنے زمانے
کے ذخیرہ معلومات میں بہت کچھ اضافہ کر گیا۔ ان علوم
کے ساتھ ہی ساتھ فنون ادبیہ عربیہ میں بھی اسے بڑی
دستگاہ حاصل تھی اور قرآن مجید کا حافظ تھا۔ علاوہ ازیں
شاعری میں بھی خوب دسترس رکھتا تھا اور شعر بھی خوب
کہتا تھا اس کی نثر اور بیان بھی بہت فصیح و بلیغ تھا ابوالخطاب
ابن وحید نے اپنی کتاب "المطرب فی شعار اہل مغرب"
میں لکھا ہے کہ ذوالرمہ کا سارا کلام اس کو حفظ یاد تھا اور
حکیم و طبیب ہونے کے ساتھ وہ بہت بڑا ادیب بھی تھا
ابن وحید نے اس کا کچھ کلام بھی نقل کیا ہے جس میں سے
چند اشعار مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر درج ذیل ہیں
اس سے اس کے کلام کی حلاوت و خوبی کا پورے طور
پر اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ابوبکر
ابن زہر کتنا بڑا شاعر تھا۔ اس کے اشعار کا نمونہ یہ ہے۔

وموسدین علی الاکف خدودھم

گالوں کے نیچے ہاتھ رکھے ہوئے سب میکش پڑے ہوئے ہیں

قد غالهم نوم الصباح و غالنی
صبح کی نیند نے ان کو بھی بے خبر کر دیا اور مجھ کو بھی
مازلت اسقیهم و اشرب فضلهم
میں ان کو پلاتا رہا اور ان سے بچی ہوئی شراب پیتا رہا
حتی سکرت و نالهم ما نالنی
آخر بے ہوش ہو گیا اور جو حال میرا ہوا ہی ان کا بھی ہوا
والخمر تعلم حین تاخذ ثارها
شراب اپنا بدلہ خوب لے لیتی ہے
انی اصلت اناءها فا مالنی
میں نے شیشہ کو بار بار جھکایا تھا اس نے مجھے بھی گرا دیا

ایک جگہ پر اپنے صغیر سن بچے کے اشتیاق میں لکھتا ہے ؎

ولی و لد مثل فرخ القطا
میرا ایک ننھا سا بچہ ہے جیسے چڑیا کا چنچلا
صغیر تخلف قلبی لدیه
میرا دل اسی میں لگا ہوا ہے
نأتت عنه داری فیا وحشتی
میں جو اس سے دور ہو گیا ہوں تو کیسا دم گھبرا رہا ہے
لذالک الشخیص و ذالک الوجیه
اس کی پیاری پیاری صورت کے خیال میں

تشوقنی و تشوقتہ

مجھے اس کا اشتیاق اسے میرا اشتیاق

فیبکی علی و ابکی علیہ

وہ میرے لئے روتا ہے میں اس کے لئے روتا ہوں

لقد تعب الشوق ما بیننا

ہم دونوں کے درمیان شوق ملاقات کس کشمکش میں پڑ گیا ہے

فمنہ الشی و منی الیہ

اس کو میرا شوق ملاقات ہے مجھے اس کا

ابوبکر ابن زہر نے مرتے وقت یہ وصیت کی کہ اشعار ذیل میری قبر پر کندہ کر دیئے جائیں۔

تامل بحقک یا واقفا

اے قبر پر کھڑے ہونے والے تجھے قسم ہے

ولاحظ مکانا دفعنا الیہ

ذرا غور تو کر کہ ہم کس گڑھے میں ڈال دیئے گئے ہیں

تراب الضریح علی وجنتی

یہ خاک میرے رخساروں پر اس طرح سے پڑی ہوئی ہے

کانی لم امش یوماً علیہ

کہ شاید میں کبھی اس پر چلتا پھرتا نہ تھا

اداوی الانام من خدار المنون
میں خوف موت سے لوگوں کا علاج کیا کرتا تھا
دھا انا قد صرت رہینا لدیہ
اب میں خود ہی اس کے پنجہ میں پھنس گیا ہوں!

ابوبکر ابن زہر اپنے پدر بزرگوار عبدالملک ابن زہر کی رفاقت میں سلطان ابراہیم بن یوسف بن تاشفین المرابطی کا طبیب تھا اور خانوادۂ مرابطین کی بربادی کے بعد ابن رشد کی شرکت میں عبدالمومن کے دربار کا طبیب مقرر ہوا۔ اس کے بعد وہ موحدین کے خاندان میں چار پشتوں تک اس منصب پر سرفراز رہا اور خلیفہ عبداللہ محمد الناصر کے زمانے میں نوے برس کی عمر کو پہنچ کر ۵۵۶ ہجری میں مراکش کے مقام پر اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا رحمۃ اللہ علیہ!

ابوبکر کی تشخیص اور حذاقت کا سارے یورپ میں شہرہ تھا۔ تریاق خمیسی اس کی بنائی ہوئی ایک معجون تھی۔ جو بہت سے امراض کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی تھی وہ بعض موقعوں پر اپنے والد بزرگوار کے نسخوں پر بھی اصلاح کیا کرتا تھا اور وہ حکیم بزرگ اس کی رائے کو تسلیم کر لیا کرتا تھا۔

ابوبکر کی سخاوت اور دوست پرستی کی ایک مثال

قاضی ابو مروان الباجی کی زبانی منقول ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ ابو بکر ایک دن اپنے دوست کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ دوست کو کسی قدر متفکر اور متردد پاکر اس نے دریافت کیا کہ اس فکر و تردد کی وجہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میری بیٹی کی شادی ہو گئی ہے اور کل اس کی رخصتی ہے جس پر کم سے کم تین سو دینار صرف ہوں گے مگر میرے پاس ٹکا بھی نہیں ہے۔ میں اس فکر میں ہوں کہ تین سو دینار کس کے گھر سے لاؤں تاکہ میری عزت رہ جائے۔ ابو بکر نے کہا، کوئی مضائقہ نہیں بازی تو ختم کرو۔ میرے پاس پانچ کم تین سو دینار اس وقت موجود ہیں جو تمہاری نذر کرتا ہوں۔ شطرنج کی بازی اختتام تک پہنچنے کے بعد فارغ ہوئے تو ابو بکر نے پانچ کم تین سو دینار کا توڑا اپنے دوست کے حوالے کیا۔ کئی دن کے بعد وہ دوست پھر ابو بکر کی ملاقات کو آیا اور پانچ کم تین سو دینار واپس لایا اور اس نے بیان کیا کہ میں نے اپنا ایک قریب کا باغ سات سو روپئے کو بیچا ہے۔ تمہاری عنایت سے عین وقت پر میرا کام نکل گیا۔ اب یہ رقم حاضر ہے میری حاجت روائی ہو گئی۔ ابو بکر نے کہا کہ تم خود ہی اس کو اپنے صرفہ میں لاؤ کیونکہ میں نے یہ رقم تمہیں دیتے وقت

یہ نیت کی تھی کہ تم سے واپس نہیں لوں گا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کی نہایت مہربانی ہے۔ خدا کے فضل سے اب مجھے احتیاج باقی نہیں ہے اور میں کبھی یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی ایسے احسان کا بار اپنی گردن پر لوں جس کا عوض مجھ سے نہ ہو سکے۔ ابوبکر نے کہا کہ میں تمہارا دوست ہوں یا کہ دشمن ہوں۔ دوست بولا کہ یہ کیا کہتے ہو؟ تم میرے بڑے ہی عزیز دوست ہو۔ ابوبکر نے کہا کہ اگر میں تمہارا دوست ہوں تو میرا مال تمہارا مال ہے اور تمہارا مال میرا مال ہے اس لئے تامل کرنے کی اس میں کیا گنجائش ہے؟ لیکن اس کے باوجود بھی جب دوست کی طرف سے تامل کا اظہار ہوا تو ابوبکر نے جھنجھلا کر کہا کہ اگر تم یہ قبول نہ کرو گے تو آج سے میری تمہاری ملاقات اور دوستی ترک ہو جائے گی اور ہم دونوں کے درمیان خلوص و محبت کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا۔ اس صورت حال کے پیش نظر آخر کار دوست کو مجبوراً وہ ہدیہ قبول کرنا پڑا۔

قاضی ابو مروان الباجی لکھتا ہے کہ ابن زہر کی ایک ہمشیرہ اور ایک اس کی بیٹی ابن زہر کے ساتھ رہا کرتی تھیں ان دونوں نے اس حکیم بے بدل کی صحبت میں رہ کر فن

طبابت میں بڑی زبردست دستگاہ حاصل کر لی تھی خصوصاً عورتوں کے علاج میں وہ بہت ہی مشاق تھیں اور امیر المنصور کے گھر میں بیگمات کا علاج بھی ماں بیٹی کیا کرتی تھیں۔ قاضی ابو مروان الباجی نے ابن زہر کی وفات کا حال اس طرح لکھا ہے کہ ابو زید عبدالرحمٰن بن یوجان المنصور کے وزیر نے از راہ خبث باطن ابن زہر کے ایک خدمتگار کے ساتھ سازش کر کے انڈے میں زہر ملا کر دلوا دیا۔ ابن زہر اور اس کی ہمشیر دونوں نے وہ انڈا کھایا اور زہر نے دونوں کا کام تمام کر دیا۔

مؤرخ لکھتا ہے کہ اس وقت جب کہ زندگی کی مہلت ختم ہو گئی تو ابوبکر کی حکمت اور طبابت کچھ کام نہ آئی لیکن منتقم حقیقی نے ابو زید بن یوجان سے اس خون ناحق کا قصاص اس طرح پر لیا کہ وہ اپنے ایک قرابت دار ہی کے ہاتھوں سے قتل ہو گیا۔ یہ روایت ابن ابی اصیبعہ کی ہے جو یہاں تک ختم ہوئی۔ علاوہ ازیں ابوبکر ابن زہر کی جو سوانح عمری ابن ابی اصیبعہ نے لکھی ہے وہ بھی اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے وہ ابن زہر کے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ جب المنصور نے علوم عقلیہ کی تعلیم کو موقوف کرنے کا ارادہ کیا اور یہ قاعدہ جاری کر دیا

کہ جو شخص فلسفہ یا منطق کی کتابیں پڑھے پڑھائے یا اپنے گھر میں رکھے تو اس سے مواخذہ کیا جائے اور اگر جرم ثابت ہو تو سخت سزا دی جائے۔ اس وقت اس لئے ابوبکر ابن زہر کو اس قانون کی اجرائی کے واسطے مقرر کیا۔ خوب معلوم ہے اور اس وقت کے لوگوں اور خود امیر کو خوب معلوم تھا کہ ابن زہر کا سارے کا سارا خاندان فلسفی تھا اور دو پشت سے یہ فن اس کے گھر کا فن تھا۔ خود ابوبکر ابن زہر بھی مثل اپنے چچا اور بھائی کے حکیم کامل تھا اگرچہ مصلحتاً ان علوم سے اپنا جہل ظاہر کرتا تھا۔ امیر المنصور کا ابن زہر کو اس خدمت کے واسطے تجویز کرنا بجائے خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ امیر المنصور کی یہ ساری کارروائی مصلحت وقت اور تدبیر مملکت پر مبنی تھی۔ کہتے ہیں کہ ابن زہر نے فلسفہ و حکمت کی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جلائیں سوائے اپنے کتب خانے کی کتابوں کے۔ المنصور خوب جانتا تھا کہ اس کا کتب خانہ معقولات کی کتابوں سے مالا مال ہے اور یہ خود علوم عقلیہ کا بڑا شائق ہے چنانچہ اس طرح پر عوام الناس کی شورش کو کم کرنے کے لئے ایک طرف کتب عقلیہ کے جلانے کا حکم دیا مگر دوسری ایسی تدبیر کی کہ ایک اچھی تعداد ان

سب کتابوں کی بربادی سے بچ جائے۔ ابن زہر نے تمام کتب فروشوں کے پاس حکم بھیج دیا تھا کہ فلسفہ کی جس قدر کتابیں موجود ہوں فوراً اس کے پاس بھیج دی جائیں۔ ابن زہر نے ان کتابوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا اس کا اندازہ ہر صاحب ہوش خود لگا سکتا ہے یعنی ؎

قاصد رقیب بودہ و من غافل از فریب
بیداد مدعائے خود اندر میانہ ساخت

ابن ابی اصیبعہ آگے چل کر کہتا ہے کہ لوگ جانتے ہیں کہ منصور کے اس خیال کی وجہ کیا ہے کہ اس کی قلمرو میں جس قدر کتابیں منطق و فلسفہ کی ہیں وہ سب برباد کردی جائیں اور یہ حکم کیسے دیا گیا کہ جو کتاب اس قسم کی ملے وہ علانیہ جلا دی جائے اور جو کوئی علوم عقلیہ (معقولات) میں انہماک ظاہر کرے اسے خوب سزا دی جائے نیز جو کوئی ان کتابوں کو پڑھے یا اپنے کتب خانے میں رکھے اسے بھی سخت سزا دی جائے تاکہ ان علوم کا سد باب ہو جائے۔ جب پہلے پہل منصور کو یہ خیال پیدا ہوا تو اس نے ابوبکر ابن زہر الحفید کو تعمیل حکم پر مامور کیا۔ امیر خوب جانتا تھا کہ ابن زہر خود منطق و

فلسفہ سے شغف رکھتا ہے لیکن بظاہر الاعلم بنا رہا۔
غرضیکہ ابوبکر نے اس کا مفوضہ کام بہت اچھی طرح انجام
دیا جو حکمت و فلسفہ کے شائقین کے لئے بڑے صدمہ
کی بات تھی۔ اشبیلیہ کے تمام کتب فروشوں کی دکانیں
اس نے چھان ڈالیں اور کوشش کی کہ ایک کتاب بھی
باقی نہ رہے۔ جس اطاعت گزاری سے ابن زہر نے اس
کام کو سر انجام تک پہنچایا وہ خود اس کے لئے شائق
فلسفہ ہونے کی حیثیت میں کس قدر تکلیف دہ ہوا ہوگا
بایں ہمہ وہ بھی خلیفہ کے سامنے الزام سے بچ نہ سکا
اس لئے کہ کتب ممنوعہ کے مطالعہ کرنے والوں میں اس کا
بھی شمار تھا۔ ان مظالم کا وہی نتیجہ ہوا جو ہمیشہ ہوا کرتا
ہے۔ یعنی ظاہر داری اور ضمیر انسانی کا تنزل۔

مورخ موصوف لکھتا ہے کہ ذیل کی حکایت میں نے
ابوالعباس احمد بن احمد اشبیلی سے سنی ہے۔ ابن زہر
کے دو شاگرد تھے جنہیں وہ طب پڑھایا کرتا تھا۔ ایک
وقت مقررہ پر جبکہ وہ طب کا سبق لینے آئے تو ان میں
سے ایک کے ہاتھ میں ایک مختصر رسالہ دیکھا جو منطق پر
تھا۔ ابن زہر نے کتاب کو چھین کر کمرے کے ایک کونے
میں پھینک دیا اور شاگرد کو مارنے کے لئے اٹھا۔ طالب

علم یہ دیکھ کر بھاگ گئے اور وہ چار دن سامنے نہ آئے آخر کار ایک روز جرأت کر کے حاضر ہوئے اور کہا کہ ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ کون سی کتاب ہے۔ نا دانستگی میں ہم اسے لے آئے تھے۔ ابن زہر نے یہ عذر قبول کیا اور فن طب کا درس جاری رکھا۔ اس سلسلہ میں علامہ مقری نے نفح الطیب کے باب اوّل وصف جزیرہ اندلس علوم و فنون کے حالات میں لکھا ہے کہ خاص لوگوں کو فلسفہ اور ہیئت کی طرف زیادہ توجہ تھی لیکن عوام الناس کے ڈر کے مارے اس کو ظاہر نہیں کرتے تھے۔ اگر ان لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ فلاں شخص فلسفہ پڑھتا ہے یا نجوم و ہیئت کا شغل رکھتا ہے تو عام طور پر وہ زندیق مشہور ہو جاتا تھا اور لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیتے تھے اور محض شبہ ہی میں اسے سنگسار کر دیتے یا جلا کر مار ڈالتے تھے۔ بعض وقت تو سلطان کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی تھی اور بعض وقت عوام الناس کے لحاظ و خیال سے سلطان ہی اس کو قتل کرا دیتا تھا۔ یہ تو اکثر ہوا ہے کہ ان علوم کی کتابوں کو بادشاہوں نے اپنے آپ جلوا ڈالا ہے۔ چنانچہ منصور ابن ابی عامر نے ابتدائی عروج میں عوام الناس کی خاطر ایسا ہی کیا تھا۔ اگرچہ

اس میں شبہ ہے کہ آیا منصور خود پوشیدہ طور پر ان علوم کا شائق تھا یا نہیں جیسا کہ حجازی نے ذکر کیا ہے۔

(اردو ترجمہ نفح الطیب)

اسی قسم کا ماحول تھا جس میں ابن زہر کے شاگردوں کا واقع پیش آیا۔ ابن زہر نے ان کا عذر قبول کر کے درس کا سلسلہ تو حسب سابق جاری کر دیا لیکن صرف اس قدر تفاوت کے ساتھ کہ طب پر کچھ دیر درس دینے کے بعد قرآن پاک کی چند سورتیں پڑھاتا اور حکم دیتا کہ ان سورتوں پر کتب تفسیر کا مطالعہ کریں اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت اور احادیث و دیگر کتب مذہبی کی مزاولت رکھیں اور ارکان مذہب نہایت پابندی سے ادا کرتے رہیں۔ نوجوان طالب علم اپنے استاد کے احکام کی تعمیل کرتے رہے حتیٰ کہ جب ابن زہر نے دیکھا کہ ان کے قلوب میں استعداد پیدا ہو گئی ہے تو خود جا کر منطق کی وہی کتاب اُٹھا لایا جو ان کے ہاتھ میں اس نے دیکھی تھی اور کہا "اب تم میں اس کتاب کے پڑھنے کی قابلیت پیدا ہو گئی ہے یہ لو! اس کے پڑھنے میں اب کوئی امر مانع نہیں ہے" یہ کہہ کر منطق کے مسائل

سلجھانے لگا۔

ابن ابی اصیبعہ کہتا ہے، میں نے یہ واقعہ اس لئے بیان کیا ہے کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ ابن زہر کس قدر پرہیز گار اور راست باز آدمی تھا۔ مؤرخین میں سے اکثر اصحاب نے خلیفہ منصور کے دربار کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے ابن زہر کے علم و کمال کا پورے طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

اس بادشاہ (منصور) کے رو برو ابوبکر ابن زہر اشبیلی اور ابن رشد کے درمیان ایک مباحثہ ہوا تھا جس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ابن رشد کے حالاتِ زندگی میں بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اس مباحثہ کی بنیاد اس معاملہ پر تھی کہ

ابوبکر اور ابن رشد دونوں مصاحبین بادشاہ کے مقامات ولادت میں علمی اعتبار سے کون سی جگہ کو فوقیت حاصل ہے؟

ابن رشد نے بیان کیا کہ اگر اشبیلیہ میں کوئی عالم وفات پائے اور لوگ اس کی کتابیں فروخت کرنا چاہیں تو قرطبہ لاتے ہیں جہاں ان کی خاطر خواہ قیمت ملتی ہے۔

اس کے برخلاف اگر کوئی گویا قرطبہ میں آ جائے تو اس کے گیت اشبیلیہ لے جاتے ہیں جہاں ان کی مانگ ہے۔ اس سے ابن زہر کے مبلغ علم اور کمال فن کا روشن ثبوت ملتا ہے۔

بارہویں صدی عیسوی کے آخری چند سالوں میں اندلس اور مغرب کے تمام علمائے فلسفہ کا جھگھٹا تقریباً ایک ہی زمانے میں فنا ہو گیا۔ عبدالواحد جو خلفائے موحدین کا مؤرخ ہے ۵۹۵ھ ہجری مطابق ۱۱۹۸ء کو مغرب کے سفر پر گیا تھا اور حفید ابوبکر ابن زہر سے ملا تھا جس کی عمر اس زمانے میں بہت زیادہ تھی۔ عبدالواحد کو ابن زہر نے اپنے چند اشعار بھی سنائے تھے یہ واقعات ابن ابی اصیبعہ نے قلمبند کئے ہیں لیکن ابوبکر کی تصانیف کا ذکر اس مؤرخ نے چھوڑ دیا ہے اور اس کی وجہ بھی بظاہر کوئی سمجھ میں نہیں آتی کہ ابن ابی اصیبعہ نے اتنی بڑی بات کو کیسے نظر انداز کر دیا جو کسی دانشور کی زندگی کا لازوال اثاثہ اور غیر فانی کہی جا سکتی ہے۔ بایں ہمہ اس مؤرخ نے ابوبکر ابن زہر کی تصنیفات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا مگر ۱۶۱۸ء میں بازل کے مقام پر حفظ صحت کے مقدمات میں ابن زہر کی ایک

کتاب لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر چھپی تھی جس کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی ابن زہر کی تصنیف ہے، کیونکہ عبدالملک بن زہر یعنی ابوبکر ابن زہر کے باپ کی تصنیفات میں اس نام کی کوئی کتاب مذکور نہیں ہے۔ جیسا کہ عماد الملک سید حسن بلگرامی نے رسائل میں پوری تحقیق کے بعد اس کی تصدیق کی ہے۔

ابوبکر ابن زہر اور ابن رشد کے عظیم خاندانوں میں بہت گہرے تعلقات رہے اور انہی کے خاندانوں کو یہ عزت حاصل تھی کہ بارہویں صدی عیسوی میں اسلامی اندلس کے اندر علوم کی اشاعت ان کے ذریعہ سے ہوئی۔ ابوبکر ابن زہر ویسے بھی ابن رشد کا ساتھی تھا۔ کیونکہ یہ دونوں شاہی طبیب تھے۔ اس دور میں جبکہ ابوبکر ابن زہر کو طبیب دربار کی حیثیت حاصل ہوئی تو اس نے اپنے فنی کمالات کے وہ چمکتے ہوئے نمونے پیش کئے کہ دربار اندلس ہی میں نہیں بلکہ اس کی شہرت مشرق و مغرب کے اکثر و بیشتر ممالک تک پھیل گئی اور اہل فن اس کے تجربات سے مستفید ہونا اپنے لئے باعث فخر تصوّر کرنے لگے۔ اس شان و عظمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس زمانے کے بڑے بڑے فاضل علماء نے

ابوبکر ابن زہر کے سامنے زانوئے ادب طے کیا اور اس کی وجہ سے حکمت و طب کا ایک ایسا سکول جاری ہوا جس نے بذات خود ایک زندۂ جاوید حیثیت و شہرت کا مقام حاصل کر لیا۔

۵۔ عبدالملک ابو مروان ابن زہر (اکبر)

ابن زہر (اکبر) یعنی عبدالملک ابو مروان ابن زہر ابوبکر ابن زہر (اصغر) کا باپ تھا۔ اس کا پورا نام عبدالملک ابو مروان ابن ابو العلا بن عبدالملک بن محمد ابن مروان ابن زہر الایادی ہے۔ زہر نام کا ایک شخص جو اشبیلیہ کا رہنے والا تھا یہودی الاصل تھا اور بعد میں مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا۔ یہی اس خاندان کا بانی تھا۔ عبدالملک ابو مروان اپنے فن میں بہت بڑا حاذق تھا۔ وہ چھوٹی سی عمر میں ابراہیم ابن یوسف تاشفین کے جو

خلفائے مرابطین کا آخری جانشین تھا گھر کا طبیب مقرر ہوا اور خاندان مرابطہ کی تباہی کے بعد خاندان موحدین کے پہلے بادشاہ عبدالمومن کے دربار میں اسی خدمت پر سرفراز ہو گیا جس پر دربار مرابطین میں فائز تھا اور یہاں سے آخر کار منصب وزارت پر جا پہنچا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ عبدالملک یہودی المذہب تھا مگر یہ گمان بالکل غلط ہے کیونکہ آسے اعتقادی لحاظ سے یہودیت کے ساتھ کسی قسم کا سروکار نہ تھا اور نہ کوئی ایسا تاریخی ثبوت مل سکتا ہے جس سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ سکتی ہو کہ عبدالملک یہودی مذہب کا پیرو تھا۔ جن مؤرخین نے اس کے متعلق اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں عبدالملک کے خاندان کے بانی کی مذہبی حیثیت سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ عبدالملک کے خاندان کا بانی جسے زہر کے نام سے پکارا جاتا تھا واقعی یہودی مذہب کا پیرو تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ ویسے بھی یہودی الاصل تھا اور یقیناً وہ اپنے آبا و اجداد کے مذہبی رجحان

کو مد نظر رکھتے ہوئے یہودی عقیدہ اختیار کر گیا ہو گا۔
جیسا کہ دنیا کا عام طور پر یہی دستور ہے کہ لوگ اپنے بڑوں
کا مذہب دیکھ کر خود بھی اس کے ماننے والے بن جاتے
ہیں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی صاحب شعور
آدمی سن بلوغ کو پہنچ کر باپ دادا کے دین سے انحراف
کرے۔ ورنہ ننانوے فی صدی لوگ بے سوچے سمجھے اپنے
اسلاف کا مسلک قبول کر لیتے ہیں مگر عہد حاضر میں جن
لوگوں کو خدا تعالیٰ نے سوچنے اور سمجھنے کا شعور عطا کیا
ہے وہ ہوش سنبھالنے کے بعد اس بات پر غور کرتے
ہیں کہ ہمارے آبا نے جو مذہب اختیار کر رکھا ہے وہ
قابل تسلیم ہے یا نہیں اور ہمیں بھی وہی قبول کر لینا چاہیے
یا اپنی عقل و دانش کے مشورہ پر کسی دوسرے مذہب
کی پیروی کرنی چاہیے۔ پھر اگر باپ دادا ہی کا مذہب
اختیار کرنا ہے تو اس کے مالہ و ماعلیہ کو سمجھ سکنے کے بعد
قبول کرنا ہوگا۔ بلا پس و پیش محض اس بنا پر کسی مذہب
کے سامنے سر عقیدت خم کرنا ضروری نہیں کہ ہمارے
باپ دادا اس کو قبول کر چکے ہیں یہی صورت عبدالملک

ابو مروان ابن زہر کے خاندان کے بانی کو پیش آئی ہوگی کہ اس نے اپنے باپ دادا کو یہودی مذہب کے اطاعت گزار دیکھا اور خود بھی اسی کی پیروی شروع کر دی لیکن جب اس کے فہم و شعور کی طاقتوں میں ترقی و روشنی کا جوہر پیدا ہوا اور اس نے یہودیت اور اسلام کا ہوشمندی سے مطالعہ کیا اور اسے یہودیت کے کھوکھلے پن اور اسلام کی حقانیت کا علم ہوا تو اس نے اپنے آبا و اجداد کے قدیمی مذہب یہودیت سے کنارہ کشی کرنا ضروری سمجھا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ مسلمان ہوگیا۔ اسلام کے نور نے اس کے قلب کی آنکھوں کو روشن کر دیا اور اس کے سینہ کی وہ تمام تاریکیاں دین حق کے فیوض و برکات کی مقدس شعاعوں سے چھٹ گئیں۔ جس کے بعد اس کو یہودیت سے دور کا بھی واسطہ نہ رہا۔ یہی بات تھی جو بعض مورخین کو غلط فہمی میں ڈالنے کا باعث ہوئی اور غالباً انہوں نے ابو مروان کے بانیٔ خانوادہ زہر کی بجائے عبدالملک ابو مروان ابن زہر ہی کے متعلق یہ رائے قائم کر لی ہے کہ وہ یہودی مذہب کا پیرو تھا حالانکہ

ابو مروان تو درکنار اس کا جد امجد زہر بھی اس الزام کا مورد قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ یہودی المذہب تھا کیونکہ وہ بھی کچھ عرصہ یہودی رہنے کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ بہرحال یہ امکان اس سے ختم نہیں ہو سکتا کہ زہر کے متعلق پیدا ہونے والی بدگمانی کا شکار عبدالملک ابو مروان ہی کو بنایا جاتا ورنہ جہاں تک حقیقت حال کا تعلق ہے اس کی روشنی میں نہ ابو مروان کے خاندان کا بانی زہر یہودی تھا اور نہ عبدالملک ابو مروان ابن زہر کے عقائد کا یہودیت سے کوئی تعلق تھا۔ وہ اسلام کا سچا حلقہ بگوش تھا اور اسی حالت میں فوت ہوا اس لئے مؤرخین میں سے جنہوں نے عبدالملک ابو مروان کو یہودی لکھا ہے ان کا خیال بالکل غلط ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کا قطعی فیصلہ کرنے کی غرض سے پوری تحقیق و تلاش سے کام نہیں لیا۔

عبدالملک ابو مروان ابن زہر کی تصنیفات بہت سی ہیں۔ ایک شہرۂ آفاق تصنیف "تیسیر" فن طبابت کی بڑی معتبر و ممتاز کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ کتاب سب

سے پہلے عبرانی زبان میں اور اس کے بعد عبری سے
لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئی۔ پھر پندرہویں صدی عیسوی میں
ملک اطالیہ میں بڑے اہتمام سے چھاپی گئی۔

ابو مروان ابن زہر نے اپنا آبائی فن اپنے والد بزرگوار
سے سیکھا اور آگے چل کر اپنے بزرگوں اور اپنے قریب
قریب تمام ہم عصر اطباء پر سبقت لے گیا۔ اس کی تشخیص
اور اس کے نسخے دور دور تک مشہور تھے۔ ابو عبداللہ محمد
بن عبداللہ ابن تومرت نے جب مرابطین کی سلطنت پر
قبضہ کر لیا اور اس کی وفات کے بعد عبدالمومن اس کا
جانشین ہوا اور وہ افریقہ سے اندلس آگیا تو یہاں اس
علم دوست بادشاہ نے منجملہ اور علماء کے ابن زہر کی بھی
بڑی قدر و منزلت کی اور اسے اپنے دربار کا طبیب مقرر
کیا اور بہت کچھ انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ ابن زہر
نے عبدالمومن کے واسطے ایک معجون تیار کی تھی جس میں
ستر اجزاء شامل تھے اور اسے تریاق سبعینی کے نام سے
پکارا جاتا تھا۔ پھر اس نے اپنے نسخے کے اجزاء
اکٹھے کر کے دس جزو علیحدہ کئے اور ان میں سے سات

جزو رکھ کر ایک اور معجون بنائی جو تریاق الانتلہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

ابو القاسم معاضی اندلسی سے روایت ہے کہ ایک دن خلیفہ عبدالمومن نے ابن زہر سے فرمائش کی کہ مجھے ایک خفیف سے مسہل کی ضرورت ہے۔ ابن زہر نے اسی وقت باغ میں جا کر ایک انگور کی بیل کو چاروں طرف سے کھدوا دیا اور پانی میں کچھ دوا ملا کر انگور کو سینچنا شروع کیا۔ دوا کا اثر ساری بیل میں دوڑ گیا یہاں تک کہ انگور کے خوشوں تک بھی سرایت کر گیا۔ ابن زہر اسی وقت ایک خوشہ توڑ کر بادشاہ کے پاس لے گیا ادھر انگور کے تیار ہونے تک بادشاہ کو بخار آگیا تھا ابن زہر نے بادشاہ کو خوشہ دے کر کہا کہ اسے نوش جان فرمایئے۔ بادشاہ نے انگور کے دس دانے کھائے تو ابن زہر نے عرض کیا کہ بس یا امیرالمومنین! یہ دس انگور کافی ہیں۔ انشاء اللہ اتنی ہی اجابتیں ہوں گی چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بادشاہ کا مزاج درست ہو گیا۔

یہ واقعہ اکثر مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے نقل کیا

ہے کہ ایک دن ابن زہر اشبیلیہ میں بادشاہ کے دربار کو جا رہا تھا کہ اثنائے راہ میں ہمام ابوالخیر کے پاس ایک مریض سے دو چار ہوا جس کا زرد رنگ اور ہر وقت کا کراہنا ظاہر کرتا تھا کہ یہ شخص مستسقی ہے۔ ابن زہر اس کے ساتھ مکان تک گیا اور وہاں بہ تفصیل احوال پوچھنے کے بعد نبض دیکھ کر چاہتا تھا کہ نسخہ لکھے کہ یکایک اس کی نظر ایک گھڑے پر پڑی جو مریض کے سرہانے رکھا ہوا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ گھڑا مدّت سے اسی جگہ رکھا ہوا ہے اور مریض اس کا پانی پیتا رہا ہے۔ ابن زہر نے ایک نوکر سے کہا کہ اس گھڑے کو توڑ ڈالو۔ جب گھڑا ٹوٹا تو اس میں سے ایک بہت بڑا مینڈک نکلا جس نے بظاہر اسی گھڑے میں پرورش پائی تھی۔ ابن زہر یہ دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اب نسخہ لکھنے کی حاجت نہیں رہی۔ تم اس کے بغیر ہی تندرست ہو جاؤ گے۔ آج تک تم جو پانی پیتے رہے ہو وہ تمہارے حق میں زہر کے مترادف تھا اور اسی نے تمہیں بیمار کیا ہے۔ چونکہ وہ زہریلا پانی باقی نہیں رہا

اس لئے تمہاری بیماری بھی باقی نہ رہے گی۔
کہتے ہیں کہ ابن زہر کا ہم عصر "الفارہ" نام کا ایک بڑا طبیب اشبیلیہ میں رہتا تھا جس نے ادویات مفردہ کے بیان میں ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ یہ حکیم ابن زہر سے ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ دیکھو! انجیر ہرگز نہ کھایا کرو ورنہ سرطان کا مرض تم کو ہلاک کر دے گا۔ ابن زہر کو انجیر سے بڑی رغبت تھی اس لئے وہ خوب کھایا کرتا تھا اور الفارہ سے کہا کرتا تھا کہ تم اپنی خبر لو۔ انجیر سے پرہیز کرتے ہو تو قبض میں مبتلا رہو گے اور کسی روز تپ تمہاری جان لینے کا باعث ہو گا۔ اس سلسلہ میں عجیب بات یہ ہے کہ حکیم الفارہ بالآخر قبض اور تپ سے ہلاک ہوا اور ابن زہر سرطان سے مرا۔

مرض الموت میں ابن زہر نے بہت کچھ علاج کیا لیکن جب کوئی مفید اثر نہ ہوا تو اس کے بیٹے ابوبکر ابن زہر نے ایک نسخہ تجویز کیا۔ ابن زہر نے کہا کہ بیٹا! اب نسخہ بیکار ہے کیونکہ زندگی کی فرصت پوری ہو گئی ہے اور موت کی کوئی دوا نہیں۔ علاج میں تم دیکھتے ہو کہ کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا

گیا ہے؛ مگر کوئی شے کارگر نہیں ہوتی۔ خدا کا حکم کون ٹال سکتا ہے؟ ابن زہر نے اسی بیماری میں ۵۵۷ھ ہجری مطابق ۶۲-۱۱۶۱ء میں وفات پائی تھی اور باب الفتح کے باہر دفن کیا گیا۔ ابن زہر کے مشہور شاگردوں میں ایک ابو الحسن ابن سدون تھا جو المصدوم کے لقب سے مشہور ہوا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے اپنے طبقات میں اس کا حال بھی لکھا ہے۔

ابو مروان ابن زہر کی تصنیفات بہت بڑی تعداد میں ہیں اور ان میں سے زیادہ مشہور و معروف کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ کتاب التیسیر فی المداواۃ والتدبیر
۲۔ کتاب الاغذیہ۔ اس کتاب میں غذاؤں کی قوت بتائی گئی ہے۔
۳۔ کتاب الزینۃ۔ اس میں فقط مسہلات کا ذکر ہے۔
۴۔ کتاب الامراض۔ یہ مختلف امراض پر بحث کرتی ہے
۵۔ رسالہ فی البرص والبہق
۶۔ کتاب التذکرہ

کتاب التیسیر کا ترجمہ اطالوی زبان میں بار بار چھپا ہے اور وہاں کے اطباء نے اس کی شرح بھی کی ہے جو

۱۶۲۸ء میں چھاپی گئی۔ ابن رشد کے حالات میں بیان ہو چکا ہے کہ یہ کتاب ابن زہر نے اپنے دوست اور ہم عصر ابن رشد کی فرمائش پر لکھی تھی اور اس تصنیف کی غرض یہ تھی کہ ابن رشد کی کتاب الکلیات کے ساتھ مل کر فن طبابت کا کامل مجموعہ بن جائے۔

فرانس کا مشہور و معروف مستشرق موسیو رینان جس نے ابن رشد پر بڑی تحقیق و تلاش کے بعد کتاب لکھی ہے اس دور کے علماء و فلاسفہ کی مسلمانوں میں مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جن اشیاء کو ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ نے عام طور پر مسلمانوں سے عاریتاً لیا تھا ان پر قیاس کر کے کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ اہل عرب اپنے علوم و فنون میں سے کن چیزوں کو زیادہ اہم خیال کرتے تھے اور کن کو کم۔ عرب کے علماء میں سے اہل فلسفہ ہی ایسے لوگ ہیں جن سے یورپ کی لاطینی اقوام بہ حیثیت مصنفین کے واقف تھیں مگر ان کا ذکر عربی تصنیفات میں خال ہی خال نظر آتا ہے۔ ابن باجہ ابوبکر اور ابن رشد کی کوئی شہرت مسلمانوں میں نہیں ہوئی لیکن ابو مروان ابن زہر کی خوش نصیبی تھی کہ اسے مسلمانوں میں بھی خاطر خواہ شہرت

حاصل ہوئی اور دوسری قوموں میں تو اس کی بے انتہا عزت تھی۔

۶- ابن سعید

ابن سعید اندلس کا وہ مشہور و مستند مؤرخ تھا جس نے گیارہویں صدی عیسوی کے نصف دوم کا زمانہ پایا اور اس زمانے میں جو ملکی واقعات پیش آتے رہے وہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ابن سعید اندلس کے مشہور شہر طلیطلہ کا رہنے والا تھا اور بہت سے علوم کا فاضل تھا۔ اس نے خلیفہ منصور کے عہد میں پیش آنے والے واقعات کو بڑی تفصیل سے قلمبند کیا ہے اور ان پر اپنے بیشتر مشاہدات کی روشنی ڈالی

ہے چنانچہ منصور کی طرف سے فلسفہ و ہیئت کی کتابوں کو جلانے اور دریا برد کرنے کے جو اقدامات عمل میں لائے گئے تھے اور مؤرخین نے خلیفہ الحکم کے تاریخی کتب خانہ کی نسبت جو واقعہ منصور کی طرف منسوب کیا ہے ابن سعید اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ "منصور کے اس فعل کو اس زمانے کے مؤرخ عوام الناس میں مقبولیت حاصل کرنے کی نیت کی طرف منسوب کرتے ہیں تاکہ ملکی اغراض کے حصول میں مخالفت کا اندیشہ کم ہو جائے اور خلیفہ الحکم جس کے تخت پر وہ غاصبانہ قابض ہو گیا تھا اس کے نیک نام پر دھبہ لگ جائے۔ اندلس میں طبقہ فلاسفہ کو بہت کم مقبولیت حاصل تھی۔ عام لوگ ان کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے اور امیروں اور دولت مندوں کے اثرات سے زیادہ وہ ان کے اثرات سے بے چین نظر آتے تھے۔ منصور کے زمانے کے بعد سے سوائے اس کے کہ تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے وہ بھی بعض بعض اوقات فلسفہ کو آزادی نصیب ہوئی ہمیشہ علانیہ اس کی مخالفت ہوتی رہی۔ جو لوگ اس طرف رجوع ہوتے تھے ان کی نسبت مفتیانِ مذہب بے دینی کے فتوے

لگاتے تھے اور جو لوگ کہ حکمت و فلسفہ سے بہرہ وافی رکھتے تھے وہ اپنے علوم کو اپنے قریبی دوستوں تک سے پوشیدہ رکھتے تھے کہ کہیں وہ مرتد و کافر مشہور نہ کر دیئے جائیں۔

بنو امیہ نے اندلس میں جو کام کیا تھا اسے گیارہویں صدی عیسوی کے ان انقلابات نے جو ملک میں ظہور پذیر ہوئے سب برباد کر دیا۔ قرطبہ جو علوم حکمت کی تعلیم کا مرکز تھا لوٹ لیا گیا۔ خلفاء کے محل زیر و زبر ہو گئے اور کتب خانے برباد کر دیئے گئے۔ خلیفہ الحکم کے کتب خانے کی باقی ماندہ اشیاء سستے داموں بیچ ڈالی گئیں اور تمام ملک میں پھیل گئیں۔ میں نے بعض کتابیں طلیطلہ میں دیکھی ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ منصور کی تحقیقات و تلاش اگر اس قدر ہوشیاری سے ہوتی جس کا جوش مذہب تقاضا کر رہا تھا تو بلا شبہ یہ کتابیں بھی اپنے مضامین کے لحاظ سے سپرد آتش کر دینے کے قابل تھیں لیکن اس خوبصورت سرزمین میں فلسفہ نے اس قدر گہری جڑیں کر لی تھیں کہ جتنی اس کے برباد کرنے کی کوشش کی جاتی اتنی ہی اسے حیات تازہ نصیب ہوتی تھی۔"

ابن سعید اپنے زمانے میں فلسفہ کے پڑھتے ہوئے اثرات اور بڑی وسیع مخالفت کے باوجود اس کی مقبولیت اور عوام کے ساتھ اس کی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس زمانے میں (۱۰۶۸ء) علوم قدیمہ کا مطالعہ اور تحصیل ایسی سرگرمی سے جاری تھی جیسی کہ ہمیشہ رہی ہے۔ باوجودیکہ بعض حکام وقت اب بھی مخالفت پر آمادہ رہا کرتے تھے اور ہر سال جہاد کے لئے جانے کا لزوم فلاسفہ کے گیان دھیان میں کھنڈت ڈالا کرتا تھا۔ بعض بادشاہ بے شک ایسے ہو گزرے ہیں جو ان علوم کی ترقی و رواداری کی طرف مائل نظر آتے تھے مگر تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ فلسفہ کو نہ کسی پناہ کی ضرورت پڑی ہے اور نہ نوازش کی۔ اسے نہ کسی کے حکم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور نہ کسی کی اجازت کی۔ انسان کی بیداریٔ خیال کا یہ ایک ایسا نخلہ ہے جو اپنی نشو و نما کے لئے کسی کا شرمندۂ احسان نہیں ہونا چاہتا۔

گو خلیفہ الحکم کا زمانہ فلسفہ کے لئے بہترین زمانہ سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں ایک بھی بڑے آدمی کا نام نظر نہیں آتا۔ برخلاف اس تعصب کے جو علماء و حکماء کے

ساتھ اس زمانے میں کیا جاتا تھا۔ ابن باجہ، ابوبکر رازی، ابن زہر اور ابن رشد کے خیالات اہل یورپ کی زندگی کی موجوں میں جو اصلی حقیقی زندگی ہے نمایاں نظر آتے ہیں۔"

مؤرخ ابن سعید نے جو کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی تعداد بڑی کافی ہے اور علامہ مقری نے ان کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان تصانیف میں سے حسب ذیل کتابوں کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں :۔

۱۔ وشی الطرس فی حلی جزیرۃ الاندلس۔ اس کتاب میں تحریر ہے کہ اندلس شرقی یا غربی وسطی مساحت میں ایک دوسرے سے مساوی ہیں اور ہر ایک کی مسافت دس دنوں کی ہے۔

۲۔ کتاب الشفاۃ اللعس فی حلی موسطۃ الاندلس

۳۔ کتاب الانس فی حلی شرق لاندلس

۴۔ کتاب الخلاف المریبۃ فی ذکر ما تماہ من الاندلس عباد الصلیب

۵۔ کتاب الاحسان

۶۔ کتاب حلی الحرس۔ اس میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ قرطبہ قطب خلافت مروانیہ ہے۔ اشبیلیہ سے زیادہ

اندلس بھر میں کوئی جگہ خوبصورت نہیں۔ اس کتاب کے انہوں نے سات حصے کیے ہیں۔ ہر حصہ ایک ایک مملکت کے حالات میں ہے۔ کتاب کی تقسیم اس طرح پر کی گئی ہے:-

۱۔ الکتاب الاول کتاب الحلۃ الذہب فی حلی مملکت قرطبہ
۲۔ الکتاب الثانی کتاب الذہبیۃ الاصلیۃ فی حلی المملکۃ الاشبیلیہ
۳۔ الکتاب الثالث الکتاب خدع الممالقۃ فی حلی مملکۃ
۴۔ الکتاب الرابع کتاب الفردوس فی حلی مملکۃ بطلیوس
۵۔ الکتاب الخامس کتاب الخلب فی حلی مملکۃ شلب
۶۔ الکتاب السادس کتاب الدیباجہ فی حلی مملکۃ باجہ
۷۔ الکتاب السابع کتاب الریاض المصؤنہ فی حلی مملکتہ اشبونہ

ان عنوانات میں سے ہر ایک کے ذیل میں اس مملکت کا حال بیان کیا ہے جس کا عنوانات میں مذکور ہے۔ اندلس کے متعلق انہوں نے بہت مفصل حالات لکھے ہیں۔
(نفح الطیب)

ابن سعید اپنے مؤرخانہ معلومات کی بناء پر ابن رشد کو اپنے زمانے کے فلاسفہ کا امام بیان کرتا ہے۔ چنانچہ

وزیر الحافظ ابو محمد ابن حزم نے "مفاخر اندلس" میں جو کچھ لکھا ہے اس کے تتمہ کے طور پر ابن سعید نے بھی بعض باتوں کا اضافہ کیا ہے اور علامہ مقری کے نفح الطیب میں اس کی نقل کی ہے۔ اس تتمہ میں ابن رشد کے متعلق فاضل مصنّف لکھتا ہے کہ کتب فلسفہ میں اس زمانے میں ابو الولید ابن رشد القرطبی ہمارے امام ہیں۔ باوجود اس کے کہ بنی عبدالمومن کا تاجدار منصور ان سے اور ان کے علم سے سخت ناراض تھا یہاں تک کہ ابن رشد کو اسی جرم میں قید کر دیا گیا تھا مگر پھر بھی اس کی بہت سی تصانیف اس فن میں کی ہوئی موجود ہیں۔

الغرض ابن سعید اس دور کا وہ عظیم القدر مورخ تھا۔ جس نے اپنی تصانیف کے ذخیرہ کی بدولت مشرقی ممالک کے گوشے گوشے تک شہرت حاصل کی اور سرزمین اندلس کے مختلف حصوں کے مدنی، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی حالات کے متعلق اپنے تجربات و مشاہدات پوری تفصیل و تشریح کے ساتھ قلمبند کیئے۔ ابن سعید ایک نادر التحریر مؤرخ تھا جس کی نظیر اس دور کے مؤرخین میں خال خال ہی دکھائی دیتی ہے اور اس کے کمال فن کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ملک کے جس

حصّہ کے حالات بیان کرتا ہے اس کی پوری تصویر الفاظ کے ذریعہ سے کھینچ دیتا ہے اور اسی بات میں اس کے علم و کمال کا راز مضمر تھا۔

۷۔ علامہ ابن سبعین

یہ اندلسی حکیم سنہ ۶۱۴ ہجری میں مرسیا کے مقام پر پیدا ہوا۔ پچیس سال کی عمر میں اس نے اپنے کمال فن کی بدولت بہت عظیم اور تاریخی شہرت حاصل کر لی اور فریڈرک ثانی شہنشاہ روم و اٹلی کے لئے اس نے مسائل صقلیہ کے نام سے فلسفہ پر ایک کتاب لکھی جس میں ابدیت عالم اور ماہیت روح کے متعلق بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی تھی۔

فریڈرک ثانی شہنشاہ روم و جرمنی اور شاہ سسلی و یروشلم جو سنہ ۱۱۵۴ء سے سنہ ۱۲۵۰ء تک ہوہنسٹافن خاندان

کا عظیم الشان فرمانروا گزرا ہے۔ عربی علوم و فنون کا بہت دلدادہ تھا اور حکمائے عرب کے ساتھ اس کے جو تعلقات تھے ایک فرانسیسی مؤرخ موسیئر اماری (MONSIEUR AMARI) نے ان کے بارے میں بڑے عجیب و غریب واقعات لکھے ہیں اور ان ہی میں ایک یادگار زمانہ واقعہ یہ نقل کیا ہے کہ ۱۲۴۰ء کے اختتام کے قریب اس شہنشاہ نے مختلف اسلامی ممالک کے علماء و فضلا کے پاس فلسفہ کے سوالات کا ایک سلسلہ بھیجا تاکہ اس کا حل کریں۔ ممالک عرب کے بہت سے حکماء نے ان سوالات کو حل کر کے شہنشاہ کی خدمت میں ارسال کیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جوابات سے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ چنانچہ مایوسی کے عالم میں اس نے آخر کار خلفائے موحدین اندلس کے خلیفہ راشد کو لکھا کہ ابن سبعین ساکن مرقیا کا پتہ لگائیں جو اندلس میں اس زمانے میں سب سے بڑا حکیم ہے اور جو سوالات بھیجے جا رہے ہیں وہ اس حکیم کے پاس روانہ کر دیئے جائیں۔ فریڈرک کے سوالات کا عربی نسخہ اور ابن سبعین کے جوابات آکسفورڈ کے ایک قلمی نسخہ میں موجود ہیں۔ جس کا نام "مسائل صقلیہ"

ہے۔ قدم عالم، منہاج المذہب و ما بعد الطبیعات، معقولات کی تعداد اور قدر و قیمت، حقیقت روح، اور اسی قسم کے کچھ دیگر امور تھے جن پر شہنشاہ نے حکمائے اسلام سے روشنی ڈالنے کے لئے کہا تھا۔

ابن سبعین نے جو جواب دیا ہے اس کے پڑھنے سے اس کی سراسیمگی اور اضطراب کی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے شہنشاہ کو تو اپنی حکومت کے توسط سے جوابات روانہ کر دیئے مگر اس کی ہر سطر اور ہر جملہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بچ بچ کے جواب دے رہا ہے تاکہ کہیں اس پر کفر و الحاد کا الزام نہ لگایا جائے اور بظاہر اپنی ٹھیک رائے کو بھی مجبوراً ہیر پھیر کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ جو مسائل ان میں سے بہت نازک ہیں ان کے متعلق شہنشاہ سے درخواست کرتا ہے کہ یا تو اسے ملاقات کا موقع دیا جائے اور زبانی جوابات سنے جائیں یا کسی شخص کو وہاں بھیجا جائے تاکہ پوشیدہ طریقہ سے وہ جوابات لکھ کر اس کے حوالے کر دیئے جائیں۔ بعض دفعہ وہ شہنشاہ سے یہ بھی درخواست کرتا ہے کہ سوال ذرا پیچیدہ و مبہم الفاظ میں جو آسانی سے سمجھ میں نہ آسکیں ترتیب دیئے جائیں۔ اس کی وجہ

ابن سبعین یہ بتاتا ہے کہ

"اس ملک میں جب ان امور سے بحث
کی جاتی ہے تو انسانی طبیعتیں تلوار اور
قینچی سے زیادہ تیزی دکھاتی ہیں ۔ اگر
ہمارے علماء کو یقینی طور پر معلوم ہو جائے
کہ میں نے ان سوالات کے بعض اجزاء
کے جوابات روانہ کئے ہیں تو جس نظر
سے وہ ان سوالوں کو دیکھیں گے اسی
سے مجھے بھی دیکھیں گے اور میں نہیں
جانتا کہ خدا اس وقت اپنے فضل و کرم
سے مدد فرمائے گا یا نہیں"

فریڈرک سے ابن سبعین کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی اور
سچی بات تو یہ ہے کہ جو مدعیانہ اور گستاخانہ لہجہ اس نے
اپنے اہل ملک کے تعصبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے مجبوراً
اختیار کیا تھا اس کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ ایسے دل جلے
شہنشاہ کے دربار میں اس کا قیام ہو سکے۔

اس واقعہ سے یہ بات پورے طور سے پایۂ ثبوت
کو پہنچتی ہے کہ ابن سبعین ایک بے مثل حکیم اور لاجواب
فیلسوف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شہنشاہ فریڈرک کو ابن سبعین

کے جوابات کے سوا کسی دانشور کے جوابات مطمئن نہ کر سکے اور یہی اس کی عظمت اور اس کے فنی کمالات کا ناقابل تردید ثبوت تھا۔

۸- علامہ ابن جبیر

علامہ محمد ابن جبیر کی کنیت ابوالحسین ہے۔ اس کی ولادت ہفتہ کی شب میں ۱۰ ربیع الاول ۵۴۰ھ کو بلنسیہ کے مقام پر واقع ہوئی۔ آباو اجداد اندلس کی مختلف آبادیوں میں آباد ہوتے رہے۔ اس کا باپ میر منشی تھا اور شاطبہ کے اکابر میں شمار ہوتا تھا۔ ابن جبیر نے شاطبہ کی سکونت ترک کر کے غرناطہ میں بود و باش اختیار کی اور یہاں وہ ابو سعید عثمان بن عبدالمومن والی غرناطہ کا کاتب مقرر ہوا۔ شیخ احمد المقری نے اپنی کتاب "نفخ الطیب من غصن الاندلس الرطیب" کے پانچویں باب

میں ابن رفیق کے حوالے سے لکھتا ہے کہ "ایک روز عبدالمومن نے مے نوشی کے جلسہ میں ابن جبیر کو کسی کام کے لیئے طلب کیا۔ حاضر ہوا تو اس کی طرف بھی جام شراب بڑھایا گیا۔ عرض کی کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ اس پر بادشاہ نے ترجمت وسلطنت اور کچھ نشہ کی ترنگ کے سبب سے قسم کھا کر کہا کہ اب تو سات جام پینے پڑیں گے اس نے مجبور ہو کر سات جام پیئے اور عبدالمومن نے اس تعمیل حکم کے صلہ میں وہ جام سات مرتبہ اشرفیوں سے بھر کے انعام دیا"

علامہ مقری نے ابن رفیق کی روائت کے حوالے سے یہ حکائت تو نقل کر لی اور یہ دونوں بزرگ اس قدر ثقہ ہیں کہ ان کے بیان پہ اعتماد کرنا ضروری ہے لیکن اس حکائت کی صحت قابل یقین نہیں معلوم ہوتی کیونکہ علامہ ابن جبیر ایک صوفی مشرب اور پارسا آدمی تھا اور یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ اس نے دیدہ و دانستہ یا خوف کی وجہ سے بھی اس ناجائز فعل کو اپنی ذات کے لیے روا رکھا ہو۔ اگرچہ وہ خوف کی حالت میں معذور بھی تھا۔ لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے کبھی شراب کو چکھا تک نہیں ایک ہی وقت

پر متواتر سات جام نوش کر جائے۔ بہر حال مورخین نے اسی واقعہ کو علامہ مذکور کے سفر کا باعث ظاہر کیا ہے اور وہ اس طرح کہ ابن عبد المومن کی مجلس سے گھر واپس آ کر علامہ ابن جبیر نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس گناہ کے کفارہ کی غرض سے حرمین شریفین کی زیارت کو جاؤں گا چنانچہ اس نے اپنی تمام املاک و جائداد فروخت کر کے زاد راہ کا انتظام کیا اور عبد المومن کے عطیہ کو خیرات کر دیا۔ لیکن ابن جبیر نے اپنے سفرنامے میں کہیں اشارۃً بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بھی ایک قصہ ہے ورنہ یہ کبھی امید نہیں ہو سکتی کہ ابن جبیر اپنے سفر کی وجہ بیان نہ کرتا۔ اگر اسے قدرتی طور پر سیاحت کا شوق نہ تھا تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے گھر سے حج بیت اللہ شریف اور زیارت مدینہ منورہ کے ارادہ سے نکلا ہو اور عجائبات عالم کو دیکھ دیکھ کر اس کے دل میں سیاحت کا خیال پیدا ہو گیا ہو ورنہ یہ واقعہ اگر غلط نہیں تو کم از کم یہ تو نہایت ضروری ہے کہ اسے شراب نہیں بلکہ نبیذ (جو کا نشہ آور پانی) پینے کے لئے مجبور کیا گیا ہو کیونکہ نبیذ کے متعلق علماء نے فتوی

دے دیا تھا کہ وہ مباح ہے۔ مگر اکثر و بیشتر اہل اللہ اسے بھی حرام سمجھتے تھے۔ الغرض جمعرات کے روز ۸ شوال ۵۷۸ھ ہجری کو علامہ ابن جبیر غرناطہ سے روانہ ہوا یہ اس کا پہلا سفر تھا۔ ۲۲ محرم ۵۸۱ھ ہجری کو جمعرات کے دن وہ غرناطہ واپس آیا۔

علامہ ابن جبیر سلطان صلاح الدین ایوبی کا ہم عصر تھا۔ چنانچہ وہ اپنے سفرنامہ میں سلطان کے حسن انتظام اور دیگر خوبیوں کی بہت تعریف کرتا ہے۔ جس وقت سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس کو فتح کر کے یورپی عیسائیوں کو شکست دی۔ علامہ ابن جبیر جمعرات کے دن ربیع الاول ۵۸۵ھ ہجری کو غرناطہ سے دوبارہ ممالک مشرقیہ کی سیاحت کو روانہ ہوا اور اس کا یہ دوسرا سفر جمعرات ۱۲ شعبان ۵۸۷ھ کو ختم ہوا لیکن اب کی غرناطہ میں اس کی رہائش چند روزہ تھی کیونکہ اس نے غرناطہ سے مالقہ اور پھر سبتہ اور یہاں سے فاس میں اقامت اختیار کی۔ ابن جبیر میں جہاں اور بہت سے خوبیاں تھیں وہاں ایک بات یہ بھی قابل تعریف تھی کہ اسے اپنی بیوی سے بے حد انس تھی۔ سبتہ میں جب اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تو اسے

سخت صدمہ ہوا اور دنیا سے دل بیزار ہو گیا۔ اسی وقت زیارت بیت اللہ کے واسطے چل دیا۔ مدت تک خانۂ مطہر و مقدس میں قیام گزیں رہا اور پھر وہاں سے مصر کو چلا گیا پھر یہاں سے اسکندریہ کو روانہ ہو گیا۔ مقریزی کے قول کے مطابق اس جگہ بدھ کے روز ۲۷۔ شعبان ۶۱۴ھ کو انتقال کر گیا۔

علامہ محمد ابن جبیر ۵۸۱ھ (۱۱۸۵ء) میں بغداد وارد ہوا جہاں اس وقت ابو العباس احمد الناصر الدین اللہ (ابن المستنضی بنور اللہ ابی المحمد الحسن بن المستنجد باللہ ابی المظفر یوسف) خلیفہ تھا۔ خلافت عباسیہ کے زوال کے ساتھ بغداد بھی تنزل پر تھا۔ حوادث زمانہ نے اس کا اکثر حصہ ویران کر دیا تھا۔ چنانچہ ابن جبیر خود ہی لکھتا ہے:۔

"اگر خلفائے عباسیہ کا دار الخلافت نہ
ہوتا تو اب تک بجز نام کے نشان بھی
باقی نہ رہتا۔ حوادث کے قبل یہاں کی
رونق قابل دید تھی اور اس کا ثبوت منہدم
عمارتیں زبان حال سے دے رہی ہیں"

ایک جگہ یہ شہرۂ آفاق سیاح دریائے دجلہ کے متعلق لکھتا ہے:

"دجلہ ہزاروں حسن پیدا کر رہا ہے۔ دریا نہیں بلکہ چوکھٹے میں آئینہ لگا ہوا ہے یا کسی حسین گلے میں موتیوں کا ہار پڑا ہوا ہے۔ یہ دریا اس شہر کو تر و تازہ رکھتا ہے شہر میں سے دریا صاف آئینہ کی طرح نظر آتا ہے۔ اس کی آب و ہوا سے نشاط پیدا ہوتی ہے اس لئے یہاں کی آب و ہوا طرب انگیز مشہور ہے"

اس کے بعد علامہ ابن جبیر باشندگان بغداد کی نسبت لکھتا ہے کہ:

"ہر ایک شہر کا یہ عقیدہ ہے کہ لم یخلق مثلها فی البلاد بغداد ہی کی صفت ہے۔ بغداد سا دوسرا شہر آباد ہونا دشوار ہے۔

اہل بغداد بجز اپنے شہر کے کسی شہر کو اچھا نہیں سمجھتے گویا ان کے نزدیک خدا کی خدائی میں نہ ان کے شہر کے سوا کوئی شہر ہے اور نہ ان کی ذات کے سوا کوئی بندہ ہے"

غرضیکہ ابن جبیر ایک نہایت محقق سیاح تھا۔ جس کی سیاحت کے واقعات بڑی فصیح و بلیغ طرز تحریر میں لکھے گئے ہیں اور ایک علمی خزانہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے سفرنامہ میں ایسی خوبیاں ہیں جو پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔

حکمائے یہود

گزشتہ اوراق میں جن حکماء اور دانشوروں کے حالات تحریر کئے گئے ہیں وہ سب کے سب مسلمان تھے لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان یہودی حکماء کے حالات بھی درج کئے جائیں جو اپنے کمال علم کی بدولت شہرت و ناموری کے بلند مقام پر پہنچے۔ چونکہ یہ لوگ بھی علوم و فنون کے میدان میں بڑے قابل قدر کارنامے انجام دے چکے ہیں۔ اس لئے یہ بہت نامناسب بات ہوگی کہ دانشوروں کے تذکرہ میں ان کی حق تلفی کی

جائے لہٰذا بعض مقتدر یہودی دانشوروں کے حالات بھی کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔

---

۹ - ابن جبرول

ابن جبرول ایک یہودی حکیم تھا جو ۱۰۲۱ء عیسوی میں ملافا کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کی زندگی بہت پُرآشوب رہی اور بڑی کم سنی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ الحریزی کہتا ہے کہ ابن جبرول ۲۹ برس کی عمر میں مرا۔ موسیٰ بن عذرا تیس سال کی عمر میں اس کا مرنا بتاتا ہے لیکن ابراہیم زکوط کہتا ہے کہ وہ ویلنشیا میں ۱۰۷۰ء میں مرا ہے۔ موسیو اسٹین سنیڈر کے نزدیک اس کا سن وفات ۱۰۵۸ء صحیح ہے جس کا ذکر بعض اور مؤرخین نے بھی کیا ہے۔

اس کا مذہب تھا کہ عقل نفس ناطقہ کی علت ہے اور

نفس ناطقہ نفس حسی کی علت ہے۔ اسی کا نام "مادہ عامہ" ہے جو تمام عالم میں جاری و ساری ہے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ تمام مخلوقات روحانی یا جسمانی مادہ اور صورت سے مرکب ہیں۔ مادہ کے مختلف انواع "مادہ عامہ" کی صرف مختلف قسمیں ہیں۔ ذات احدیت قدیم اور عقل کے مابین ارادۂ الٰہی داخل ہے اور مادہ صورت کے امتیاز سے بالاتر ہے لیکن ساتھ ہی عقل ان کے متحد ہونے کا باعث بھی ہے۔ اسی شخص نے سب سے پہلے عربی عروض کو عبری عروض میں جگہ دی۔

علامہ ابن رشد کے حالات کی ابتداء میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ خلیفہ الحکم کی عالی ظرفی اور علوم نوازی نے تعلیم کے دائرہ کو نہایت وسیع کر دیا تھا اور ایک نامور یہودی فاضل حسدای بن اسحاق کو اپنے دربار میں داخل کیا اور دولت سے مالا کر دیا۔ اسی فاضل نے زر خطیر صرف کر کے مشرقی ممالک سے تمام تاریخی کتابیں منگوائیں اور اس وقت سے اسپین کے یہودی بہت آزادی کے ساتھ علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوئے حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد یہود میں بھی اچھے علماء اور دانشور پیدا ہو گئے۔

فلسفۂ عرب پر یہودیوں نے بڑے التفات کے ساتھ توجہ صرف کی۔ اسلام میں فلاسفہ کہیں جستہ جستہ نظر آتے تھے کیونکہ لوگ انہیں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور جن دو تین بادشاہوں نے ان کی حمایت و حفاظت کی وہ بھی پختہ مذہب مسلمانوں کی ملامت کا نشانہ بنے۔ ان کی تصنیفات کا اگر کہیں پتہ ملتا ہے تو عبرانی تراجم یا عبری حروف میں جن میں یہودیوں کے استعمال کے لئے کتابیں نقل کی گئی تھیں۔ از منۂ وسطیٰ میں جس قدر یہودیوں کا تمدن تھا وہ سب کا سب اسلامی تہذیب و تمدن کا عکس تھا جو عیسائی تہذیب سے زیادہ ان کے حسب حال تھا۔ یہ اہل عرب ہی کے اثر کا نتیجہ تھا کہ دسویں صدی عیسوی میں دار العلوم سورا میں (جو بغداد کے قریب ہے) پہلی مرتبہ کوشش کی جاتی ہے کہ ایک معقولی علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔ اس دار العلوم کا نام سعدیہ تھا۔ اندلس میں جب مسلمانوں کے غلبہ کا زمانہ آیا تو یہاں بھی یہی نتائج ظاہر ہونا شروع ہوئے کسی قوم کے فاتحین نے کبھی تحمل، رواداری اور اعتدال کو مفتوحین کے حق میں اس حد تک روا نہیں رکھا ہے جتنا کہ اہل عرب نے روا رکھا۔ دسویں صدی عیسوی

سے عربی زبان مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ سب کی
مشترکہ زبان تھی۔ مذہبی پیشواؤں کی مخالفت کے باوجود
باہم ایک دوسرے میں شادی بیاہ تک ہوا کرتے تھے
لاطینی زبان اور علوم مذہب کی تعلیم بہت زیادہ اعتبار
سے گر گئی تھی۔ ایک اسقف ایسے قصیدے تصنیف
کرتا نظر آتا تھا جس میں زبان کی روانی، وزن شعر اور اس
کی نزاکتیں تمام تر مدنظر رکھی جاتی تھیں الواری جو قرطبہ
کا منصب اسقف تھا اپنے اہل ملک کو مسیحی علم و
ادب کے مقابلہ میں عربی ادب کو ترجیح دینے پر سخت
ملامت کرتا ہے کہ یہ لوگ اپنے مذہب اور اپنی زبان
دونوں کو ایک ساتھ ترک کرتے چلے جاتے ہیں اور اسلامی
بلاغت و معانی کی نزاکتیں اور موزوں قوافی اختیار کرتے
جا رہے ہیں۔ یہودیوں نے عربوں کی فتح کو اس سے
بھی زیادہ طوع خاطر کے ساتھ تسلیم کیا۔ اس قوم کو اجنبی
ممالک کے دور دراز سفر میں آخر کار یہاں تھوڑا سا آرام ملا
اور یہ مقام ان کے لئے نمونۂ یروشلم بن گیا۔ اندلس زمانہ
دراز تک یہودیوں کا دوسرا وطن بنا رہا۔ ۱۲۵ء میں
ایڈریین کے زمانے میں یہود خاندانوں کی ایک بڑی تعداد
اس بلا سے جو اس قوم پہ نازل ہوئی تھی راہ فرار اختیار

کر کے اندلس میں پناہ گزیں ہوئی تھی اور جب سے اسی جگہ سکونت پذیر تھی۔ عربوں کو انہوں نے مصیبتوں سے نجات دینے والا سمجھا اور علم و حکمت اور مطالعہ کی ہم مذاقی نے ان دونوں قوموں کے شیر و شکر ہو جانے میں جو کمی رہ گئی تھی۔ اس کی تکمیل کر دی تھی کہ لوگوں نے دیکھا ہے کہ یہودی دارالعلوم قرطبہ کی صدارت کر رہے ہیں۔ ذہنی تہذیب کا یہ رشتۂ اتحاد ایسا ہے کہ ہمیشہ مذہبی تحمل و روا داری پھیلانے کا بہترین ذریعہ سمجھا گیا ہے۔

اندلس کے یہود کو فلسفہ کی طرف جو رغبت ہوئی اس کی اوّلین محرک خاص طور سے وہ علمی سرگرمی تھی جو مشرق میں سعدیہ کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ عدائی ابن شفروت جو خلیفہ حکم ثانی کا طبیب تھا اس رسوخ سے جو خلیفہ کی خدمت میں اسے حاصل تھا یہ کام لیتا تھا کہ اپنے ہم مذہب باشندگان اندلس میں ان علوم عقلیہ کو پھیلائے جس کی ابتداء مدرسہ سوار سے ہوئی تھی۔

اندلس کے فیلسوف اعظم علامہ ابن باجہ سے ایک پشت پہلے ابن جبردل یہودی کا زمانہ تھا۔ یہ شخص اپنے اہل مذہب میں یگانۂ روزگار تھا۔ مذہبی علماء اس کی بے باکی سے بہت ناخوش تھے لیکن خلق عالم کے

مسئلہ میں مختص مذہب جماعت کے ساتھ اس نے جو بڑی رعائتیں کی تھیں۔ ان کی وجہ سے وہ موسیٰ میمونی کے جانشینوں سے جو فلسفۂ ارسطو میں ابن رشد کی پیروی کرتے تھے بہت پیچھے رہ گیا یہی وجہ ہے کہ اس کی کتاب "ینبوع الحیات" کا عبرانی نسخہ گوشہ گمنامی میں رہ گیا اور اس کے برخلاف لاطینی نسخہ کو بہت بڑا مرتبۂ استناد حاصل ہوا غرضیکہ گیارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے فلسفۂ ارسطو کے حامی و حامل یہی یہودی رہے۔ ان کے مقابلہ میں عرب متکلمین کے تولیفانہ مسائل کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی تھی۔ چنانچہ اہل مذہب کو اندیشہ ہونے لگا اور انہوں نے تردید کی کوششیں شروع کر دیں جن کا پتہ مشہور ومعروف کتاب خضری مصنفۂ یہوداۓ علوی سے خاص کر ملتا ہے اس تحریک نے لوگوں کے ضمیر میں ایک سخت "تلاطم" پیدا کر دیا اور جتنے طریقے ممکن تھے وہ سب ہی اختیار کیے گئے کہ عقائد مذہب کو عقل کے مطابق کیا جائے اس کے بعد موسیٰ ثانی کا دور آیا جس نے اپنی ذکاوت و فطانت جبلی سے تمام مسائل ما قبل کا رشتہ پھر ہاتھ میں لیا اور فلسفۂ یہود کا صحیح معنوں میں بانی مبانی

کہلائے جانے کا مستحق ہوا۔

بہرکیف ابن جبرول یہودی فلاسفہ میں نہایت بلند پایہ فاضل تھا جس نے اپنے زمانے میں علم و حکمت کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ یہ ان حکماء میں شمار ہوتا ہے جو فلسفۂ الہیات کے متقدین کی یاد تازہ کرنے کا باعث ہوئے اور ان فضلاء کی صف اوّل میں سمجھے جاتے تھے جو فلسفۂ ارسطو کے مکمل ترجمے ہونے سے پہلے گزرے ہیں۔ اس کا کمال علم تمام یہودیوں کے لئے باعث فخر تھا اور آج بھی وہ اس پر فخر کرتے ہیں۔

۱۰- موسیٰ میمونی

افریقہ کے مشہور مورخ لاڈن کا بیان ہے - کہ موسیٰ میمونی ابن رشد کے زمانۂ نکبت تک اس کا شاگرد اور میزبان رہا ہے۔ موسیٰ نے یہ دیکھا کہ یا تو اُستاد سے ترک تعلق کر لینا پڑے گا یا مہمانداری اور مدارات میں کمی کرنی ہو گی۔ اس لئے وہ حالات حاضرہ سے خوف زدہ ہو کر مصر چلا گیا۔

موسیٰ میمونی ۱۱۳۵ء میں قرطبہ کے مقام پر پیدا ہوا تھا اور ۱۲۰۵ء میں اس جہاں سے رخصت ہو گیا۔ عبدالمومن کی خلافت کے زمانے میں اندلس سے

چلا گیا اور مصر میں سکونت اختیار کی۔ یہاں اس نے سلطان صلاح الدّین ایوّبی کی ملازمت کر لی تھی۔ ایک فرانسیسی مؤرخ موسیو منک کے اس قصّہ کو مہمل اور لغو بتایا ہے جو موسیٰ کے مصر جانے کی وجہ کے طور پر لاؤن افریقی نے لکھا ہے۔ موسیو منک کہتا ہے کہ ابن رشد جب نکبت کا شکار ہوا اس سے تیس سال پہلے موسیٰ میموئنی اندلس سے ہجرت کر چکا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی کتاب موریبوکم کے باب دوم و نہم میں لکھتا ہے کہ میں ابن باجہ کے شاگرد کا شاگرد ہوں۔ لیکن اس میں کہیں ابن رشد کا ذکر تک نہیں کرتا علاوہ اس کے وہ صحیح تاریخ بھی واضح ہے جب سے ابن رشد کی تصنیفات اس کے علم میں آنا شروع ہوئیں اگر اس تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اس کی زندگی کے آخری زمانے کی بات ہے۔ ۱۱۹۰ء/۱۱۹۱ء میں اس نے قاہرہ سے اپنے عزیز شاگرد یوسف بن یہود کے نام ایک خط لکھا تھا جس کا مضمون یہ ہے:

"مجھے حال ہی میں وہ تمام کتابیں سوائے
حس و محسوس کے دستیاب ہوئی ہیں
جو ابن رشد نے تصنیفات ارسطو پر لکھی

ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس نے حق کو
نہایت ہی انصاف کے ساتھ دریافت کیا
ہے۔ لیکن ابھی تک مجھے اس کی تصنیفات
کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا۔"

میمونی کو ابن باجہ کی شاگردی کا بھی موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اگرچہ لاڈن افریقی کا کہنا یہی ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی تقلید میں یہی کہتے چلے آئے ہیں لیکن جس وقت علامہ ابن باجہ کا انتقال ہوا اس وقت موسیٰ میمونی کی عمر صرف تین سال کی تھی۔ ابن رشد کو موسیٰ میمونی کی بدولت یہودیوں میں استناد کا جو درجہ حاصل ہوا وہ در اصل اس اثر کا ایک بالواسطہ نتیجہ تھا جو اس شخص کی ذات سے یہود کے علوم پر پڑا۔ میمونی اور ابن رشد دونوں نے ایک ہی چشمہ سے فیض حاصل کیا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی جگہ پر اسی فلسفہ کا اتباع کیا جس کی عرب حکماء نے تعلیم دی تھی اور دونوں اپنی اپنی تحقیقات میں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے تھے اس لئے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کہ بعض مؤرخین ان دونوں کے فلسفہ کی ہمرنگی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ خیال کرتے تھے کہ موسیٰ میمونی بھی

ابن رشد کے تلامذہ میں سے تھا اور اس کا شاگرد ہوتا بھی تو اس میں کیا مضائقہ تھا۔ ابن رشد کی شاگردی بھی اپنی جگہ پر ایک قابل قدر اعزاز اور باعث فخر سعادت سے کم نہ تھی۔

یہ یہودی حکیم جس مقام پر متکلمین کے مقابلہ میں بحث کرتا ہے صرف وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اسے حکمائے عرب سے کس قدر ہمدردی اور ہم خیالی ہے۔ وہ یہ نہیں مانتا کہ عالم کو قدیم جاننا کسی سخت کفر و الحاد کی بات ہے اور یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ خدا کو مخلوق سے کسی نہج پر کوئی مماثلت و مشابہت ہو سکتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

"ہم خدا کی نسبت یہ کہہ سکتے ہیں۔
کہ وہ ایسا نہیں ہے مگر یہ نہیں کہہ
سکتے کہ وہ ایسا ایسا ہے"

حتیٰ کہ وہ خدا کے ساتھ وجود توحید اور قوم کی صفات کو بھی حق سے منسوب کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ان صفات کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ ذات بحث سے بالکل جُدا ہو سکتی ہیں اور اس کا اندیشہ خاص طور پر پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں عیسائیوں کے

مسئلہ اقانیم ثلاثہ سے اس میں کوئی مشابہت نہ پیدا ہو جائے۔

یہ عقیدہ وہی ہے جو اکثر یہودی فلاسفہ نے اختیار کر رکھا تھا اور موسیٰ میمونی بھی اسی پر اعتقاد رکھتا تھا۔ بلکہ اپنے عقائد کی صداقت میں بڑے دلائل دیتا تھا۔

۱۱۔ لوی ابن جرشون

چودھویں صدی عیسوی کے زمانے میں بنی اسرائیل میں ابن رشد کی بہت بڑی سند مانی جاتی تھی۔ اس زمانے کے فلاسفہ میں سب سے زیادہ مشہور حکیم لوی ابن جرشون تھا جس نے ابن رشد کے شروح اور دیگر تصانیف کے متون کی شرح کی ہے۔ مثال کے طور پر جوہر الکون رسالۂ امکان اتصال۔ بعض لوگوں کے لئے اس کی فرہنگ ابن رشد کے متون کی ایک ایسی ہی جزو ہو گی جیسی کہ خود ابن رشد کی شرح متن ارسطو

کا جزو لازمی ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وسطی زمانے میں اصلی متون کے یہ ملخصات کہ تشریحات جو ثانی و ثالث اشخاص کیا کرتے تھے بہت پسند کی جاتی تھیں۔

لوی ابن جرشون کے مسائل بالکل وہی ہیں جو فلسفہ ارسطو کے عرب پیرووں کے تھے۔ اس نے موسیٰ میمونی سے بھی زیادہ جرأت کی ہے اور عقائد موسوی کو فلسفہ کے مطابق بتایا ہے۔ یہ شخص عالم کے ازلی و ابدی ہونے اثبوت کے وہبی ہونے، مادۂ اولی کے بلا صورت موجود ہونے کا اور تخلیق کے عدم امکان کا کسی تردد کے بغیر قائل تھا۔ اس طریقہ پر بنی اسرائیل میں ارسطو کی جگہ ابن رشد کو حاصل ہو گئی اور اسی کی کتابوں کی شرحیں کی جاتیں انہی کے خلاصے کئے جاتے اور اسی کی تصنیفات کو ضروریات تعلیم کے ملخص و مختصر کر لیا کرتے تھے۔

الغرض لوی ابن جرشون کی کوششوں نے یہودیوں میں فلسفۂ ارسطو کو ابن رشد کی شرحوں کے ذریعہ سے اتنے وسیع پیمانے میں پھیلایا اور اس فلسفہ کے نظریات

کی تعلیم یہاں تک عام کی کہ پوری قوم یہود اسی کے رنگ میں رنگی گئی اور وہی تصوّرات اس کا نظریۂ حیات بن گئے جن کو لوی نے ابن رشد کی تصنیفات سے اخذ کر کے بنی اسرائیل کے سامنے رکھا۔ اس کی اس جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوی کو حکمت و فلسفہ میں لازوال شہرت حاصل ہو گئی۔

۱۲۔ موسیٰ ناربان

لوی ابن جرشون فلسفۂ ابن رشد کو بنی اسرائیل میں عام کرنے کے لئے جو کام شہر پگنان میں کر رہا تھا موسیٰ ناربان جو لوی ابن جرشون کا ہم عصر تھا ناربان کے مقام پر جو پگنان سے چند میل کے فاصلہ پر ہے وہی کام کر رہا تھا۔ ۱۳۴۴ء میں اس نے رسالہ امکان اتصال کی ایک شرح لکھی۔ ۱۳۴۹ء میں جوہر الکون اور ابن رشد کے دیگر طبیعی رسالوں کی شرح لکھی۔ رسالہ ہائے طبیعیات اخلاق، شرح رسالۂ عقل مصنفہ اسکندر افرودیسی اور

نصاب رشدی کے قریب قریب تمام اجزاء اس کے ہاتھوں از سر نو تیار ہوئے اور قریباً کئی ابن رشد کے ترجمے اس کی طرف اور لوی ابن جرشون کی طرف منسوب ہیں لیکن دونوں استادوں نے ابن رشد کے رسالوں پر جو رسالے لکھے ہیں انہیں بھی بعض اوقات واقعات کی بناء پر غلطی سے لوگ ترجمے ہی سمجھنے لگے۔ نیز جو شرحیں یوسف ابن فسلی نے ۱۳۳۰ء میں اخلاق ارسطو و سیاست مدن افلاطون پر ابن رشد کی تقلید میں لکھیں انہیں بھی لوگوں نے محض غلط فہمی کی وجہ سے ترجمے ہی تصوّر کیا۔

عربی فلسفہ کا اثر قرائین تک پہنچتا ہے۔ قرائین کے معنی قرأت کرنے یعنی پڑھنے والوں کے ہیں۔ بنی اسرائیل کا ایک فرقہ ہے جسے قراء کہتے ہیں۔ یہ لوگ کتاب آسمانی کے محض لفظی معنی مراد لیا کرتے ہیں اور لسانی روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لوگ تالمود کی سند نہیں مانتے اور ربیئین کے خلاف عقائد رکھتے ہیں یہاں اسی فرقہ سے مراد ہے اور ان میں بھی محققین کی ایک خاصی تعداد پیدا ہوئی ہے۔ ابن رشد کا کلام اکثر اہرون بن ایلیاسے نیکا میڈ کی تصنیف میں منقول

ہے جو ۱۳۲۶ھ میں "شجرۃ الحیات" کے نام سے قاہرہ میں طبع ہوئی اور جس میں مصنف نے موسیٰ میمونی کی کتاب الہادی کا تتبع کیا ہے۔ اہرون کا نظریۂ عقل فلسفۂ عرب سے بہت ملتا جلتا ہے جس طرح کہ روح جسم کی صورت ہے۔ اسی طرح عقل مستفاد (اکتسابی) بھی روح کی صورت ہے۔ روح جو بالکل پردۂ امکان میں مخفی تھی جسم سے متصل ہوتے ہی اپنا عمل شروع کرتی ہے۔ جب جسم مر جاتا ہے تو روح کا وہ حصہ بھی جو جسم کے ساتھ تعلق رکھتا ہے فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن جو حصہ کہ محض عقل ہے اور جو انسان کا جوہر اعلیٰ ہے وہ فنا نہیں ہوتا۔ مگر اہرون ابن ایلیا، لوی ابن جرشون اور موسیٰ ناربانی کی طرح فلسفہ ابن رشد کا کلیتاً پیرو نہیں ہے بلکہ بعض اجزاء کے طور پہ اس کی پیروی کرتا ہے۔ اور بہت سے نظریات سے اپنے اختلاف کا اظہار کرتا ہے حتیٰ کہ ابن رشد کی ان آراء کی تردید کرتا ہے جو افلاک کے سادہ غیر جسمی، اور قابل فنا ہونے پر مبنی تھیں اور عالم کو اجرام سماوی کی قسمت پذیر اور عارضی الاصل ہونے کی بنیاد پر حادث ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے دیگر یہودی حکماء کو اتفاق نہیں ہے۔

ان یہودی دانشوروں کے طبعی رجحانات اور ان کے عام تقلبات سے یہ حقیقت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے علم و کمال کا اصل سرچشمہ انہی دانشوران عرب کی تصانیف تھیں جن سے ان یہودی فاضلوں نے استفادہ کیا اور جن کا مطالعہ انہیں دانشور اور حکماء کے رتبہ تک پہنچانے کا باعث ہوا۔ موجودہ ترقی یافتہ زمانے کے حکماء و فلاسفہ میں سے کسی شخص کو بھی اس صداقت تابندہ سے انکار کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اندلس کی سرزمین کو مسلمانوں کے وجود سے جو گوناگوں فائدے حاصل ہوسکے اور اسلامی اندلس سارے مغرب کے لئے جن علمی فیوض و برکات کا موجب ہوا ان میں ایک تاریخی فیض یہ تھا جس نے اس سرزمین کو عدیم المثال حکماء کا گہوارہ بنایا اور ایسے ایسے باکمال وہاں پیدا کئے۔ جن کی عظمت کا لوہا آج بھی دنیا مانتی ہے۔

۱۳- احمد رازی

بنی اُمیہ نے اُندلس میں جس قابل تعریف اور سود مند تمدّن کی تعمیر کی وہ اس حد تک بصیرت افروز اور علم افزاء تھا کہ خود عیسائی مؤلفین کو بھی اس کی یاد آج تک خون کے آنسو رلاتی ہے اور یہ حسرت آفریں شعر اس کی تاثیرات کا سچا گواہ ہے کہ ؎

وللحوادث سلوانٌ یسھّلھا
وما لما حلّ بالاسلام سلوان

یورپ کا مشہور عیسائی مؤرخ لی بان لکھتا ہے کہ

"چوتھی صدی ہجری اگر اس قدیم حکومت گاہ
(بغداد) میں بہت کچھ بارونق تھی۔ لیکن عربوں
کے تمدن کا اصلی مسکن اس وقت اندلس تھا"

ایک قیروانی ادیب نے ایک مقفیٰ خط میں اُندلس کی علمی ترقی کو تسلیم کرتے ہوئے یہ اعتراض کیا تھا کہ "اندلس والوں کو تاریخ پر توجہ کرنے کی فرصت نہ مل سکی جس کی وجہ سے ان کے کارنامے زندہ نہیں رہتے"

اس کے جواب میں امام ابن حزم المتوفی ۴۵۶ھ نے طرح جیسا کہ ان سے اُمید کی جا سکتی ہے نہایت پرجوش اور محققانہ طرز سے اندلس کی علمی ترقی اور تاریخی ذوق کو ثابت کیا ہے (نفح الطیب علامہ مقری جلد ثانی ص۱۱ طبع یورپ)

اسی خط اور نفح الطیب کے اس پر تکملہ سے جو گویا اندلس کے علمی کارناموں کی موجز فہرست ہے۔ چند مؤرخین کا تذکرہ معلوم ہوتا ہے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے اور اس فہرست سے صاف نظر آسکتا ہے کہ اہل اندلس نے اپنے استاد بغداد ہی کے نمونہ پر اپنی ترقی کی بناء قائم کی اور بالکل اسی کی تقلید کی۔

اندلس کے مؤرخین میں قدیم اور مشہور مؤرخ احمد بن محمد بن موسیٰ رازی ہے۔ جس کا خاندان اندلس میں بس گیا تھا۔ اس

نئے اندلس کی بڑی مبسوط و جامع "تاریخ" قلمبند کی ہے اور اس کے علاوہ اور بھی مختلف "تاریخی تصانیف" ہیں جن میں سے ایک کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہے اور جس کو آج کل کی اصطلاح کے مطابق ڈائرکٹری کہنا بالکل صحیح ہے۔ یہ کتاب اسی نمونہ پر لکھی گئی ہے جس طرح ابن ابی طاہر نے بغداد کے متعلق لکھی ہے اور اس کے مضامین یہ تھے:۔

۱۔ قرطبہ کی صفت۔
۲۔ قرطبہ کے مختلف رستے۔
۳۔ قرطبہ کے محلے۔
۴۔ عمائدین قرطبہ کی منزلیں وغیرہ۔

دوسرا مؤرخ ابن حیان ہے جس کی ضخیم تاریخ سات جلدوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اندلس کا وہ قابل فخر و فاضل مؤرخ گزرا ہے۔ جس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں "تاریخ" کے اکثر و بیشتر گوشوں کو واضح کیا ہے اور اس کتاب کا ہر باب اپنی جگہ پر ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ منظفری شاہ بطلیموس کی تاریخ بھی ابن حیان کی کتاب کے برابر ضخامت رکھتی ہے۔

اسی طرح محدثین کے زمرہ میں بھی بہت سے نامور مؤرخ اندلس کے اندر گزرے ہیں۔ حافظ ابن عبد البر المتوفی ۴۶۳ھ

کی مشہور کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب - ہندوستان کے دائرۃ المعارف میں چھاپی گئی تھی - ان کے علاوہ اور بھی کئی تاریخی تصانیف ہیں - (نفح الطیب و تذکرۃ الحفاظ للذہبی جلد سوم ص۳۲۴)

محدث ابن الفرضی المتوفی ۴۰۳ھ نے بھی تاریخ الاندلس اور ایک کتاب شعرائے اندلس کے بیان میں لکھی ہے -
(تذکرۃ الحفاظ جلد سوم ص۲۷۷)

ابن الحارث الخشنی نے طبقات القضاۃ اور طبقات الفقہاء، زبیدی نے اخبار النحویین و اللغویین، ابن عاصم نے طبقات الکتاب و البلغاء، ابن جلجل نے طبقات الاطباء، ابو القاسم صاعد طلیطلی نے اخبار علماء الامم من العرب و العجم لکھی ہے -

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی تاریخیں ہیں جن کی کثرت تعداد سے طبیعت میں ولولہ اور پھر ان کی تاراجی اور مفقود جانے کی وجہ سے دل میں حسرت پیدا ہوتی ہے - جس قدر بچا کھچا مواد موجود ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان مؤرخین نے کیسے کیسے اہم موضوعات اور نادر ابواب پر خامہ فرسائی کی تھی مثلاً حجاری نے مسہب فی فضائل المغرب لکھی جس میں ملک کی حالت اور خاصیتیں بیان کی ہیں اور مؤرخ ابن سعید کے قول کے مطابق جغرافیہ کو تاریخ سے ملا دیا ہے -

ابن سعید نے جو زمانہ مابعد کا مشہور و معروف مورخ ہے اس کی عمدگی کا اعتراف کیا ہے اور اسی بناء پر اس کا ذیل (تکملا) لکھا ہے۔ اس کے بچے کھچے آثار میں اب بھی فنون اور صنائع کی ترقی وغیرہ ابواب کے متعلق کافی مواد ملتا ہے۔

(نفح الطیب جلد ثانی صفحہ ۱۲۴)

ابن غالب نے بھی اپنی معروف کتاب فرحتہ الانفس میں اہل اندلس کی خوبیاں، تمدنی برکتیں اور رفاہ عامہ کے کام وغیرہ بتائے ہیں۔

(نفح الطیب جلد ثانی صفحہ ۱۴۰)

اس فہرست کے مطالعہ کے بعد یہ فیصلہ کرنے میں کسی بات کا بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ اندلس اپنے زمانے کے بغداد سے فائق تھا۔ اندلس والوں میں ایک نفاست حسن و ذوق اور زور طبع کا پتہ ملتا ہے۔ فلسفہ پسندی کے اثر سے تاریخ میں بھی عقلی انداز پیدا ہو گیا تھا۔ جیسا کہ مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ:-

"اندلس کو یہ فخر نصیب ہوا کہ حدیث اور کلام نے ایک بزم میں جگہ پائی۔"

(علم الکلام حصہ اول صفحہ ۵۶)

امام ابن حزم

اُندلس میں حدیث اور کلام کی جس بزم کا قیام عمل میں آیا۔ وہ امام ظاہریہ ابن حزم کی تھی۔ جن کا اس سے پہلے مختلف مقامات پہ ذکر آچکا ہے۔ ابن حزم یوں تو ایرانی الاصل تھا۔ مگر ان کا خاندان اندلس میں بس گیا تھا۔ ابو محمد علی بن احمد ابن سعید ابن حزم خاندان بنوامیہ کا ایک رکن تھا۔ جو سنہ ۳۸۴ ہجری (مطابق سنہ ۹۹۴ء) میں قرطبہ کے نواح میں پیدا ہوا اور سنہ ۴۵۶ھ (مطابق سنہ ۱۰۶۴ء) میں وفات پائی۔ دینی علوم اور فلسفہ ومنطق میں اپنے زمانے کا ماہر کامل تھا۔ عقائد کے اعتبار سے

وہ پہلے شافعی تھا مگر بعد میں ظاہری ہو گیا تھا۔ اسے علوم اسلامیہ میں جو دستگاہ حاصل تھی وہ اندلس میں اور کسی کو نہ تھی۔ حمیدی کا بیان ہے کہ ہم نے ابن حزم کا نظیر نہیں دیکھا۔ اس میں اجتہاد کی تمام شرطیں موجود تھیں۔ اس کی کتاب الملل و النحل بہت مشہور و معروف کتاب ہے جس میں فلاسفہ، ملاحدہ مادئیین، یہود اور نصاریٰ کے عقائد پہلے بیان کئے ہیں اور پھر ان کی تردید ملبند کی ہے۔ اس نے سحر اور جادو کی حقیقت پر بہت بحث کی ہے۔ اس کے خیالات و عقائد معتزلہ اور اشاعرہ کے بالکل خلاف تھے۔

ابن حزم ابتداء میں وزیر تھا اور اس زمانہ میں اس نے فلسفہ سیکھا۔ اس کے بعد اس نے علوم دین کی طرف توجہ کی جس کی وجہ سے ان علوم میں ایک عقلی انداز پیدا ہو گیا۔ تاریخ بھی اس اثر سے نئے قالب میں آ گئی جس کا موجودہ زمانے میں عروج ہے۔ اس لئے اس وجہ سے اندلس میں فلسفۂ تاریخ کا اصل بانی ابن حزم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ابن سعید جو اس دور کا مشہور مؤرخ تھا لکھتا ہے۔

"له کتب جمة فی التاریخ مثل نقط العروس
فی تواریخ الخلفاء"

یعنی تاریخ میں ابن حزم کی بہت سی کتابیں ہیں مثلاً نقط العروس

جو خلفاء کی تواریخ پر مشتمل ہے۔
یہ کتاب اگرچہ ہمارے پاس مفقود ہے لیکن دنیا سے معدوم نہیں ہوئی۔

ابن عذاری مراکشی نے اپنی تاریخ البیان المغرب کی جلد اول کے صفحہ ۵۲ طبع یورپ میں ابن حزم کی ایک تاریخی تحریر نقل کی ہے جس کا ترجمہ بجنسہٖ درج ذیل کیا جاتا ہے :۔

"اب بنو امیہ کی دولت ختم ہوگئی۔ باوجود اپنی خرابیوں کے وہ ایک عربی دولت تھی۔ بنی امیہ نے کوئی دارالحکومت یا محل سرائے نہیں بنائی۔ ان میں ہر امیر کی سکونت اسی مکان اور اسی احاطہ میں ہوتی تھی جو قبل خلافت اس کا ہوا کرتا تھا۔ نہ انہوں نے مسلمانوں کو اس امر پر مجبور کیا کہ ان سے عبودیت اور شاہانہ طریقہ کے ساتھ خطاب کریں۔ یا زمین یا پاؤں کو بوسہ دیں۔ ان کا اُصول نہایت دور دراز علاقوں میں اپنا حکم چلانا تھا۔ جیسے اندلس، چین، سندھ، خراسان آرمینیاں، یمن شام، عراق، مصر، مغرب وغیرہ اسلامی دنیا"

ایک اور مقام پہ ابن حزم کی تحریر کا نمونہ اس طرح نقل کیا گیا ہے :۔

"بنی عباس کی سلطنت گویا ایک عجمی (ایرانی) سلطنت تھی۔ جس میں عربی حکمرانی معدوم ہو گئی اور خراسان کے عجمی برسرکار ہو گئے۔ سلطنت ایک کسروی انداز میں آگئی ہاں مگر یہ بات ضرور تھی کہ کسی صحابی کو علانیہ برُا بھلا نہیں کہا جاتا تھا۔ بنی عباس کے زمانے میں مسلمانوں کا اتحاد جاتا رہا اور اسلامی ممالک پر مختلف پارٹیوں کا غلبہ ہو گیا۔ ان خانہ جنگیوں میں کافروں نے اندلس اور سندھ کے اکثر شہروں پر قبضہ کر لیا۔"

ابن حزم نے اپنے زمانے تک اسلام کی ملکی تاریخ کا جو موجز لکھا ہے انیسویں صدی عیسوی کا نامور مؤرخ شبلی بان بھی اس پر گویا اور کوئی اضافہ نہ کر سکا۔ یہ تحریر اور وہ خط جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اور جو اندلس کی علمی ترقی پر مکمل مضمون ہے۔ اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ ابن حزم نے تاریخ لکھنے میں عقلی انداز کہاں تک پیدا کر دیا۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنی مشہور تصنیف "مقالات" میں ابن حزم کے متعلق "الملل والنحل اور ابن حزم ظاہری" کے

زیرِ عنوان جو مقالہ تحریر کیا ہے اس میں ابن حزم اور ان کی تصنیف پر بڑی تفصیل سے اظہارِ خیالات کیا گیا ہے۔ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں :-

"اسلام میں ایک مدت تک معقول و منقول الگ الگ رہے۔ امام غزالیؒ نے دونوں کا تعارف کرایا اور رفتہ رفتہ اتحاد اس قدر بڑھا کہ آج دونوں کو الگ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ محدثین کا گروہ اخیر تک اپنے انداز پر قائم رہا چنانچہ اس مقدس فرقہ میں کوئی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا جو فلسفی یا معقولی کے لقب سے ممتاز ہوتا۔ لیکن دو شخص اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ ابن تیمیہ اور ابن حزم۔ ان دونوں بزرگوں کے معتقدات اور خیالات اس امر کا اندازہ کرنے کے لئے نہایت نتیجہ خیز ہیں کہ حدیث کو فلسفہ سے کس حد تک ربط ہو سکتا ہے؟ یہ دونوں بزرگ بہت بڑے محدث اور سخت مذہبی آدمی تھے۔ انہوں نے گو فلسفہ میں کمال پیدا کیا تھا۔ لیکن فلسفہ کو بالکل حقیر سمجھتے تھے اور اس لئے فلسفہ کا ان پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ چنانچہ

امام ابن تیمیہ نے فلسفہ کے رد میں ایک ضخیم کتاب چار جلدوں میں لکھی - امام ابن حزم نے بھی متعدد کتابوں میں فلسفہ کے مسائل کے رد بڑے مضبوط دلائل سے کئے۔

اہل سنت والجماعت میں عقائد کے اعتبار سے تین شاخیں ہیں۔ اشاعرہ - ماتریدیہ، محدثین لیکن ایک مدت سے تمام اسلامی دنیا میں صرف اشاعرہ کی کتابیں متداول اور زیر درس ہیں۔ ماتریدیہ کے اقوال کہیں کہیں ان ہی کتابوں میں آ جاتے ہیں لیکن محدثین کی تصانیف سرے سے ناپید ہیں۔ اور ان کے اقوال بھی (بجز صفات باری کے) کسی مسئلہ کے متعلق نہیں پائے جاتے - حالانکہ اصول و عقائد کے متعلق سب سے زیادہ انہی کی رائیں معتبر ہو سکتی ہیں - اب خوش قسمتی سے اس مقدس گروہ کی تصنیفات کی طرف توجہ مبذول ہوئی ہے - چنانچہ امام ابن تیمیہ کی کتاب "العقل والنقل" اور "منہاج السنت" اور امام ابن حزم کی کتاب "الملل والنحل" حال ہی میں چھپ کر شائع ہوئی ہے - ہم اس وقت اسی کتاب

"الملل والنحل" پر تقریظ لکھنی چاہتے ہیں لیکن اصل
بحث سے پہلے ہم نہایت اختصار کے ساتھ
ابن حزم کے حالات قلمبند کرتے ہیں"

ابن حزم نے ۴۰۰ھ میں حدیث کی تحصیل شروع کی اور جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے پہلے شافعی تھے پھر ظاہری ہو گئے یعنی ظواہر قرآن و حدیث کے سوا قیاس کو نہیں مانتے تھے۔

ابن حزم نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے "محلی" بڑے پایہ کی کتاب ہے۔ اس کی تصنیفات اسی ہزار اوراق پر مشتمل ہیں۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ میں نے ان کی ایک تصنیف دیکھی ہے جس سے ان کا کمال حفظ و ذہانت ثابت ہوتا ہے۔

ابن صاعد اندلسی لکھتے ہیں کہ ابن حزم کو علوم اسلامیہ میں جو کمال حاصل تھا وہ اندلس میں اور کسی کو نہ تھا۔ اسی طرح حمیدی کا بیان جو پہلے لکھا جا چکا ہے یہ ہے کہ ہم نے ان کا نظیر نہیں دیکھا۔ یہ تمام واقعات علامہ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں لکھے ہیں اور آخر میں لکھا کہ ابن حزم علمائے کبار میں ہیں اور اجتہاد کے تمام شرائط ان میں پائے جاتے ہیں۔

الملل والنحل

اس کتاب میں مصنف نے فلاسفروں ملحدوں، مادہ پرستوں، یہود و نصاریٰ غرضیکہ اکثر اہل مذاہب کے عقائد و خیالات نقل کیئے ہیں۔ اور ان کا رد لکھا ہے۔ غیر مذاہب رد میں علمائے اسلام کی بہت سی تصنیفات ہیں لیکن اس کتاب میں یہ خصوصیت ہے کہ دوسروں کے عقائد و خیالات کو نہایت تحقیق سے لکھا ہے۔ توراۃ اور انجیل کے محرف ہونے پر جو بحث کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف کو یہود و نصاریٰ کی کتابوں پر اسے مجتہدانہ عبور حاصل تھا۔ غیر مذاہب کے ابطال کے بعد مصنف نے خود اسلامی عقائد سے بحث کی ہے اور ہر فرقہ کے ان مسائل کا رد کیا ہے جو اس کے نزدیک غلط اور باطل ہیں۔ ہم کو صرف اسی حصہ سے بحث ہے۔ سب سے پہلے انبیاء کے مسئلہ کو لکھا ہے اور نہایت تفصیل سے لکھا ہے عقائد کی موجودہ کتابوں میں اگرچہ عموماً یہ مسئلہ مسلم قرار پایا گیا ہے کہ انبیاء معصوم ہیں لیکن اکثر تفسیر کی کتابوں میں جو روایات مذکور ہیں اور وہی تمام مسلمانوں میں پھیل گئی ہیں وہ بالکل اس کے برخلاف ہیں۔ ابن حزم نے نہایت آزادی اور دلیری سے ان تمام رواںتوں کی لغویت ثابت کی ہے۔

حضرت داؤدؑ کی نسبت مشہور ہے کہ انہوں نے ایک

دن اتفاق سے اوریا کی بیوی کو نہاتے دیکھ لیا۔ چونکہ وہ نہایت حسین تھی اس لیے اس کے ساتھ شادی کا ارادہ کیا اور اسی غرض سے اس کے شوہر کو لڑائی پر بھیج دیا۔ جب وہ لڑائی میں مارا گیا تو اس کی بیوی سے شادی کر لی۔ قرآن مجید میں ایک موقعہ پر یہ واقعہ مذکور ہے کہ دو بھائی حضرت داوُدؑ کے پاس لڑتے ہوئے آئے کہ ہمارا مقدمہ فیصل کر دیجیے۔ جھگڑا یہ تھا کہ ایک بھائی کے پاس ۹۹ دنبے تھے۔ اور دوسرے پاس صرف ایک۔ وہ کہتا تھا کہ اپنا دنبہ بھی مجھ کو دے ڈالو۔ حضرت داوُد نے یہ سن کر کہا کہ یہ ظلم ہے۔ پھر ان کو خیال پیدا ہوا کہ خدا نے یہ میرا امتحان لیا ہے اکثر مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ وہی حضرت داوُدؑ کا قصہ ہے وہ دونوں آدمی نہ تھے بلکہ فرشتے تھے اور انہوں نے اس پیرایہ میں حضرت داوُدؑ کو متنبہ کیا کہ تمہارے ۹۹ بیبیاں ہیں اور اوریا پاس صرف ایک ہے وہ بھی تم نے چھین لی۔ ابن حزم لکھتے ہیں کہ وہ فرشتے نہ تھے بلکہ واقعی آدمی تھے اور وہ درحقیقت انفصال مقدمہ کے لیے آئے تھے۔ ابن حزم کے الفاظ یہ ہیں۔

وهذا قول صادق صحيح لا يدل على شيء مما قاله المستهزئون الكاذبون

المتعلقون بخرافات ولدها اليهود وانما كان ذالك الخصم قوما من بنی آدم بلا شک مختصمین فی نعاج من الغنم علی الحقیقة ومن قال انہم کانوا ملائکہ معرضین بامر النساء فقد کذب علی اللہ عزوجل وقال مالم یقل وزاد فی القرآن مالیس فیہ وکذب اللہ عزوجل"۔

ترجمہ:"قرآن مجید کا بیان بالکل صحیح اور سچ ہے دروغگو مسخرے جو یہودیوں کے خرافات کی سند پکڑتے ہیں۔ ان کے اقوال کی طرف اس آیت میں کچھ بھی اشارہ نہیں پایا جاتا۔ وہ دونوں شخص واقعی آدمی تھے اور ان میں درحقیقت دنبوں میں جھگڑا تھا جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ فرشتے تھے اور انہوں نے عورتوں کے قصہ کی طرف اشارہ کیا تھا تو وہ خدا کو جھوٹ لگاتا ہے اور وہ بات کہتا ہے جو خدا نے نہیں کی اور قرآن پر حاشیہ چڑھاتا ہے اور خدا کو جھوٹا بناتا ہے"۔

اس کے بعد ابن حزم لکھتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں بدمعاش

اور پاجیوں کی طرف منسوب کی جا سکتی ہیں نہ کہ (نعوذ باللہ) انبیائے کرام کی طرف۔

اسی طرح یہ واقعہ عام طور پر مشہور اور کتب تفسیر میں منقول ہے کہ حضرت سلیمانؑ گھوڑوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس میں اس قدر مشغول ہوئے کہ عصر کی نماز جاتی رہی۔ جب ان کو خیال آیا تو گھوڑوں کی پنڈلیاں کٹوا ڈالیں اور جب ان کی دعا سے آفتاب دوبارہ طلوع ہوا تو نماز عصر ادا کی۔ ابن حزم لکھتے ہیں :-

"وھذا خرافة موضوعة مكذوبة سخيفة باردة والظاهر انها من اختراع زنديق بلا شك"

ترجمہ :- "یہ خرافات، جھوٹ، بیہودہ اور لغو روائت ہے۔ بظاہر یہ روایت کسی زندیق نے ایجاد کی ہے"

ایک بڑا اہم بالشان مسئلہ جس پر ابن حزم نے نہایت تفصیل سے بحث کی ہے۔ سحر اور جادو کی حقیقت ہے۔ یہ بحث اگرچہ درحقیقت سائنس سے تعلق رکھتی ہے لیکن سحر کا لفظ چونکہ مذہبی کتابوں میں آگیا ہے۔ اس لئے یہ ایک مذہبی مسئلہ بن گیا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ سحر اور جادو

کوئی چیز ہے لیکن بحث یہ ہے کہ سحر میں درحقیقت انقلاب ماہیت ہوتا ہے یا صرف شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی کا نام سحر ہے۔ اکثر اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ سحر کے ذریعہ سے تمام خرق عادات وجود میں آسکتے ہیں اور عام طور پر یہی عقیدہ مسلمانوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ابن حزم نے نہایت زور شور سے اس کا انکار کیا ہے اور حسب ذیل دلائل پیش کئے ہیں:۔

۱۔ خدا نے کائنات کی جو ترتیب قرار دی ہے وہ بدل نہیں سکتی جیسا کہ خود قرآن مجید میں ہے لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ علامہ موصوف نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے استدلال کر کے لکھا ہے:۔

"فصح ان کل ما فی العالم وما قد رتبه الله عز وجل الترتیب الذی لا یتبدل"

ترجمہ:۔ تو ثابت ہوا کہ جو کچھ عالم میں خدا نے ترتیب دیا ہے وہ بدل نہیں سکتا۔

۲۔ اگر سحر صحیح ہو تو معجزہ اور سحر میں کیا فرق ہوگا

ویقال لمن قال ان السحر یحیل الاعیان و یقلب الطبائع اخبرونا اذا جاز هذا فای فرق بین النبی والساحر ولعل جمیع الانبیاء

كانوا سحرة كما قال فرعون عن موسى عليه السلام إنه لكبيركم الذي علمكم السحر.

ترجمہ: "جو شخص یہ کہتا ہے کہ جادو قلب ماہیت کر دیتا ہے تو اس سے کہنا چاہئے کہ پیغمبر اور جادوگر میں کیا فرق باقی رہے گا۔ اس صورت میں یہ احتمال پیدا ہوگا کہ تمام انبیاء جادوگر تھے جیسا کہ فرعون نے حضرت موسٰی کی نسبت کہا تھا کہ یہ بڑا جادوگر ہے اور اسی نے تم کو جادو سکھایا ہے۔"

سحر کے ثبوت میں اکثر لوگ فرعون کے جادوگروں کا واقعہ پیش کرتے ہیں جو قرآن مجید میں مذکور ہے۔ علامہ موصوف نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے ثابت کیا ہے کہ وہ صرف شعبدہ بازی تھی۔ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں:۔

"يخيل اليه من سحرهم انها تسعى انما صنعوا كيد ساحر"

ترجمہ: حضرت موسٰیؑ کو ان کے جادو کی وجہ سے خیال ہوتا تھا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں۔ ان لوگوں نے جادو کا کرتب کیا ہے۔"

پہلی آیت سے ثابت ہوا کہ وہ صرف تخیل تھا اور کوئی واقعی چیز نہ تھی۔ دوسری آیت میں کید کا لفظ ہے جس کے معنی

قریب کے ہیں۔

قرآن مجید میں ہاروت و ماروت کے متعلق مذکور ہے کہ لوگ ان سے جادو سیکھتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے میاں اور بیوی میں جدائی کرا دیتے ہیں۔ اس آیت سے بھی سحر کی واقعیت پر استدلال کیا جاتا ہے۔ علامہ ابن حزم اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"فلیس فی ھذا ایضاً احالۃ الطبیعۃ ولا قلب عین، وانما ھو تاثیر بقوۃ تلک الصناعۃ ونحن نجد الانسان یسب او یقابل بحرکۃ یغضب منھا فیستحیل من الحلم الی الطیش وعن السکون الی الحرکۃ"

ترجمہ: "اس میں بھی طبیعت کا بدلنا یا قلب ماہیت نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب آدمی کو کوئی شخص گالی دیتا ہے یا کوئی ایسی بات کرتا ہے جس سے اس کو غصہ آ جاتا ہے تو اس کا حلم غصہ سے اور سکون حرکت سے بدل جاتا ہے۔

فلسفۂ حال کے مسائل میں سب سے زیادہ جو مسئلہ مسلم الثبوت مانا جاتا ہے۔ وہ قانون قدرت کا مسئلہ ہے اور کچھ شک نہیں کہ اس سے زیادہ کوئی چیز قطعی اور

یقینی نہیں لیکن عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ یہ
مسئلہ زمانۂ حال کی تحقیقات میں سے ہے یا کم از کم یہ کہ
اس مسئلہ کی طرف خیال رجوع نہیں ہوا تھا اور اسی لئے قدیم
لٹریچر میں یہ اصطلاح موجود نہیں۔ لیکن یہ خیال تمام تر غلط
ہے۔ فلاسفۂ اسلام تو عموماً اس کے قائل تھے۔ فقہا اور
محدثین میں بھی اشاعرہ کے سوا اس کا کوئی منکر نہیں۔ چنانچہ
امام ابن تیمیہ نے اپنی تصنیفات میں نہایت تصریح سے
اس کو لکھا ہے۔

علامہ ابن حزم نے اس بحث پر ایک مستقل عنوان
قائم کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "الکلام فی الطبائع"
(ملل ونحل جزو خامس ص۱۵ مطبوعہ مصر)

اس بحث میں پہلے اشاعرہ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ
طبائع کے قائل نہیں۔ پھر نہایت تفصیل سے اس کا رد
لکھا ہے۔ ان کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ عرب میں متعدد
الفاظ تھے جو اس معنی میں استعمال کئے جاتے تھے مثلاً
طبیعۃ، خلیقۃ، غریزۃ، سجیۃ، جبلۃ۔ چنانچہ حمید بن ثور
کہتا ہے۔

یشکل اخریا ام عمرو طبیعتہا
وتفریق ما بین الرجال الطبائع

ترجمہ: "اے ام عمر! ہر شخص کی ایک فطرت ہوتی ہے اور آدمیوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ فطرتوں کا بھی ہے۔"

یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے استعمال کئے گئے اور کسی نے ان سے انکار نہیں کیا بلکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمائے۔ صحابہؓ میں سے ایک بزرگ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مجھ میں علم اور بردباری جو پائی جاتی ہے وہ میری جبلت ہے یا تربیت اور کسب سے حاصل ہوئی ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں بلکہ خدا نے تم کو اس پر مجبول کیا ہے۔"

اس استدلال کے بعد علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:

"وكل هذه الطبائع والعادات مخلوقات خلقها الله عز وجل فرتب الطبيعة على انها لا تستحيل ابداً ولا يمكن تبدلها عند كل ذي عقل كطبيعة الانسان بان يمكن ولكنا له التصرف في العلوم والصناعات ان لم يعترضه آفة والطبيعة الحمير والبغال فانه غير ممكن منها ذلك وكطبيعة البلدان لا ينبت شعيراً ولا حيراً وهكذا كل ما في العالم

ثابت ہوتی ہے۔ ان کا جواب دیا ہے۔

(الملل والنحل حصہ چہارم صفحہ ۱۳۱)

علامہ ابن حزم کا یہ خیال صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے تعلیم یافتہ حضرات کے ہم خیال پہلے بھی موجود تھے۔

علامہ ابن خلدون

جس زمانے میں اسلامی تہذیب و تمدن کی شمع تاباں اندلس میں گل ہونے کے قریب تھی اس آخری وقت کی روشنی میں علامہ ابن خلدون کی شہرۂ آفاق شخصیت سامنے آتی ہے جس کا نام آج کل ہر تاریخی مذاق والے آدمی کے پاس فلسفۂ تاریخ کے بانی کے طور پر لیا جاتا ہے۔

ابن خلدون کا عربی النسل خاندان اشبیلیہ واقع اندلس کا رہنے والا تھا جس نے نصرانیوں کے تسلط کی وجہ سے ساتویں صدی کی ابتدا میں وطن چھوڑ کر تونس واقع افریقہ کی اقامت اختیار کی اور یہیں سنہ ۷۳۲ھ میں ابن خلدون پیدا

ہوا اور اسی جگہ اس نے اس زمانے کے لحاظ سے نحو، عربیت اور شاعری سیکھی۔ بچپن ہی سے اس کو علمی مذاق حاصل تھا۔ ابھی اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا کہ اس شہر میں طاعون کی وبا پھیل گئی جس میں اس کے والد اور اس کے اکثر اساتذہ کا انتقال ہو گیا مگر اس کے باوجود اس نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ کچھ مدت کے بعد اس کی لیاقت کا شہرہ اس قدر ہو گیا کہ حکام وقت نے اسے سرکاری خدمات کے لئے طلب کر لیا اور بیس سال کی عمر میں اس کو کاتب کا عہدہ ملا چنانچہ اس نے متعدد ملوک طوائف کے درباروں میں کاتب السر (پرائیویٹ سیکرٹری) کی خدمات انجام دیں۔

ان ایام میں مختلف سازشی پارٹیاں جن کی وجہ سے افریقہ تباہی کے حالات میں گرفتار تھا کسی کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھیں اور طرح طرح کے فتنے برپا کئے جاتے تھیں اس متذبذب ماحول میں ابن خلدون کی حالت بھی قسم قسم کے تغیر و تبدل کا نشانہ بنی رہی۔ کبھی اعلیٰ درجے کا اعزاز اور کبھی مجلس اس کو نصیب ہوتا۔ ایک دفعہ ایوان مظالم (مستمد عدالت) کے منصب پر بھی مامور رہا۔ آخر اس نے تونس کو چھوڑ کر اندلس چلے جانے کا ارادہ کر لیا جس کے

سے اس کو بڑی مشکلوں سے اجازت ملی۔
اندلس پہنچنے پر غرناطہ میں سلطان ابن الاحمر اور اس کے مشہور وزیر ابن الخطیب نے خیر مقدم کی خوب آؤ بھگت کی۔ خود وزیر نے اس کی "خوش آمدید" میں پُر شاندار قصیدہ لکھا لیکن چند ہی روز کے بعد معلوم ہو گیا کہ افریقہ کی ریشہ دوانیاں غرناطہ میں بھی موجود ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ در اندازوں کی بدولت ابن الخطیب اور علامہ ابن خلدون کے درمیان ہم صفائی نہ رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابن خلدون یہاں سے بجایہ کے سلطان کے پاس چلا گیا اور وہاں بھی نہایت دھوم دھام سے اس کی خاطر مدارات کی گئی اور اسے مدار المہامی کا منصب حاصل ہو گیا۔
بجایہ کا سلطان ابن تلمسان کے ایک دشمن کے ہاتھوں سے مارا گیا اور اس کی جگہ جو نیا حاکم مسند جہانبانی پر فائز ہوا اس سے بھی ابن خلدون کا وہ اعزاز بحال رکھا جو پہلے فرمانرواؤں سے اس کو حاصل ہوا تھا لیکن آخر کار نئے حکمران سے بھی ابن خلدون کی ناچاقی ہو گئی اور یہاں کا ماحول سازگار نہ رہا۔
دنیا کے نشیب و فراز کا پورا پورا مزہ چکھنے کے بعد ابن خلدون نے اب سیاسی زندگی کو خیرباد کہنا چاہا اور الکھتا ستان

کا حاکم اس سے اپنے پاس آنے کی استدعا کر رہا تھا لیکن اب اس نے اپنے علمی مطالعہ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اور حقیقت یہ تھی کہ ابن خلدون اگرچہ دنیا سے الگ تھلگ ہونے کی خواہش رکھتا تھا اور دنیا سے پورے طور پر بے تعلق رہنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ کسی بھی خاموشی سے بسر کر سکے۔ وہ جس جگہ بھی جاتا وہیں اس کی نسبت جاسوسی کا شبہ ہوتا اور وہ اپنی موافق اور مخالف دونوں قسم کی پارٹیاں موجود پاتا اور بڑی مشکلوں سے اس کو رہائی حاصل ہوئی۔ آخر وہ تلمسان واقع افریقہ میں پہنچ کر علمی زندگی میں مصروف ہو گیا لیکن یہاں سے بھی آخر کار اس کو مجبوراً قلعہ بنی سلامہ میں گویا روپوش ہونا پڑا۔ یہی روپوشی اس کی زندگی کے سب سے بڑے اور سب سے اہم کام کو سرانجام تک پہنچانے کا باعث ہوئی۔ یعنی اپنی تاریخ کا مقدمہ اور افریقی اقوام کے حالات اس نے اسی جگہ مرتب کیے۔

ابن خلدون چار سال تک تلمسان میں قیام پذیر رہا۔ اب اس کی عمر پچاس برس کی تھی۔ تاریخ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کتابیں جمع کرنے کی اشد ضرورت تھی مگر اس عرصہ میں وہ ایسا سخت بیمار ہوا کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی۔ ایسی

حالت نے حب وطن کے خیال نے اس کو پھر تونس جانے کا خیال پیدا کر دیا جس کے لئے سلطان وقت سے اجازت بھی حاصل ہو گئی اور اس طرح پھر وہ اپنے وطن میں واپس آ گیا جہاں سلطان وقت ابو العباس نے اس کی نہایت تعظیم و توقیر کی اور اس طرح سے اس کی سیاسی زندگی بھی از سر نو تازہ ہو گئی۔

لیکن اسی کے ساتھ وہ لازمی مخالفت کی لہر بھی پھر تازہ ہو گئی جس سے فضا پہلے مکدر ہوئی تھی۔ بہر حال ابن خلدون نے حالات کی ناموافقت کے باوجود مقدمہ تاریخ اور تاریخ کا جس قدر حصہ تیار ہوا تھا سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ آخر مخالف پارٹی کی سازشوں سے تنگ آ کر چار سال کے بعد اس نے مصر کو ہجرت کی اور قاہرہ پہنچ کر اپنا تعلیمی مشغلہ جاری رکھا۔ جب ہر طرف سے طلبہ کا ہجوم ہونے لگا تو جامعہ ازہر میں اس کا حلقۂ درس قائم ہو گیا۔ مصر کے سلطان برقوق سے اس کی ملاقات ہوئی اور اس نے بھی ابن خلدون کے حال پر نہایت مہربانی کی اور وعدہ کیا کہ سلطان تونس کو لکھ کر اس کے اہل و عیال کو بھی یہاں طلب کرا لے گا جو اس کے ہمراہ آنے سے روک دیئے گئے تھے۔

برقوق سلطان مصر نے ابن خلدون کو مدرسۂ قمحیہ کی صدارت کا منصب عطا کیا جو اس وقت سابق صدر کے انتقال کر جانے کی وجہ سے خالی تھا۔ دو سال کے بعد اس کو قاضی مالکیہ کا عہدہ مرحمت ہوا چنانچہ علامہ ابن خلدون جو اب تک ایک ادیب، ایک مدبر، ایک سیاح اور ایک عالم تھا پھر قاضی بھی بن گیا۔ اس اہم عہدہ کو اس نے نہایت انصاف اور عدالت کے ساتھ انجام دیا۔ زبر دست اور زیر دست کا ذرہ برابر بھی لحاظ نہ کیا اور نہ کسی قسم کی سفارش و فرمائش کی پروا کی۔ عدالت کے سامنے سب کو یکساں قرار دیا۔ ناجائز وسائل اور بد نظمی وغیرہ کا پورا پورا انسداد کر دیا۔ مفتیوں کے لئے باقاعدہ حدود مقرر کر دیئے جن سے وہ تجاوز نہ کرنے پائیں۔ ملازمین اور عہدہ داروں کی لیاقت و قابلیت پر غور کیا اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ روا رکھا۔ جعل سازی اور فریب دہی اور دھوکا بازی کے لئے کوئی موقع اور گنجائش نہ باقی رہنے دی۔

جو لوگ اس سے پہلے فریب کاریوں اور بدعنوانیوں میں ملوث ہو گئے تھے ان کے لئے ابن خلدون کے یہ اقدامات یقیناً سخت اذیت ناک اور تکلیف دہ ہو سکتے تھے اور وہ کسی طرح بھی ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ

ان اقدامات سے ان کی حوالی کارندوں کی دروازہ قطعی طور پر بند کر دیا تھا اور ان کے ناجائز مفاد و اغراض خطرے میں پڑ گئے تھے اس لئے ابن خلدون کی اصلاحات کے باعث خود غرض اور مفاد پرست لوگوں کی طرف سے یہاں بھی اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ لیکن اس نے اپنے منصب کی ذمہ داریوں کے مقابلہ میں کسی بات کی بھی پروا نہ کی۔ اگرچہ بعض صاحب اقتدار اور اوپر تک رسائی رکھنے والے لوگوں کی وساطت سے اس بات کی زبردست کوشش کی جاتی رہی کہ ابن خلدون بھی بڑے لوگوں کی رعایت اور زمانہ سازی کا مشرب اختیار کر لے مگر یہ تمام کوششیں اس کی سچائی اور اس کے بے لاگ طریقہ پر ایک بال کے برابر بھی اثر نہ کر سکیں۔

ابن خلدون پر جو تہمتیں لگائی گئیں ان کی تحقیقات کے لئے سلطان وقت نے قضاۃ اور مفتیوں کی مجلس جمع کی جس سے ابن خلدون کی بے گناہی اور بے لوثی پورے طور پر ثابت ہو گئی۔ اب اس کے بعد اس پر ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ وہ یہ کہ جس جہاز میں اس کے اہل و عیال تونس سے آ رہے تھے وہ جہاز لنگر بان ہونے سے پہلے ہی ڈوب گیا اور سب کے ساتھ اس کے اہل و عیال بھی غرق ہو

گرے۔ ان سب مصیبتوں نے جو پے در پے ابن خلدون پر پڑیں اس کی کمر توڑ دی اور اگرچہ برقوق اس کے حال پر نہایت مہربان تھا لیکن اس نے سرکاری منصب سے استعفا دے دیا اور عالمانہ مشاغل میں زندگی بسر کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس عرصہ میں وہ حج بیت اللہ شریف سے بھی مشرف ہوا اور پھر قاہرہ میں واپس آگیا۔

اس خاموش زندگی میں اس کو صرف ایک ہی وقت (جو آخری وقت تھا) اپنی طرز زندگی کو بدلنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آٹھویں صدی اختتام پذیر ہو رہی تھی کہ دنیا کے بے مثال فاتح تیمور صاحبقران اعظم نے جس کی خونریزی کے مقابلہ میں اس کے بے شمار اوصاف بھی کچھ کم قابل لحاظ نہیں ہیں۔ برقوق کے انتقال کر جانے کے بعد میدان خالی پا کر مصر پر بھی حملہ کر دیا اور حسب معمول فتح و نصرت کا پرچم لہرایا۔ تیمور کی عادت تھی کہ ہر مفتوحہ شہر کے ہر قسم کے باکمال اور نامور صناع اور ارباب فن کو اپنے دارالسلطنت سمرقند روانہ کیا کرتا تھا جو اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ پر شوکت اور شاندار شہر تھا چنانچہ وہ مصر سے بھی بہت سے علماؤ فضلا وغیرہ کو اپنے ساتھ لیتا گیا اور انہی علماء میں ابن خلدون بھی شامل تھا تیموری فوجوں نے ابن خلدون کو پھر ایک دفعہ ایک ایسے

تیمور کے پاس نہ گیا تھا۔ ۸۰۸ھ ہجری میں ۷۶ سال کی عمر
پہنچ کر تیمور کے انتقال کے قریب اور اس سے تین سال
زیادہ عرصہ کے لئے اس دنیائے ناپائیدار سے رخصت ہو
گیا۔

ان مختصر واقعات کے مطالعہ سے پورے طور پر پیدا
کیا جا سکتا ہے کہ اس پر آشوب دنیا کے مختلف اطوار زندگی
اس نے جیسے جیسے رنگ بدلے ان سے ضرور علامہ
ابن خلدون کے خیالات پر زبردست اثر پڑا ہوگا اور اس کی
لئے اس کے طبعی ذوق علم، مطالعہ، عالم سیاحت، سیاسی
خدمات کے ساتھ مل کر اس دماغی ترقی کی بنا ڈالی جن کی
بدولت فلسفیانہ تاریخ کا ایک قابل تعریف نمونہ اس نے پیش
کر کے رفتار علم کو ترقی دی۔

علامہ ابن خلدون نے جو تاریخ لکھی اس کی ابتداء سیاسی
زندگی ترک کرنے کے بعد عالم تنہائی میں دنیا سے دل شکستگی
کے ساتھ عمل میں آئی تھی۔ اس وقت جو کچھ لکھا گیا وہ اس
دماغی قابلیت اور مستند تحقیقات کا عمدہ نمونہ ہے۔ چونکہ
کے بعد اس کو تنہائی اور فرصت پھر کبھی نصیب نہ ہوئی
لئے بعد ازاں اسے تاریخ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی
نہ ملی چنانچہ اس کا ثبوت اس امر سے مل سکتا ہے کہ اکثر

ـاب میں خالی چھوڑ دی گئی ہے ۔ سنوں وغیرہ کے بیان کرنے
ی غلطی ہوئی ہے ۔ عبارت میں بھی تعقید ہے اور اسی وجہ
سے اس کی بقیہ تاریخ میں کوئی خاص قابل ذکر بات نہیں پائی
اتی تاہم اس کی جدت کا یہ نمونہ نظر آتا ہے کہ اس نے تاریخ
مخلوط اور مشترکہ طور پر نہیں لکھا ہے جیسا کہ اس سے پہلے
کے مؤرخین کی عادت تھی بلکہ ہر خاندان کے لئے جدا باب
ئم کیا ہے ۔

چونکہ ابن خلدون کو قدماء کے بیش بہا مصنفات کے
طالعہ سے نظر وسیع کرنے کا موقعہ نہیں ملا اور علوم عقلیہ میں
س نے باقاعدہ مہارت حاصل نہیں کی تھی ۔ اس لئے اکثر
کہ رائے قائم کرنے میں اس سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں اور
س طرح بلحاظ اصل منشاء کے جو فلسفۂ تاریخ کے بارے
ں مسلمہ تصور کیا جاتا ہے ۔ ابو ریحان بیرونی کو اس پر
جیح حاصل ہے لیکن حقیقت میں ابن خلدون کو اس اولیت
فخر حاصل ہے کہ اس نے اپنی کتاب فن تاریخ میں ہی
امل رکھی اور فلسفۂ تاریخ کو ایک مستقل فن قرار دیا ۔

علامہ طبری اور علامہ ابو ریحان بیرونی نے تاریخی تحقیقات
لے جو اصول قائم کئے ان کے مقابلہ میں علامہ ابن خلدون
نے ایک عمارت تیار کر دی اور دیباچہ میں پوری وضاحت

کے ساتھ اصول تحقیقات درج کئے۔ اس طرح تاریخ کو ایک معقولی فن قرار دے کر اس نے جو خیالات اس کے بارے میں ظاہر کئے ان کا مختصر خاکہ یہ ہے:

"یہ علم بنفسہٖ ایک مستقل علم ہے۔ اس کا موضوع عمران بشری اور اجتماع انسانی ہے۔ اس غرض کے متعلق گفتگو بالکل نئی ایجاد اور نہایت مفید نتائج پیدا کرنے والی ہے جس تک بحث اور غائر نظری نے پہنچا دیا ہے۔ اس کو خطابت (علوم ادبیہ) میں جو منجملہ علوم منطقیہ ہے قرار نہیں دیا جا سکتا اس لئے کہ خطابت کا موضوع محض اقوال نافعہ ہیں جن سے کسی امر کی ترغیب دی جائے یا کسی برے کام سے روکا جائے اور نہ سیاست مدن میں شامل کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ اس میں تمدنی انتظام سے بحث ہوتی ہے تاکہ اس سے انسان ایک قاعدہ کے موافق زندگی بسر کرے۔ غرضیکہ اس فن کا موضوع ان دونوں علوم فلسفیہ سے جن سے وہ مشابہ کیا جا سکتا ہے۔ جداگانہ ہے گویا کہ یہ جدید استنباط کیا ہوا علم ہے میری عمر کی قسم! میں نے اس طرز کی کوئی کتاب کسی شخص کی لکھی ہوئی نہیں پائی۔ نہیں معلوم کہ اس کی کیا وجہ

ہوئی ؟ آیا غفلت ہوئی جس کا گمان نہیں کیا جا سکتا یا یہ کہ
لکھا گیا ہو لیکن ہم تک نہ پہنچا۔
جب کہ ہر حقیقت جو طبیعت کے متعلق ہے اس لائق
ہے کہ اس کے عوارض ذاتی سے بحث کی جائے تو ضرور
ہوا کہ اس کے لئے بھی ... لہٰذا اس کے مفہوم و حقیقت
کے کوئی نہ کوئی ... حالانکہ علماء نے بر وقت توجہ ہر
فن اس کے ثمرات کا لحاظ کیا اور یہ علم گو فی نفسہٖ اس
کے مسائل شریف ہیں۔ لیکن چونکہ اس کا ثمرہ محض خبروں
کی صحت میں تھا جو بہت ضعیف امر ہے لہٰذا اس کو
چھوڑ دیا۔ واللہ اعلم وما اوتیتم من العلم الا
قلیلا
(دیباچہ مقدمۂ ابن خلدون)

مندرجہ بالا تحریروں کے مطالعہ سے بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے کہ علامہ
...لدون نے بھی اگرچہ تاریخ کو فلسفہ میں شامل بھی کر دیا بایں ہمہ
...کے جو حدود ارسطو کے وقت سے چلے آتے تھے ان میں
...کی طاقت اس کو بھی کسی طرح نہ ہو سکی کیونکہ وہ حدود
...کے مسائل و مہمات کا جائزہ لینے اور تمام ضروری امور و مشکلات
...ر رکھنے کے بعد متعین کئے گئے تھے جن میں ایسی کوئی گنجائش باقی
...تھی کہ انہیں اصلاح و ترمیم کی کسوٹی پر رکھا جائے۔ یہ حدود
...ئے خود نہایت جامع، مکمل اور مبسوط تھے۔

بہرحال علامہ ابن خلدون سرزمین اندلس کی وہ آخری روشنی تھی جس کے بعد اس ملک پر ہمیشہ کے لئے تاریکی کا سایہ مسلّط ہوگیا جسے پھر اگرچہ کوئی روشنی بھی دُور نہ کر سکی اور یہ سایہ ایک مستقل پردہ ثابت ہوا لیکن دانشوران اندلس کا بیان اس وقت تک پایۂ اختتام کو نہیں پہنچ سکتا جب تک علامہ مقریزی کا نام نہ لیا جائے۔ جس کی مشہور تصنیف "نفح الطیب" اندلس کے تاراج شدہ چمن کی ایک یادگار کہنی چاہیئے۔

علامہ ابن خلدون کے فیض صحبت نے اقصائے عرب میں جو دانشور پیدا کئے۔ ان میں علامہ مقریزی کو خاص مقام حاصل ہے یہ بزرگ ابن خلدون کے فیوض و برکات سے مصر میں رونما ہوا جس نے عام روشنی سے بالاتر ہوتے ہوئے "الخطط لاثاث" جیسی کتاب لکھ کر عمدہ اور قیمتی معلومات کا ذخیرہ مہیا کر دیا۔ علامہ مقریزی کی یہ تصنیف ایک نہایت گرانقدر مجموعہ ہے ان تاریخی حقائق و معلومات کا جن میں متعدد ادوار کے تاریخی واقعات کی بہت بڑی تفصیل پیش کی گئی ہے اور مختلف ممالکِ عرب کے تاریخی نشیب و فراز اور ان انقلابات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ان ملکوں میں رونما ہوتے رہے لیکن بہت جلد مصر کی علمی تازگی کا وہ زمانہ بھی جاتا رہا جس میں ابن خلدون اپنے جلیل القدر مؤرخین کے علم و کمال کی شمع علامہ مقریزی کی سی علمی و تاریخی ہستیوں کو روشنی میں لانے کی باعث ہوئی اور اس کے بعد جہالت و تاریکی کے سائے چاروں طرف پھیل گئے۔

تمت بالخیر

31

از

عبداللہ الاثری

سابق مدیر اعلیٰ روزنامہ "زمیندار"

لاہور

تبہ دین و دنیا اندرون چوک اردو بازار لاہور